اُردو کا کلاسیکی ادب

کُلّیاتِ قلق

از

حکیم غلام مولیٰ قلق

مرتبہ

کلب علی خاں فائق

مجلس ترقیٔ ادب ○ لاہور

کلیات قلق

★

طبع اول : دسمبر ۱۹۶۶

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقیِ ادب لاہور
مطبع : شفیق پریس لاہور
مہتمم : ایس ۔ ایم ۔ شفیق
سرورق : مطبع عالیہ ۔ لاہور
قیمت : دس روپے

بعون صانع مکین و مکان بفضل خلاق زمین و زمان

اردو کا کلاسیکی ادب

کلیاتِ قلق

مرتبہ

کلب علی خاں فائق

ناشر

مجلس ترقی ادب ۲۔ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ

نمبر شمار	عنوان	صفحہ

صفحہ	عنوان	نمبر شمار

ر

ڑ

ز

س

ش

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۹۵-	ھو جدا اے چارہ گر ھے مجھ کو آزار فراق	۱۳۰
	ک	
۹۶-	نہ پہنچے ھاتھ جس کا ضعف سے تا زیست دامن تک	۱۳۱
۹۷-	ناصح کی بات بات میں ھے کیا بلا نمک ...	۱۳۲
۹۸-	جی سے ھی اپنے جاؤں آتا ھے کون یاں تک	۱۳۳
۹۹-	ھے اُس کی بزم میں رند خراب ایک پہ ایک	۱۳۴
۱۰۱-	نہ جائے گا سرو سودا مرا زنہار گردن تک ...	۱۳۵
۱۰۰-	اے ستم آزما جفا کب تک	۱۳۶
	گ	
۱۰۲-	اتنی بجھے کہ دی ھوس خشک و تر میں آگ	۱۳۷
	ل	
۱۰۳-	کس قدر دل ربا نما ھے دل	۱۳۸
۱۰۴-	جز موج پیچ و تاب نہیں ماجرائے دل	۱۴۰
۱۰۵-	کوئی بھی مرحلہ نہیں تسکیں فزائے دل ...	۱۴۱
۱۰۶-	بلبل نہ کس طرح ھو نثار ادائے گل	۱۴۲
	م	
۱۰۷-	زور آزمائی کرتے ھیں بے طاقتی سے ھم ...	۱۴۳
۱۰۸-	اے خار خار حسرت کیا کیا فگار ھیں ھم	۱۴۴
۱۰۹-	اس پر مٹے ھوئے ھیں تجھ پر نثار ھیں ھم ...	۱۴۵
۱۱۰-	کیا آ کے جہاں میں کر گئے ھم	۱۴۷
۱۱۱-	خدا سے ڈرتے تو خوف خدا نہ کرتے ھم ...	۱۴۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ

و

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۵۲-	کھلا ہے پھر کے در مے کدہ مبارک ہو ...	۲۰۶
۱۵۳-	تقدیر کا معاوضہ تدبیر سے نہ ہو ...	۲۰۷
۱۵۴-	پھرے ہے ساتھ میرے جور گردوں دادخواہی کو	۲۰۸
۱۵۵-	گر شرم چشم یار میں دامن کشاں نہ ہو ...	۲۰۹
	ہ	
۱۵۶-	طوفاں کشاں ہے گریہ دم آتشیں کے ساتھ ...	۲۱۰
۱۵۷-	قاتل نے میرے دل کو جو دیکھا لگا کے ہاتھ	۲۱۱
	ی ، ے	
۱۵۸-	نہ انتظار مسافت نہ فکر یار مجھے	۲۱۳
۱۵۹-	کیا سر کشی پسند ہمارا نیاز ہے	۲۱۵
۱۶۰-	پڑا ہے دیر و کعبہ میں یہ کیسا غل خدا جانے	۲۱۶
۱۶۱-	کوئی کیسا ہی ثابت ہو طبیعت آ ہی جاتی ہے	۲۱۷
۱۶۲-	دل کے ہر جزو میں جدائی ہے	۲۱۹
۱۶۳-	وہی وعدہ ہے وہی آرزو وہی اپنی عمر تمام ہے ...	۲۱۹
۱۶۴-	مجھ کو مارا ہے مروت نے وفا سے پہلے ...	۲۲۰
۱۶۵-	در سے ترے گزر کر ، گزرے ہم اپنی جاں سے	۲۲۲
۱۶۶-	جو دلبر کی محبت دل سے بدلے	۲۲۳
۱۶۷-	سامان عیش و ناز ہے آزار جاں مجھے	۲۲۵
۱۶۸-	کیوں سر بہ گریباں ستم آرا مرے آگے ...	۲۲۷
۱۶۹-	وہ بعد مرگ دے دشمن کو یہ توقیر مٹی کی	۲۲۸
۱۷۰-	بند نقاب اس کا ہر دم کھلا رہا ہے ...	۲۳۰

مثلث

رباعیات

★

صفحہ	عنوان	نمبر شمار

نمبر شمار	عنوان	صفحہ

★

نمبر شمار	عنوان	صفحہ

مخمسات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ

مسدسات

متفرقات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ

واسوخت

مرثیہ

قصائد

قطعات و مسدس مدحیه

مقدمه

از

کلب علی خان فائق

حیات قلق

حکیم غلام مولٰی عرف مولا بخش **قلق** اردو غزل گوئی کے آخری دور میں بہت بلند مقام رکھتے ھیں لیکن انقلابِ زمانہ دیکھیے کہ اب تک اُن کے حالات زندگی مخفی ھیں ۔ صرف 'کلیات قلق' میں جو تقریظات شامل ھیں اُن سے اجمالی سوانح مرتب ہوتے ھیں ۔ حسرت موھانی اور یحییٰ تنہا نے بھی اسی پر اکتفا کیا ھے ۔ میں نے بھی کلیات کا مطالعہ کرکے بعض نتائج نکالنے کی کوشش کی ھے ۔ معاصرین اُس کے حالات پر صحیح روشنی ڈال سکتے تھے لیکن افسوس یہ ھے کہ اُنھوں نے اجمال سے کام لیا ھے اور قلق کی زندگی کے بعض پہلو ابھی تک واضح نہیں ھو سکے ھیں ۔ ممکن ھے کہ آیندہ دستاویزی معلومات مہیا ھوں اور اُس کی زندگی کے تمام گوشے واضح ھو جائیں ۔

ولادت :

قلق میرٹھ میں ۱۲۴۸ھ (۳۳-۱۸۳۲ع) کے لگ بھگ پیدا ھوئے ۔ والدین نے غلام مولیٰ نام رکھا ۔ دوسرا نام مولا بخش تجویز ھؤا اور یہ زیادہ مشہور ھؤا ۔

ابتدائی تعلیم :

بسم اللہ کی تقریب کے بعد اُن کی تعلیم محلے کے مکتب میں ھوئی ۔ اُن کی ابتدائی تعلیم بارہ برس تک میرٹھ میں جاری

رھی ۔ ابتدائی درسی کتابیں وطن میں ختم کرلیں ۔ تعلیم کا شوق زیادہ تھا ۔ گھر والوں سے دھلی جانے کی اجازت چاھی ۔ اس وقت کے رواج کے مطابق تعلیم کے لیے اپنے بچوں کو گھر سے باھر جانے کی اجازت والدین بہ خوشی دے دیا کرتے تھے ۔ قلق کے والدین نے بھی دھلی جانے کی اجازت دے دی ۔ میرٹھ کا فاصلہ دھلی سے کچھ زیادہ بھی نہ تھا ۔ دھلی گئی گزری حالت میں بھی برصغیر پاک و ھند کا مرکز مانا جاتا تھا ۔ قلق ۴۴-۱۸۴۳ع کے متصل دھلی آئے۔ حالی کا بیان ھے :

"در دوازدہ سالگی ازاں جا بہ خیرالبلاد جھان آباد آمدہ بہ کسب کمال و تحصیل علم پرداختند ۔"
(کلیات قلق ، صفحہ ۳۵۵)

ابتدائی قیام کے متعلق حتمی فیصلہ مشکل ھے ۔ اس زمانے میں امرا کا دستور تھا کہ اپنے بچوں کو گھر پر تعلیم دلایا کرتے تھے ۔ مخیّر حضرات نے دینی مدارس، مقامی اور بیرونی طلبا کے لیے جاری کر رکھے تھے ۔ ان مدارس میں مفتی صدرالدین آزردہ کا مدرسۂ دارالبقا بھی تھا جھاں طلبا کو لباس اور طعام مفت ملتا تھا ۔ مؤلف تذکرۂ علماے ھند کا کہنا ھے :

"مفتی صدرالدین دھلوی ۔ اکثر طلبۂ مدرسۂ دارالبقا را کہ زیر مسجد جامع بود ، طعام و لباس می داد ۔"
(تذکرۂ علماے ھند ، صفحہ ۹۳ مطبع نول کشور ۱۸۹۴ع)

ہو سکتا ہے کہ قلق نے اسی مدرسے میں آ کر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ہو -

اُن کے اساتذہ میں ملا انتظام علی سہارنپوری کا بھی نام لیا جاتا ہے - ملا انتظام علی کس مدرسے میں مدرس عربی تھے ؟ اس کا پتا نہ چل سکا - البتہ اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ قلق نے عربی کی تحصیل ملا انتظام علی سے کی تھی -

دلی کالج[۱] :

مدرسۂ غازی الدین خاں ، مشرقی علوم کا قدیم مدرسہ تھا - اس کی بنیاد ۱۷۹۲ع میں پڑی تھی - ۱۸۲۵ع میں اسے دہلی کالج کا نام دیا گیا - اس کو ترقی دے کر اس کے دو شعبے قرار پائے - ایک شعبۂ علوم مشرقی ، دوسرا شعبۂ علوم مغربی - اس میں کمپنی کی جانب سے طلبا کو وظائف بھی دیے جانے لگے - ۱۸۴۶-۴۷ع میں دہلی سے باہر کے طلبا کو بھی دعوت مقابلہ دی گئی اور ۲۸ طلبا میں سے سات نے چار چار روپے ماہانہ کا وظیفہ حاصل کیا - قلق بھی دلی کالج میں داخل ہو گئے - ان کے شرکائے سبق میں مولوی عبدالکریم سوز تخلص (جو صہبائی کے

---

۱ - ''مرحوم دہلی کالج'' از ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، صفحات ۱۰ تا ۱۱۰ - اشاعت سوم ۱۹۶۲ع انجمن پریس کراچی - ایضاً مضمون از مقبول احمد صمدانی ، رسالہ ادبی دنیا ، ۱۹۳۲ع نوروز نمبر ، ایڈیٹر تاجور ، صفحات ۳۲ تا ۳۸ -

چھوٹے بیٹے تھے) کا نام لیا جاتا ہے ۔ مؤلف فرہنگ آصفیہ کا بیان ہے :

"درسی کتابیں آپ نے فاضل اجل مولانا امام بخش صاحب "صہبائی" سے اُن کے فرزند رشید مولوی عبدالکریم سوز کے ساتھ ہم سبق ہو کر دیکھیں ۔"
(تقریظ از مولوی سید احمد ، "کلیات قلق" صفحہ ۳۶۴)

سوز کا ہم سبق ہونا اور صہبائی سے تعلیم پانا ظاہر کرتا ہے کہ قلق نے دلی کالج میں اپنی تعلیم مکمل کی تھی ۔ صہبائی[1] نے ۱۸۴۰ع میں دلی کالج کی ملازمت اختیار کی تھی ۔

سوز[2] دلی کالج کی تعلیم سے ۱۲۷۰ ہجری (مطابق ۴ ۔ اکتوبر ۱۸۵۳ع تا ۲۳ ۔ ستمبر ۱۸۵۴ع) میں فارغ ہو چکے تھے اور کتب عربیہ میں سے صرف فن منطق کی تکمیل باقی تھی اور فن طبابت کی تکمیل کر رہے تھے ۔ صابر کے بہ قول تذکرۂ گلستان سخن کا آغاز یکم شعبان ۱۲۷۰ھ اور اختتام آخر شوال ۱۲۷۱ھ کو ہؤا ۔ اس سے یہ نتیجہ

---

۱ ۔ مولوی امام بخش ـــــ مدرس اول فارسی خوانوں کے مقرر ہوئے ۔ ۱۸۴۰ع میں درس و تدریس کرنے لگے ۔ ('مومن' از فائق صفحہ ۲۴۶)

۲ ۔ دیکھیے حالات سوز ، صفحات ۲۷۷ ، ۲۷۸ ۔ گلستان سخن مطبوعہ مطبع مرتضوی دھلی ۱۲۷۱ھ ۔

نکالا جا سکتا ہے کہ سوز ۔ فارسی کی تکمیل ۱۸۵۳ع سے پہلے کر لی تھی اور علوم عربیہ اور فن طب کی تکمیل باقی تھی ۔ صابر کے یہ الفاظ قابل غور ہیں :

''اور علوم عربیہ .... پڑھ کر تحصیل منطق اور تکمیل فن طبابت میں مشغوف ہے ۔''

دلی کالج مشرقی شعبے کے طلباء انگریزی بھی خالی اوقات میں پڑھا کرتے تھے ۔ مسٹر بتروس پرنسپل کی رپورٹ (۱۸۴۵ع) سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی شعبے کے بعض طالب علم آیندہ سینئر انگلش وظائف کے مقابلے کا ارادہ رکھتے تھے ۔
(مرحوم دہلی کالج ، از ڈاکٹر عبدالحق ، صفحات ۴۰ ، ۴۱)

اس رپورٹ کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مولوی عبدالکریم سوز اور قلق دونوں خالی اوقات میں انگریزی بھی پڑھتے تھے ۔ مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ اور درگا پرشاد نادر مؤلف تذکرۂ نادر الاذکار وغیرہ اسی دلی کالج کے طالب علم تھے اور دہلی کے مدرسوں میں مدرس مقرر ہو گئے تھے ۔ اسی طرح دیگر طلبا بھی بعد تکمیل تعلیم سرکاری مدارس میں مدرس مقرر ہو جاتے تھے ۔ ان طلبا میں اتنی استعداد ہوتی تھی کہ دوسری زبانوں سے ترجمہ کر سکیں اور انگریزی سے ترجمے کی مشق بھی طلبا سے کرائی جاتی تھی[1] ۔

---

۱ ۔ مرحوم دہلی کالج ، از ڈاکٹر عبدالحق ، اشاعت سوم ۱۹۶۲ع صفحہ ۱۱۰ ــ (مرتب)

۱۸۴۹ع میں جو طلبا زیر تعلیم تھے ، اُن میں دو مشہور شخصیتیں قرار پائیں ، یعنی نذیر احمد اور ذکاء اللہ ۔ دلی کالج کے طلبا کی فہرست ہمارے سامنے نہیں ورنہ آسانی سے یہ فیصلہ کیا جا سکتا تھا کہ قلق نے کب سے کب تک دلی کالج میں تعلیم پائی ۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۲ع میں دلی کالج کی تعلیم سے قلق فارغ ہو چکے تھے اور اس کے بعد اُنھوں نے طب کی تکمیل حکیم غلام نقش بند خاں سے کی تھی ۔ مولوی سید احمد دہلوی کا بیان ہے :

"طب میں ارسطوے زماں حکیم نقش بند۱ خاں صاحب دہلوی سے تلمذ اور تجربہ حاصل کیا ۔"

(کلیات قلق ، تقریظ از مولوی سید احمد ، صفحہ ۳۶۴) ۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ سوز کے ساتھ اُنھوں نے تکمیل طب کی ہے یا جدا ۔ صابر نے اُن کے حالات کے ذیل میں صرف اپنے روابط کا ذکر کیا ہے ، تعلیم کے سلسلے میں کوئی بات نہیں لکھی ہے ، اس لیے قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دلی کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر کسی ملازمت میں منسلک ہو گئے تھے ۔

مومن کی حیات (متوفی۱ مئی ۱۸۵۲ع) میں ان کی تعلیم

---

۱ ۔ حکیم غلام نقش بند خاں صحیح نام ہے ، سہو کتابت سے لفظ غلام رہ گیا ہے ۔ (مرتب)

سے متعلق ایک واقعے کا ضمناً حوالہ ''آب حیات'' میں مومن کے ذکر میں ملتا ہے - آزاد لکھتے ہیں :

''اسی سلسلے میں نواب مصطفیٰ خاں کی ایک وسیع تقریر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسا ذکی الطبع آج تک نہیں دیکھا - اُن کے ذہن میں بجلی کی سی سرعت تھی وغیرہ وغیرہ - ساتھ اس کے مراسلت میں بعض اور معاملے منقول ہیں مگر ان میں بھی واردات کی بنیاد نہیں لکھی - مثلاً یہ کہ مولٰی بخش قلق مولوی امام بخش صاحب صہبائی کے شاگرد رشید، دیوان نظیری پڑھتے تھے - ایک دن خان صاحب کے پاس آئے اور ایک شعر کے معنی پوچھے - اُنھوں نے ایسے نازک معنی اور نازک مطالب بیان فرمائے کہ قلق معتقد ہو گئے اور کہا کہ مولوی صاحب نے جو معنی بتائے ہیں وہ اس سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتے - لیکن نہ وہ شعر لکھا ہے نہ کسی صاحب کے معنی لکھے ہیں - ایسی باتوں کو آزاد نے افسوس کے ساتھ ترک کر دیا ہے - شفیق مکرم معاف فرمائیں -''

(آب حیات، صفحہ ۳۹۶، ۳۹۷ - مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۶ع)

مذکورہ بالا بیان سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ قلق[1]

---

۱ - ''مدت طویل زبان پارسی از انفاس متبرکۂ مولانا امام بخش صہبائؔ فراگرفتند - گویند از جملہ شاگردان آن جناب بہ جودت طبع و حدت ذہن اختصاص داشتند -''

(کلیات قلق، تقریظ از حالی، صفحہ ۳۵۵)

مئی ۱۸۵۲ع سے پہلے دیوان نظیری صہبائی سے پڑھ چکے تھے اور اس کے بعد وہ فن طب کی طرف متوجہ ہوئے اور تکمیل طب کی ۔

دھلی کا شعری ماحول :

قلق جب دھلی پہنچے تو میدان علم و فن کے بیش‌تر مشاھیر موجود تھے اور دھلی کے باکمال ترک وطن پر مجبور نہ ھوئے تھے ۔ مفتی صدرالدین آزردہ ، نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکانات مرکز علم اور ادب بنے ھوئے تھے ۔ پھر ذوق ، مومن اور غالب سے چمن شاعری کی بہار شباب پر تھی ۔ قلعۂ معلیٰ میں حافظ عبدالرحمان احسان اور ذوق کی وجہ سے شاہ زادے مست صہبائے سخن تھے ۔ بہادر شاہ یوں تو قلعۂ معلی کے اندر حکومت کر رھے تھے لیکن شاعری میں فتح و ظفر کا ڈنکا بجا رھے تھے ۔ ولی عہد مرزا فخرو رمز تخلص بھی لیلائے سخن کے شیفتہ تھے ۔ ایسے شاعرانہ ماحول میں ایک نو وارد کا دل کیوں نہ بے قابو ھوتا ۔ صہبائی اردو کے شاعر نہ تھے ، فارسی میں مسلم‌الثبوت اُستاد تھے ۔ اُن کے دم سے فارسی کا رواج عام ھو رھا تھا اور شاگرد شعر و سخن میں بھی حصہ لیتے تھے ۔ گلستان سخن میں اُن کے بہت سے شاگردوں کا ذکر آتا ھے ۔ خود قادر بخش صابر بھی فارسی میں اُنھی سے مشورہ کرتے تھے ۔

آغاز شاعری :

قلق کی طبیعت موزوں تھی ۔ شاعرانہ ماحول ملا ۔

استاد صہبائی بھی شاعر تھے ۔ دهلی میں گھر گھر مشاعرے منعقد ہوتے تھے ۔ انھوں نے طبع موزوں سے مجبور ہو کر شعر کہے ۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں طبع موزوں نے شعر کہنے پر مجبور کیا ہوگا ، یعنی ۱۲۶۳ھ (از ۲۰ - دسمبر ۱۸۴۶ع تا ۸ - دسمبر ۱۸۴۷ع) کے لگ بھگ باقاعدہ شاعری کے میدان میں قدم رکھا ہوگا ۔ اس سے پہلے ۱۲۶۱ھ کے وہ مشاعرے جو مولانا کریم الدین مؤلف طبقات شعرائے ہند نے منعقد کیے تھے ، قلق کی نظر سے گزرے ہوں گے ۔ امام بخش صہبائی کے بیٹے عبدالکریم جو قلق کے ہم درس تھے اور نہایت ذکی اور فہیم تھے ، انھوں نے بھی اسی کے متصل موزونی طبع کے ابھارنے پر شعر گوئی شروع کی ہوگی ۔ عبدالکریم نے اپنا تخلص ''سوز'' رکھا اور غلام مولیٰ عرف مولا بخش نے ''قلق''۔ دونوں تخلص اس عہد میں انفرادیت کو ظاہر کرتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ دونوں تخلص صہبائی کے مجوزہ ہوں ۔

مومن کی شاگردی :

قلق نازک خیال اور دقت پسند طبع رکھتے تھے ، اس لیے ان کی نظر انتخاب مومن پر پڑی ۔ مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ لکھتے ہیں :

''فن شعر میں جناب حکیم مومن خاں صاحب دهلوی سے کمال بہم پہنچایا ۔''

(کلیات قلق ، صفحات ۳۶۴ ، ۳۶۵)

مولانا حالی کا بیان تفصیلی ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

''درآں ایام که گلشن دهلی را آخر فصل بهار بود ، جمعے از گراں مایگان عالم معنی و چابک خرامان عرصهٔ سخن چون غالب و ذوق و مومن و سائرین که در سخنوری و نکته پروری فخر دهلی بل نازش هندوستان بودند ، دریں معموره جا داشتند و از فیض وجود ایشاں عالمے را هواے شعر و سخن در سر افتاده بود - حکیم مغفور (قلق) که باموزونی طبع و جودت ذهن فکرے عمیق و نظرے دقیق داشتند ، باوجود مشاغل علمیه نه توانستند خود را ازیں بادهٔ مرد افگن نگاه دارند - لاجرم داعیهٔ غزل سرائی در خاطر ایشاں پدید آمد - مومن مرحوم را به استادی برگزیدند و رفته رفته در خاطر استاد موقع قبول یافتند -''

(کلیات قلق ، صفحات ۳۵۵ ، ۳۵۶، تقریظ از حالی)

قلق نے بہت جلد اُستاد کے مزاج میں دخل حاصل کر لیا اور وہ نکات اور رموز جو اساتذہ مدتوں میں اپنے خاص شاگردوں کو تلقین کرتے ھیں ، مومن نے انھیں تھوڑی مدت میں بتا دیے - ان کا رنگ کلام اُستاد سے ملنے لگا اور شاعروں میں ان کی شاعری کا چرچا ھونے لگا - مولانا حالی کا بیان ھے :

''تا آں که در اندک فرصت سخن ایشاں بر نسق خاصهٔ اُستاد خویش کمال پختگی پیدا کرده ، هر جا که بزم مشاعره انعقاد می یافت ، با استادان دیگر

هم طرح شدہ داد غزل سرائی می دادند و حاضرین
را تعجب بر تعجب و حیرت بالاے حیرت
می افزودند ۔''

(کلیات قلق ، صفحہ ۳۵۶)

اس طرح قلق نے اپنی ذہانت اور مشق سے دہلی کی علمی اور ادبی مجلس میں اچھا مقام پیدا کر لیا ۔ وہ عمر تعلیم کی تکمیل اور فن طب پر عبور حاصل کرنے کے بعد دہلی ھی میں رہ پڑے ۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ آنھیں کسی سرکاری مدرسے میں مدرس فارسی کی جگہ مل گئی ہوگی جس طرح کہ بعد میں ملازمت سرکاری ھی پر آن کی ضروریات کا انحصار رہا ۔

۱۸۵۷ع میں وطن کی واپسی :

۱۱ مئی[۱] ۱۸۵۷ع کو میرٹھ کی آزاد فوج دہلی میں داخل ہوئی ۔ بہادر شاہ ظفر کو جو نام کا بادشاہ تھا ، با اختیار بنایا گیا ۔ چوں کہ اس تحریک کا مرکز دہلی نہ تھا ، اس لیے حامیان آزادی کو قدم قدم پر اپنوں سے لڑنا پڑا ۔

---

۱ - ''به تاریخ ۱۱ مئی ایک گروہ مفسدین میرٹھ کا جس میں کچھ سوار اور پیادے تیسرے رسالے اور رجمنٹ ھاے ۲۰ ، ۱۱ ہندوستانی کے تھے ، صبح ۷ بجے پل کشتی سے عبور کر کے داخل دہلی ہوئے ۔''

(محاربۂ عظیم ، تاریخ بغاوت ہند ، از کنھیا لال ، مطبع نول کشور کانپور ، صفحہ ۵۵ ۔ داستان غدر از ظہیر دہلوی صفحہ ۸۹) ۔

بہادر شاہ ظفر کے گرد و پیش نا تجربہ کار افراد تھے ۔ اُس کے بیٹوں اور پوتوں کو اقتدار پسند تھا لیکن قربانی کا جذبہ نہ تھا ۔ حکیم احسن اللہ خان ، مفتی صدرالدین آزردہ ، نواب امین الدین احمد خاں ، نواب ضیاءالدین احمد خاں اور نواب حامد علی خان وغیرہ با اثر اکابرین دھلی اس تحریک سے الگ تھلگ رھے ۔ دھلی کے گرد و نواح کے بعض رؤسا جنگ آزادی میں مصلحتاً شریک ھوئے مگر والیان ریاست نے انگریزی اقتدار میں اپنی بقا دیکھی ۔ اس لیے بہت جلد کمپنی کی فوجوں نے دھلی کا محاصرہ کر کے ستمبر ۱۸۵۷ع میں بہادر شاہ ظفر کو قید کر لیا ۔ بادشاہ پر مقدمہ چلا کر جلاوطن کیا گیا ۔ انگریزوں کی آتش انتقام سے بچنے کے لیے دھلی والے بھاگے ۔ ان میں امیر اور غریب یکساں تھے ۔ صہبائی کا خاندان بے قصور شہید کیا گیا ۔ ''فغان دھلی'' اور ''داستان غدر'' سے ان مصیبت زدہ افراد کے مصائب کا اندازہ لگایا جا سکتا ھے ۔ دھلی کے باشندے جو اپنے گھروں میں انگریزی فوج کے داخلے کے بعد امن سے بیٹھے ھوئے تھے ، انھیں جبریہ نکالا گیا ۔ غالب کے ۲ فروری ۱۸۵۹ع والے خط بہ نام مجروح سے ظاھر ھوتا ھے کہ دھلی میں اجازت داخلے کی ممانعت تھی اور جو چوری چھپے اپنے گھروں میں آ کر مقیم ھوتے تھے ، انھیں جرمانہ اور قید کی سزا ملتی تھی ۔ ۲ دسمبر ۱۸۵۹ع کے خط میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ھیں :

''تم آتے ھو ، چلے آؤ ، نثار کے چھتے خان کی سڑک ،

خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ - بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈہنا ، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا سن جاؤ -'' (خطوط غالب ، از مولانا مہر ، صفحہ ۲۸۵)

ان حالات میں مسلمانوں کے لیے دھلی میں ٹھہرنا موت کو دعوت دینا تھا - قلق اپنے وطن میرٹھ میں پہنچے - مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کا جذبۂ انتقام تیز تھا - میرٹھ بغاوت کا منبع تھا - ۱۸۵۹ع تک انگریزوں نے آزادی کے متوالوں سے مقابلہ جاری رکھا اور پھر نومبر ۱۸۵۹ع میں عام معافی کا اعلان کیا گیا - قلق نے یہ دن خاص میرٹھ میں گزارے یا نواح میرٹھ میں ؟ اس کا واضح ثبوت نہیں ملتا - مولانا حالی کا بیان اس سلسلے میں یہ ھے :

''ھرگاہ آتش بغی و فساد در چار سوئے دھلی بالا گرفت - ماہنے بہتر ازاں کہ بہ وطن گاہ خود معاودت نمایند، نہ دیدند - ناگزیر از دھلی بہ میرٹھ رفتہ رخت اقامت انداختند -''

(کلیات قلق ، تقریظ از حالی ، صفحہ ۳۵۷)

کلیات قلق میں دو قطعات کچیسر ضلع بلند شہر سے متعلق پائے جاتے ھیں - ان سے یہ ثابت ھوتا ھے کہ وہ کچھ مدت راجا کچیسر سے بھی وابستہ رھے - یہ زمانہ ۱۸۵۸ع کا ھوسکتا ھے - راجا گلاب[1] سنگھ نے جنگ آزادی کو

---

۱ - صحیفۂ زریں ، مرتبّہ پراگ نرائن بھارگو ، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۰۲ع ، صفحہ ۱۰۹ - فہرست اسماے خطاب یافتگان یوپی -

ناکام بنانے میں حصہ لے کر آٹھ ہزار روپے سالانہ جاگیر اور دو ہزار روپے کا خلعت اس صلے میں حاصل کیا تھا - ۱۸۵۹ع میں اس کا انتقال ہو گیا - قیاساً یہ زمانہ راجا گلاب سنگھ سے توسل کا ہوسکتا ہے -

قلق کو یہ دیہاتی فضا راس نہ آئی - پھر ہندوانہ علاقہ تھا اس لیے گوشت نہیں ملتا تھا - تنخواہ اگرچہ پچاس روپے ماہانہ تھی لیکن وہ اس ملازمت سے جلد ہی بیزار ہوگئے اور ملازمت چھوڑ کر میرٹھ پہنچ گئے - راجا سے گوشت نہ ملنے کی شکایت میں مزاحیہ قطعہ کہا ہے جو قابل دید ہے :

ماس بن ہے رسوئی اپنی بھنڈ
دال اور ہم ہری ہری مہراج
دال دیجے گئو کے جایوں کو
دانہ خوری کا بیل ہے محتاج

غالباً گلاب سنگھ کے مرنے پر آخر ۱۸۵۹ع میں قلق میرٹھ واپس آ گئے ہوں گے - یہاں انھوں نے سرکاری مدرسے میں مدرس فارسی کی ملازمت حاصل کرلی - حالی[۱] کے

---

۱ - ''و تا سال دویست و نود و ہفت ہجری کہ سال رحلت ایشان ازین خاک داں بہ عالم جاوداں است ، در آن جا بودند -''
(کلیات قلق ، تقریظ صفحہ ۳۵۷)

به قول میرٹھ میں باقی ایام زیست گذارے'۔

میرٹھ میں ملازمت اور طبابت :

' مولانا حالی کہتے ہیں کہ بعض سرکاری مدرسوں میں مدرس فارسی کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔ اسی پر اُن کی گزر بسر موقوف تھی اور خالی وقت میں به طور خدمت خلق به حیثیت حکیم علاج معالجه مریضوں کا کرتے تھے ۔

قلق کو طبابت میں اتنا دخل تھا که مقامی مریضوں کے علاوہ غیر ملکی مریض بھی اُن کے پاس علاج کے لیے آتے تھے ۔ میرٹھ کی چھاؤنی میں انگریز فوج قدیم سے رہتی تھی ، اس وجه سے میرٹھ میں انگریز مختلف کاروبار کے سلسلے میں رہتے تھے ۔ انھیں میں سے ایک انگریز عورت کا علاج قلق نے کیا تھا ۔ ان کی مجوزہ دوا مریضه کے خلاف مزاج تھی، اس لیے اُسے استفراغ ہو گیا ۔ قلق اس کے حسن سے متاثر ہو چکے تھے، اس واقعے کو فراموش نه کر سکے ۔ یه رباعی کہه کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے :

---

۱ - ''دربعض مدارس دولتی خدمت درس فارسی با ایشان تعلق داشت که وجه معاش و سامان قوت لایموت ایشان بود و نیز در طبابت دستے داشتند و لختے از اوقات عزیز را در علاج و مداواے بیماران بذل می نمودند ۔'' (کلیات قلق ، صفحه ۳۵۷)

در یاد کافرۂ منصرہ

جب بن کے طبیب واں رسائی پائی
پیتے ہی دوا اور انھیں قے آئی
اس چرخ کا یہ تازہ شگوفہ دیکھو
عیسیٰ نے 'مسیحا' کو زمیں دکھلائی

قلق رند مشرب تھے :

قلق کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے اُستاد مومن کی طرح آزاد مشرب تھے ۔ ایک رباعی میں شراب نوشی سے توبہ کا ذکر ہے ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ شاعرانہ بیان ہے یا اظہار حقیقت ۔ بہر حال اُن کی رند مشربی پر مبنی رباعی ملاحظہ ہو :

جو چھٹ نہ سکے آج وہ چھوڑا ہم نے
مے خواری کے سامان کو توڑا ہم نے
جاتا ہے کوئی خیالِ لذت توبہ
داماں ترا آخر کو نہ چھوڑا ہم نے

قلق عاشق مزاج بھی تھے جیسا کہ اوپر کی رباعی سے جو مسیحی محبوبہ کی یاد میں کہی ہے، ظاہر ہوتا ہے ۔ ایک اور رباعی میں بھی شاید اسی مسیحی محبوبہ کو یاد کیا گیا ہے :

مشرک ہیں بڑے کافرِ اکفر دجال
یہ چاہتے ہیں دل سے خدائی کا زوال

کر رحم ، مسلماں ہوں ، مسلماں ہوں میں
یا رب مجھے اس کافرہ کو دے بھی ڈال

ایک رباعی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سماجی دباؤ سے وہ اس معشوقۂ فرنگ کو نہ اپنا سکے ۔ ایک طرف دل کی خواہش تھی ، دوسری طرف معاشرے کی پابندیاں ۔ اس کا بیان اس طرح کرتے ہیں :

دنیا ہے خیالات سے سرشار قلق
باندھو نہ تصوراتِ دشوار قلق
معشوق فرنگ و بادہ تحفہ موجود
تقدیر سے سب ہیں تری ناچار قلق

میرٹھ کی نوچندی کا میلہ :

جس طرح شہروں میں نمائش منعقد ہوتی ہے اور اس میں دور دور کے لوگوں کو دعوت تفریح دی جاتی ہے، اسی طرح میرٹھ کی نوچندی کا میلہ دور دور تک مشہور تھا ۔ قلق بھی اس میلے میں شریک ہوتے تھے ۔ اس کا اظہار اس رباعی سے ہوتا ہے :

نوچندی کے میلے کا نہ پوچھو کچھ حال
ہوں دیکھ کے حیران کہ دوں کس سے مثال
یا روضۂ رضوان ہے سادہ سا مکاں
یا سیر سےش میرا ہی منقّش ہے خیال

میرٹھ کی طوائفیں :

میرٹھ کی طوائفوں کی قلق کے زمانے میں بھی شہرت

تھی ۔ ایک رباعی میں کہتے ھیں :

اس خطے کی جا عالم بالا میں نہیں
یاراے نظر چشم تماشا میں نہیں
ھر طائفه شایانِ طوافِ ملکوت
میرٹھ میں ھیں وہ لوگ که دنیا میں نہیں

معاشی حالت :

کلیات قلق کے مطالعے سے ظاھر ھوتا ھے که قلق کی آمدنی تھوڑی تھی اور مصارف زیادہ ۔ محمد حیات خاں گرداور محکمۂ چنگی سے چار روپے قرض لیے تھے ، اس کے شکریے میں قطعه کہه ڈالا ۔ آخری شعر ھے :

چلتا رھا یوں بھی کام ، ناکام
دلوائیے اب کے چار ، ناچار

سیاسی نظریات :

قلق ۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی کے چشم‌دید گواہ تھے ۔ دھلی پر جو بپتا پڑی ، اس میں وہ خود بھی شریک رھے ۔ اپنے عزیز استاد (صہبائی) اور استاد زادے (عبدالکریم سوز) کی شہادت سے ان کا دل تڑپ اٹھا ، لیکن تحریک آزادی ناکام رھی اور قوم پرست مایوس ھوگئے۔ پھر بھی وہ اپنے دلی جذبات کو چھپا نه سکے ۔ سوز کی شہادت پر افسوس کیا ، دھلی کی تباھی پر آنسو بہائے۔ کہتے ھیں :

یه شہر بلند عالم بالا سے تھا
ھم شکل غرض جنت ماویٰ سے تھا

اب کیا ہے اک آبادیِ ریگستان ہے
دھلی کو شرف قلعۂ معلیٰ سے تھا

انگریزی حکومت میں دینی احکام جس طرح پامال ھو رہے تھے، اُس پر اظہار خیال کرتے ھیں :

اس عہد میں احتسابِ ایمانی کیا
ابرامِ معاصی کی پشیمانی کیا
ھر دعویِ دیں حکم ایکٹ سے ڈسمس
ڈگری ہے کہ بے سود مسلمانی کیا

یہ رباعی ظاھر کرتی ہے کہ اکبر الہ آبادی سے پہلے کس طرح مغربی تہذیب اور معاشرت کا مذاق اُڑایا جاتا تھا ۔

اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قلق انگریزی حکومت سے نفرت کرتے تھے۔ اُن کا ذریعۂ معاش سرکاری ملازمت تھی ۔ کلیات میں ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں ایک قطعہ ملتا ہے ۔ رابرٹ جارج گری سے قلق کے روابط تھے ۔ ان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس میں مدح کے ساتھ سفارش بھی پائی جاتی ہے ۔ افضال الحق اور شمس الحق کو خدمت میں بھیج کر استدعا کی ہے کہ ان پر نظر کرم رہے ۔ اس سے یہ بھی ظاھر ھوتا ہے کہ ممدوح سے گہرے روابط تھے ۔ وہ کہتے ھیں :

تیرے جو انعام ھیں وہ خارجِ امکانِ شکر
تیرے جو اکرام ھیں وہ فارغِ مدحت‌گری

اس طرح قلق کے کردار کے دونوں پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ وہ انگریزی حکومت سے بادل ناخواستہ تعاون کر رہا تھا۔ اس کی معاش کا انحصار سرکاری ملازمت پر تھا۔ ورنہ دہلی کی تباہی اسلامی تہذیب کی تباہی تھی اور انگریزی احکام مداخلت فی الدین کے مترادف تھے۔

احباب :

احباب کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ ہندو، مسلمان دونوں سے اس کے تعلقات تھے۔ ہولی کی تقریب پر منظوم دعوت نامے فرمائش پر لکھے ہیں۔ ہندو احباب کے لڑکوں کی شادی پر فرمائشی دعوت نامے نظم کیے ہیں۔ اس طرح وہ نظیر اکبر آبادی کی مانند ہر طبقے میں مقبول نظر آتے ہیں۔ جن دوستوں سے ان کے خصوصی تعلقات تھے، ان کا پتا قطعات اور رباعیات سے چلتا ہے۔ دوستوں کی مدح میں قصائد کہہ کر انھوں نے غالب کی نمائندگی کی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قلق ریاکاری سے مبرا تھے۔ منافق دوستوں سے اظہار بیزاری کرتے ہیں :

حیف یارانِ میرٹھی کا نفاق
ایسے غیبت پسند ہیں خود رائے
مل کے ان سے خدا نہ کردہ خدا
عذرِ ابلیس سے بہت شرمائے

میرٹھ کے مشاعرے :

میرٹھ چوں کہ دہلی سے قریب ہے، اس لیے اپنی

علمی اور ادبی فلوں میں دہلی کی تقلید پر مجبور تھا۔ فارسی اور اردو کی طرحیں دی جاتیں اور مشاعرے منعقد ہوتے۔ اس کا پتا سید احمد حسن فرقانی شاکی اور باکی تخلص کے دواوین کے مطالعے سے چلتا ہے۔ قلق کا فارسی کلام کلیات میں شامل نہیں ہے، اس لیے صرف اردو غزلوں کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کب کہی گئیں اور کس مشاعرے میں پڑھی گئیں۔ شاکی نے بعض غزلوں کی نسبت نشان دہی کی ہے کہ وہ کس مشاعرے کی ہیں۔ کلیات قلق میں بھی اسی زمین کی غزلیں مل گئی ہیں جن سے کلام قلق کی تاریخی ترتیب واضح ہوگئی ہے۔ مثلاً شاکی نے ایک غزل طرحی مشاعرہ منعقدۂ جمادی الاول ۱۲۸۸ھ کی لکھی ہے۔ اسی زمین میں قلق نے بھی غزل لکھی ہے جس کا مطلع ہے:

کچھ زیست پہ جینا ہے نہ کچھ موت اجل پر
اک شکلِ توہم ہے رخِ یاس و امل پر

یا مشاعرۂ ماہ جمادی الاول ۱۲۹۱ھ کی طرحی غزل شاکی کی ہے:

افسوس ہے کہ شکل بشر ہو، ہنر نہ ہو
مژدہ تبر کو دو جو شجر ہو ثمر نہ ہو

قلق نے اسی طرح میں غزل کہی ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو:

دیکھوں تجھے مگر تری جانب نظر نہ ہو
کیا خوف مدعی کا مجھے رشک گر نہ ہو

یا شاکی کی ایک غزل ''آشیاں کو'' جو ۱۷ - ستمبر ۱۸۷۰ع کے اخبار ''پنجابی اخبار لاهور'' میں چھپی هے ، قلق کی غزل بھی اسی زمین میں ملتی هے - مطلع یه هے :

نه پوچھو ناتوانیِ فغاں کو
گرایا سر په میرے آسماں کو

یا ۲ - اکتوبر ۱۸۷۰ع کے مشاعرۂ میرٹھ کی ایک زمین میں قلق کہتے هیں :

سامان عیش و ناز هے آزار جاں مجھے
لایا هے تیرا شوق کہاں سے کہاں مجھے

مشاعرۂ میرٹھ جمادی الاول ۱۲۸۷ھ کی طرح میں مطلع هے :

کیوں سر به گریباں ستم آرا مرے آگے
تھا قول جو ناصح کا سو آیا مرے آگے

۲- جون ۱۸۷۲ع کے مشاعرۂ میرٹھ کی غزل کا یه مطلع بھی ملاحظه هو :

جدھر کو وه ستم آرا لگام لیتا هے
سپہر دوڑ کے فتراک تھام لیتا هے

دیوان فرقانی فارسی میں مشاعرۂ میرٹھ منعقده ۲- جون ۱۸۷۲ع کی ایک فارسی نعتیه غزل ملتی هے جس سے یه ثابت هوتا هے که میرٹھ کے ان مشاعروں میں اردو اور فارسی کے دو مصرعے دیے جاتے تھے اور جو دونوں زبانوں (اردو، فارسی) کے شاعر هوتے، وه دونوں زبانوں میں غزلیں کہتے تھے - سید احمد حسن ، فرقانی ، شاکی ، باکی چوں که

دونوں زبانوں کے شاعر تھے، اس لیے اُن کی اردو اور فارسی غزلیں طباعت کی وجہ سے محفوظ رہ گئیں ۔ قلق کا فارسی کلام اشاعت سے محروم رہا ۔ چوں کہ ۱۸۵۷ع کے بعد فارسی کا مذاق کم ہو گیا تھا اس لیے قلق نے صرف اردو کلام کی اشاعت پر زور دیا اور فارسی کلام کو نظر انداز کر دیا ۔

بہرحال میرٹھ کے اہل علم ان مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن دیتے ہوں گے اور قلق کا اپنے معاصرین میں ممتاز ہونے کی وجہ سے اساتذہ میں شمار ہوتا ہوگا ۔ اسی لیے جب عبدالصمد فوق شاگرد مظفر خاں گرم (شاگرد ذوق) اور قلق کے ایک شعر کے مضمون کے بارے میں جھگڑا ہوا تو قلق نے معذرةً کہا :

اے فوق آشنا ہے قلق ، غیر تو نہیں
عمداً نہ کچھ کہا ہے نہ سہواً ، خفا نہ ہو
نادر ہیں تیرے لفظ ، تو معنی ترے غریب
یہ ہرزہ فہم گر نہ ہوا آشنا ، نہ ہو

آگے چل کر کہتے ہیں :

سرقہ گمان بد ہے توارد ہے سوئے ظن
خورشید اقتباسیِ نورِ سہا نہ ہو

اس قطعے سے اُس کی صلح پسندی بھی ظاہر ہوتی ہے :

عقائد :

قلق کو صحابۂ کرام اور اہل بیت سے دلی محبت

تھی - اس کا اندازہ رباعیات اور مرثیے سے ہوتا ہے -
سرکار دو عالم کی محبت میں وہ اتنا مستغرق تھا کہ اسے شرک
کا شائبہ بھی اپنے جذبات میں سوس نہ ہوسکا - اس رباعی
سے عشق رسول کی گہرائی کا پتا چلتا ہے :

بے روے نبی عرضِ صفا کیوں ہوتا
اور آئنہ وحدت کا جلا کیوں ہوتا
معشوق کے جلوے سے ہے پیدا عاشق
ہوتا نہ محمد تو خدا کیوں ہوتا

صحابۂ کرام کی تعریف اس طرح کرتے ہیں :

اصحاب محمد جو اشارا کر دیں
دریاے کرم کو بے کنارا کر دیں
ہر ذرۂ ناچیز کو خورشید بنائیں
جو خشک ہو قطرہ اسے دریا کر دیں

واقعات کربلا پر ہرچشم اشک بار ہے - قلق بھی اشک باری
کرتے ہوئے کہتے ہیں :

آؤ قلق اب شاہ کے غم میں روئیں
فریاد کریں درد و الم میں روئیں
کیا ننگ ہے رونے سے ہمیں جب کہ حرم
سر ننگے کھڑے اہلِ ستم میں روئیں

اس عقیدے کے ساتھ وہ خدا سے بے باک نظر آتے ہیں اور
خیام کے قدم بہ قدم چل کر کہتے ہیں :

کہتا ہوں خدا لگتی عقیدے کے خلاف
ہے تیرا خطاوار سزاوارِ معاف
ہے رحم بھی شایان خدائی تجھ کو
انصاف یہی ہے کہ نہ کر ناانصاف

سل کی بیماری :

قلق کے متعلق قیاساً ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ شراب نوشی میں مبتلا تھے ۔ اس کے علاوہ دوسری مسکرات کے بھی عادی تھے جیسا کہ اس رباعی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شراب چھوڑنے کے بعد بھنگ بھی پینے لگے تھے اور اس توبہ سے انھیں تکلیف اٹھانی پڑی :

ہر رنگ سے اب مرتے ہیں توبہ کے سبب
ہم سیکڑوں دکھ بھرتے ہیں توبہ کے سبب
مے سے ہوئی توبہ تو ہوئی بنگ روا
لاکھوں ہی بدل کرتے ہیں توبہ کے سبب

غرض قلق کی صحت بگڑ گئی اور وہ جوانی میں بڑھاپا محسوس کرنے لگے جیسا کہ اس رباعی سے ظاہر ہوتا ہے :

وہ وقت شباب ، وہ زمانہ نہ رہا
وہ نشۂ مستی ، وہ ترانہ نہ رہا
آتا ہے کہانی کا مزا باتوں میں
اب اپنے سوا کوئی فسانہ ، نہ رہا

غرض سل جیسے موذی مرض نے قلق کو دبا لیا ۔

حکما کے یہاں سل کا مرض لا علاج ہے، لیکن قلق مرنے کو آمادہ نہ تھے۔ خدا سے دعا مانگنے لگے:

اے قادرِ مطلق! بہ طفیلِ لولاک
دے مجھ کو شفا مرض سے کر دے تن پاک
نا چیز ہے کس چیز سے شایانِ عذاب
جاں تیری ہے اور جسم ہے سرمایۂ خاک

لیکن موت کی دوا کسی کے پاس نہیں۔ سل کی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی اور پچاس سال کی عمر میں اس عالم ناپائدار سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ حافظ محمد امداد حسین ظہور تخلص ساکن میرٹھ نے یہ تاریخ وفات کہی:

قلق شاعرِ خوش گپ و خوش خیال
ز دنیا سوے دارِ جنت برفت
بہ بیماریِ سل کہ بُد جاں گسل
بہ تسلیم شاد و بہ ہمت برفت
سروش از پےِ سال گفت از ظہور
قلق شاعر ما بجنت برفت

۱۲۹۷ھ

تالیفات:

قلق کی یادگار 'کلیات قلق' ہے۔ قلق نے اپنے چھوٹے بھائی محمد عبداللہ زار تخلص (جو اکاؤنٹنٹ نہر جمن غربی تھے) کو وصیت کی کہ ان کا کلام مرتب کر کے چھپوا دیا جائے۔ محمد عبداللہ نے بڑے بھائی کی وصیت پر

عمل کیا اور قلق کا کلیات مرتب کر کے چھپوا دیا ۔ اپنے احباب سے کلیات پر تقریظیں لکھوائیں اور خود کلیات کا دیباچہ لکھ کر معذرت کی کہ قلق اپنی زندگی میں کثرت علائق کی وجہ سے کلام پر نظر ثانی نہ کر سکے۔ اب کلام میں اگر غلطی نظر آئے تو کاتب کے سہو کی وجہ سے رہ گئی ہوگی یا میری غفلت سے ، مصنف کو ایرادِ نقص سے معذور اور معاف رکھیں ۔

محمد عبداللہ کا یہ اعتذار حقیقت پر مبنی ہے ۔ قلق عربی اور فارسی کی کتب درسیہ ختم کر چکے تھے، فنِ طب پر عبور تھا ، انگریزی زبان سے واقف تھے ، اس لیے معمولی غلطیاں جو زبان کی نظر آتی ہیں، وہ اس وجہ سے رہ گئیں کہ مصنف کی موت کے بعد کلام مرتب ہوا ۔ ورنہ اس کی وسعت نظر کا اندازہ قصائد اور مرثیے سے ہوتا ہے ۔ ایسے شاعر پر جو صہبائی اور مومن کا شاگرد رشید ہو ، کم نظری کا اعتراض قطعاً درست نہیں ۔ ہاں زبان کی بعض خامیاں ایسی ہیں جو مقامی لہجے کی آئینہ دار ہیں ۔ جیسے :

رهوے گا ، کبھو ، ٹپکا پڑے ، وتنا وغیرہ

لیکن ''وتنا'' بجائے ''اتنا'' اور ''بے'' بجائے ''پہ'' کاتب کی غلطیاں معلوم ہوتی ہیں ۔ ''کبھو'' کا استعمال شیفتہ کے یہاں بھی نظر آتا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بول چال میں یہ لفظ تھا ورنہ قلق جو برسوں دہلی میں رہے تھے ، اتنے بے خبر نہ تھے کہ جان بوجھ کر ایسی غلطی کرتے ۔

گم شدہ کلام :

قلق کے چھوٹے بھائی سرکاری ملازم تھے اور اپنی ملازمت کی مصروفیتوں کی بنا پر کلیات کی ترتیب کا کام کماحقہ انجام نہ دے سکے - مثلاً رابرٹ جارج گری کی مدح میں قصیدہ ہے اور اسے قطعہ ظاہر کیا گیا ہے - اس طرح کلیات کی ترتیب میں انھوں نے اپنی پسند مد نظر رکھی یا سہل انگاری - قلق کے فارسی کلام کے متعلق ایک حرف نہیں لکھا ، حالاں کہ صہبائی صرف فارسی کے شاعر تھے اور مؤمن اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے - قلق صہبائی کے فارسی میں شاگرد رشید شمار ہوتے تھے - ان کا فارسی میں شعر نہ کہنا کسی طرح قابل قبول نہیں ہے - محمد عبداللہ نے فارسی کی طرف عام رجحان نہ پا کر فارسی کلام کو اشاعت سے محروم رکھا - اس کا فارسی میں دیباچہ لکھنا ظاہر کرتا ہے کہ انگریزی اسکول میں تعلیم پانے کے باوجود وہ فارسی زبان میں نثر لکھنے کی مہارت رکھتا تھا - ہو سکتا ہے کہ آیندہ قلق کا فارسی کلام مہیا ہو سکے -

انگریزی نظموں کے ترجمے :

قلق انگریزی زبان میں اتنی دسترس رکھتے تھے کہ آسانی سے انگریزی نظموں کا ترجمہ اردو میں کرتے تھے - اس حقیقت کا انکشاف اسماعیل میرٹھی کے صاحب زادے محمد اسلم سیفی نے ''کلیات و حیات اسماعیل'' میں کیا ہے - ڈاکٹر عبدالاحد خان خلیل لکھتے ہیں :

"۱۸۶۷ع سے ۱۸۷۰ع تک مولوی اسماعیل فارسی مدرس کی حیثیت سے سہارن پور میں مقیم رہے اور پھر انسپکٹر مدارس کے دفتر میں میرٹھ آ گئے ۔ اس زمانے میں قلق میرٹھی نے جو منتخب انگریزی نظموں کا ترجمہ اردو میں کیا ، اس سے بے حد متاثر ہوئے ۔ بہ‌قول محمد اسلم سیفی (کلیات و حیات اسماعیل صفحہ ۲۸٬۲۷) مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اس ترجمے کو دیکھ کر استعجاب ہؤا کہ شاعر ایسا کلام بھی لکھتے ہیں ۔ ایک طرف دور از کار تشبیہیں اور نفرت انگیز مبالغے جو غزل اور قصیدے کی جان سمجھے جاتے تھے ، ادھر مناظر قدرت اور جذبات انسانی کی صحیح مصوری، وہ بھی سادہ اور سلیس طرز میں ، حقیقت میں اس ترجمے کا مطالعہ ایک امر اتفاق تھا کہ جس نے مولانا کی طبیعت کا رخ بدل دیا ۔"

(اردو غزل کے پچاس سال ، صفحات ۲۴۷ تا ۲۵۰)

اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۸۶۷ع کے لگ بھگ قلق کچھ منتخب انگریزی نظموں کو اردو نظم میں کامیاب طور پر منتقل کر چکے تھے ۔ یہ متعین کرنا دشوار ہے کہ قلق نے ترجمے کا یہ کام کب شروع کیا اور کون سی نظم انگریزی سے اردو میں کب منتقل ہوئی ۔ لیکن آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دلی کالج کے طالب علم یہ کام بہت پہلے شروع کر چکے تھے ۔ خطبات گارساں دتاسی میں ۳۔ دسمبر ۱۸۶۶ع کے خطبے میں "جواہر منظوم"

مطبوعہ الہ آباد ۱۸٦۴ع کا ذکر ہے۔ وہ لکھتا ہے :

"اس مجموعے میں بعض انگریزی نظموں کا اردو ترجمہ درج ہے۔ ترجمہ بھی نظم میں ہے۔ حواشی میں عروض کے مسائل کے متعلق اشارات ہیں۔"

(خطبات گارساں دتاسی ، صفحہ ۵۲۸ ، مطبوعہ ۱۹۲۵ع اورنگ آباد دکن)

اس طرح یہ بات ثابت ہے کہ دلی کالج نے اپنے طلبا کے ذریعے اردو ادب میں ایک نئی روح پیدا کی تھی اور انگریزی ادب سے اردو دان طبقہ بھی متعارف ہونے لگا تھا۔ ۱۸۵۷ع میں دلی کالج کی تباہی کے بعد لاہور کو ادبی مرکزیت حاصل ہو گئی۔ گارساں دتاسی کے خطبہ[1] ۳۔ دسمبر ۱۸٦٦ع سے جامعۂ پنجاب کی تحریک کا پتا چلتا ہے۔ انجمن پنجاب کی داغ بیل اسی بنا پر ڈالی گئی کہ مشرقی علوم کے احیا کے ساتھ مغربی علوم سے بھی متعارف کرایا جائے۔ جس طرح دلی کالج کی جانب سے انگریزی اور عربی وغیرہ دوسری زبانوں سے ترجمے کرائے گئے تھے ، اسی طرح لاہور میں ترجمے کا کام شروع ہوا اور مختلف علوم کی کتابیں اردو میں منتقل ہوئیں۔ اردو شاعری کو نئے انداز پر ڈھالا گیا۔ انگریزی نظموں کے ترجمے کرائے گئے۔ قلق نے بھی کہا جاتا ہے کہ شاید لاہور کی انجمن کی تحریک پر یہ نظمیں اردو میں منتقل کی

۱ - خطبات گارساں دتاسی، صفحہ ۵۴۸ تا ۵٦۴ ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۲۵ع

تھیں - قلق کی ان نایاب نظموں کی دست یابی کے بعد ان کی شاعری کا صحیح تجزیہ ہو سکے گا اور یہ بات کہی جا سکے گی کہ مولانا محمد حسین آزاد ، مولانا الطاف حسین حالی اور محمد اسماعیل میرٹھی سے پہلے اردو شاعری میں نیا اسلوب پیدا کرنے میں کس کا ھاتھ تھا -

اردو کی چوتھی کتاب (برائے حلقہ بندی ممالک مغربی و شمالی مرتبہ مولوی ذکاءاللہ مطبوعہ مطبع مرتضوی دھلی ۱۸۸۸ع طبع سوم) سے معلوم ھوتا ھے کہ ترجمہ سر رشتۂ تعلیم پنجاب کے نام سے کوئی مجموعہ چھپا تھا - اس میں ایک نظم بہ عنوان ''جواں مردی کا کام'' ستر شعر کی تھی جس کا پہلا شعر یہ ھے :

تھا کسی ملک میں اک دولت مند
حق نے تین اس کو دیے تھے فرزند

اردو کی چوتھی کتاب کی بعض نظمیں ''گلزار نشاط'' سے لی گئی ھیں - مثلاً ''کتا اور بیل'' :

چرتا تھا جنگل میں لاغر کوئی بیل
ناتوانی سے تھا کتے کا دبیل

اس کتاب میں حالی اور اسماعیل میرٹھی کی نظمیں بھی ھیں -

بہر حال قلق کا فارسی کلام اور بعض انگریزی نظموں کے منظوم اردو ترجمے کلیات قلق میں شامل نہ ھو سکے -

اسی طرح مجموعی کلام پر آج تک تبصرہ نہ ہو سکا۔ حسرت موہانی ، یحییٰ تنہا اور اختر منیر نے مطبوعہ کلیات قلق پر تبصرے لکھے ہیں ۔ سب سے اہم رائے مولانا حالی کی ہے جنہوں نے پہلی بار مومن کی طرز خاص کا تعارف کراتے ہوئے قلق کو اس رنگ کا خاص متبع قرار دیا ہے ۔ قلق کے کلیات کی اشاعت ۱۸۸۳ع میں ہوئی تھی ۔ غالباً یہ کلام مرتب محمد عبداللہ نے احباب میں مفت تقسیم کر دیا اس لیے ارباب علم قلق کے کلام سے باخبر نہ ہو سکے ۔ اور آخری دور کے تذکرہ نگاروں (یعنی مولانا عبدالحی مؤلف گل رعنا اور رام بابو سکسینہ مؤلف ہسٹری آف اردو لٹریچر) نے بھی اُسے نظر انداز کر دیا ۔ اب پچاسی برس کے بعد اس کا کلام دوبارہ زیور طباعت سے آراستہ ہو رہا ہے ۔ ارباب علم قلق کا ادبی مقام متعین کر کے اردو ادب کی تاریخ کی ایک خامی کو دور کر سکیں گے ۔

شاگرد :

۱ ۔ تشہیر تخلص ، مغل بیگ نام ۔ قلق کے قدیم شاگردوں میں شمار ہوتے تھے ۔ نساخ لکھتے ہیں :

تشہیر تخلص ، مرزا مغل بیگ دہلوی شاگرد غلام مولیٰ عرف مولائی (مولا) بخش قلق :

کیا خاک نشیمن کوئی گلشن میں بنائے
گل خوش ہیں اگر ہم سے تو صیاد غضب ہے

(سخن شعرا ، صفحہ ۸۷۔ خمخانۂ جاوید، جلد ۲ ، صفحات ۹۲ ، ۹۳)

۲ - سحاب تخلص بھی قلق کے قدیمی شاگردوں میں سے تھے - دھلی کے قیام کے زمانے میں قلق سے فیض پایا تھا - مؤلف ''تذکرۂ شعرائے ھنود'' کا بیان ھے :

''کنور گوپال سنگھ خلف الصدق راجا سالک رام قوم مہاجن شاگرد غلام مولیٰ قلق - ان کے باپ اور ان کے بھائی دیوی سنگھ معزز اھلکار شاہ دھلی کے تھے اور وھیں سے راجگی کا خطاب ملا تھا - قلعہ معلیٰ کی جو بارہ ٹوپیاں مشہور تھیں اور جن کو اخیر وقت میں قلعے میں گھسنے کی منائی (کذا) تھی - آن میں یہ بھی تھے - ان کنور صاحب نے فارسی تو اپنے مکان پر مثل امیرزادوں کے پڑھی ، پھر اولڈ کالج دھلی میں داخل ھو کر کچھ انگریزی دیکھی - غدر کی تباھی کے بعد وکالت کا امتحان دیا - چناں چہ اب آپ متوسط درجے کے وکیلوں میں ھیں - عمر قریب پچاس برس کے ھوگی - یہ اشعار آپ کے نتیجۂ فکر سے ھیں :

شمع رو رو کے سر بزم یہ کہتی ھے کہ ھائے
خاک کرتی ھے مری گرمیِ بازار مجھے''

لالہ سری رام کا بیان ھے :

''کنور صاحب شعر قابل تحسین فرماتے - امیرانہ وضع داری ، زندہ دلی، دوست نوازی میں فرد تھے- انگریزی میں دست گاہ اچھی تھی - خلق و مروت

طینت میں داخل تھا ۔ مؤلف تذکرہ کے والد سے دوستانہ تعلقات تھے ۔ ۱۸۸۵ع میں انتقال فرمایا ۔ گو کبھی کبھی شعر کہتے تھے مگر با ایں ہمہ حق سخن ادا کر دیتے تھے ۔ حکیم غلام مولی بخش (کذا) قلق ۔ ارشد تلامذۂ حضرت مومن دہلوی سے اصلاح لیتے تھے ۔ کلام میں سوز وگداز ، درد تھا ۔

(تذکرہ شعرائے ہنود، حصہ دوم، صفحہ ۷۲۔ خمخانۂ جاوید جلد چہارم صفحہ ۸۶، ۸۷۔ بہارسخن، صفحہ ۱۹۱)

۳ ۔ شہرت تخلص ، نثار علی نام ، متوطن دہلی ، منشی حسین علی فرحت (شاگرد نصیر) کے بیٹے تھے ۔ فن سخن میں پہلے اپنے والد اور پھر قلق سے اصلاح لی ۔ سابق ریاست جموں و کشمیر میں افسر سر رشتۂ تعلیم تھے ۔ انشا پرداز اور صحافی بھی تھے ۔ لالہ سری رام کا بیان ہے :

اخبار انجمن پنجاب ، خیر خواہ عالم دہلی وغیرہ کے اڈیٹر اور کشمیر ، جے پور ، میرٹھ میں برسرملازمت رہے ۔ باوجود پیرانہ سالی کے قلم کو ہاتھ سے نہ رکھا ۔ کئی سال لاہور میں مضمون نگاری کرتے رہے ۔ ۱۹۲۰ع کے قریب لاہور میں انتقال کیا ۔

نمونۂ کلام :

فنا ہوتے ہی پہنچے ایک منزل اس سے بھی آگے
پتا کوئی بتاتا ہی نہ تھا عمر گریزاں کا

(خمخانۂ جاوید ، جلد پنجم ، صفحات ۲۰۲، ۲۰۳)

۴ - صفا تخلص ، محمد حسین نام ، باشندۂ میرٹھ بھی قلق کے شاگرد تھے - حافظ قرآن تھے - ان کا ذکر ''سخن شعرا'' میں نساخ نے کیا ہے - ''کلیات قلق'' کی طباعت کی تاریخ ، فارسی میں صفا نے کہی ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل علم تھے اور دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے - نساخ نے ان کا یہ شعر دیا ہے :

تو سن کے کیوں کہ چونک اٹھا گر اثر نہ تھا
واعظ یہ میرا نالہ ہے ، شور اذاں نہیں

۵ - صفیر تخلص ، نور خان نام ، باشندۂ میرٹھ نے میر حسین تسکین اور قلق سے اصلاح لی تھی - نساخ نے یہ شعر ''سخن شعرا'' (صفحہ ۲۸۳) میں دیا ہے :

تیری چالوں سے فتنۂ عالم
روز رہتا ہے روز محشر کا

(سخن شعرا ، صفحہ ۲۸۱- کلیات قلق ، صفحات ۳۷۵ ، ۳۷۶)

۶ - عشرت تخلص ، ہوشیار سنگھ نام ، ساکن میرٹھ نے قلق سے استفادۂ سخن کیا ہے - مؤلف تذکرہ شعرائے ہنود لکھتے ہیں کہ ۱۸۶۰ع میں انھوں نے دو ایک غزلیں لکھیں اور قلق سے اصلاح لی - پہلے امین دیوانی اور قانون گو اور نقشہ نویس وغیرہ رہے ، پھر ملازمت چھوڑ کر انگریزی دواؤں کی دکان

میرٹھ میں کر لی - ۱۲۹۹ھ (۸۲-۱۸۸۱ع) میں گلاب سنگھ مشتاق نے یہ شعر بھیجا تھا :

اک جرعے میں تشفی کب ہو ہماری ساقی
پی جائیں خم کے خم ہم وہ بادہ خوار ہیں [کذا]

(تذکرۂ شعرائے ہنود ، حصہ دوم ، صفحہ ۱۰۵ از بشاش)

۷ - محب تخلص ، بابو خان نام ، باشندۂ میرٹھ بھی قلق کے زمرۂ تلامذہ میں داخل تھے - ''کلیات قلق'' میں ان کا یہ قطعۂ تاریخ ہے :

رنگینیِ طبیعت اور وہ کلام رنگیں
تازہ ہنوز جس سے اک داغ ہے قلق کا
تاریخ طبع دیوان جس دم محب نے پوچھی
ہاتف نے یوں ندا دی ''کیا باغ ہے قلق'' کا
۱۳۰۰ھ

(کلیات قلق ، صفحہ ۳۷۴)

۸ - مشتاق تخلص ، گلاب سنگھ نام ، قلق کے شاگرد رشید تھے - بشاش لکھتے ہیں :

مشتاق تخلص ، ٹھاکر گلاب سنگھ نام ، متوطن بیسواڑہ علاقۂ اودھ جو روڑکی کالج میں انجینئری کا علم تحصیل کرنے کے بعد عرصہ بیس سال سے سر رشتۂ نہر جمن میں ملازم ہیں - آج کل دھلی سے دریا پور تک کے سب اورسیر ہیں - شعر کا شغل حکیم غلام مولیٰ قلق کی صحبت سے بہم پہنچایا اور بہ قول منشی درگاہ پرشاد

صاحب نادر بدیہہ گوئی میں بھی قادر ہیں اور دس پانچ شاگرد بھی موجود :

مری جاں خون دامن گیر ہوئیں گے ہزاروں کے
تماشا دیکھنا آساں نہیں ہے رقصِ بسمل کا
ہو کے مشتاق اس ستم گر کا
دل نے رکھا نہیں کسی گھر کا
کس کس سے بےکسی نے کیا شرم سار حیف
رونے کو آیا ابر ہمارے مزار پر

مشتاق کے قطعات تاریخ، کلیات قلق اور ''تذکرۂ شعرائے ہنود'' میں ہیں جس سے ان کی مشق تاریخ گوئی میں ظاہر ہوتی ہے۔ محمد عبداللہ برادر خورد قلق اور مشتاق ایک ہی محکمے میں ملازم تھے۔ اس سے ان کے قدیمی روابط کا اندازہ ہوتا ہے۔

(تذکرۂ شعرائے ہنود، حصہ دوم، صفحہ ۱۲۱)

۹۔ ناچیز تخلص، کلیان سنگھ نام (خلف ٹھاکر مدن سنگھ) باشندۂ میرٹھ بھی بہ قول مؤلف تذکرۂ ''بہار سخن'' قلق کے شاگرد تھے :

ناچیز..... شاگرد جناب قلق میرٹھی۔ ہیڈ مولوی ڈی، ایس، ہائی سکول، عمر ۵۹ سال۔ کہنہ مشق، خلیق اور بااثر ہیں :

استفادہ اس قدر ہے نالۂ دل سے مجھے
شامِ غم آسان ہو جاتی ہے مشکل سے مجھے

(بہار سخن، صفحہ ۳۵۷ از برق سیتا پوری)

۱۰ - ناظم تخلص ، محمد شفیع متوطن میرٹھ نے بھی قلق سے فیض سخن پایا تھا - عبداللہ خاں ضیغم کا بیان ہے :

ناظم تخلص ، محمد شفیع نام ، خلف منشی محمد نادر علی متوطن میرٹھ قوم کنبوہ ہیں - چھتیس برس کی عمر ہے - سرکاری مدرسوں میں تعلیم پائی ہے - فارسی حکیم غلام مولیٰ سے پڑھی ہے - وہ مومن خاں مومن مرحوم کے شاگرد تھے - فن شعر میں بھی ان کو انھیں سے مشورہ ہے - مرثیہ گوئی میں شیخ سجاد حسین عشیر سے جو مشیر مرحوم کے شاگرد ہیں - صاحب تصانیف ہیں -

(یادگار ضیغم ، صفحہ ۳۳۹)

اس مختصر سی فہرست سے ''قلق'' کے شاگردوں کا دھندلا سا خاکہ نظر کے سامنے آ جاتا ہے - اس میں کم تر دھلی کے اور بیش تر میرٹھ کے متوطن ہیں - لیکن کوئی ایسا شاگرد نہیں ہے جس نے قلق کی مخصوص طرز کی ترجمانی کرکے استاد کے سلسلے کو آگے بڑھایا ہو -

معاصرین اور تذکرہ نویسوں کی نظر میں :

قادر بخش صابر سے قلق کی شناسائی تھی ، لیکن غریب الوطن دوست کا دو سطروں میں حال لکھ کر فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں - ملاحظہ ہو :

''قلق تخلص ، نوجوان ، خوش وضع ، خندہ پیشانی غلام مولیٰ عرف مولا بخش ، ساکن میرٹھ۔ طبیعت شعر سے مناسب اور فکر اس فن کے لائق ۔ راقم آثم سے رشتۂ اتحاد کو مربوط اور قاعدۂ وداد کو مضبوط رکھتا ہے ۔ تحریر تذکرہ کے وقت یہ ہی ایک مقطع یاد تھا ، ناچار اسی کو مرقوم تذکرہ کیا :

دیرینہ رفیق تھا قلق ہائے
وہ کیا ہی موا کہ مر گئے ہم

مولوی عبدالغفور نساخ نے قلق کا نام اور اس کے دو شعر لکھے ہیں - ۱۸۵۷ع کے بعد جب نساخ دہلی پہنچے تو قلق اپنے وطن جا چکے تھے ۔ اسی لیے قلق کے حالات سے بے خبر نظر آتے ہیں ۔ غالباً اُن کے پیش نظر صرف تذکرہ ''گلستان سخن'' تھا ۔ ایک شعر ''گلستان سخن'' سے اور دوسرا شعر سنا ہؤا نقل کر دیا ہے ۔ حالات ملاحظہ ہوں :

''قلق تخلص ، حکیم غلام مولیٰ عرف مولا بخش باشندۂ میرٹھ ، شاگرد مومن ۔''

(سخن شعرا ، صفحہ ۳۸۷)

مولوی سید احمد دہلوی ، سید تخلص مؤلف فرہنگ آصفیہ کا بیان ہے :

''آپ کے شعر وہ تڑپتے ہوئے اور برجستہ ہوتے تھے کہ کیسا ہی ٹھنڈی طبیعت کا آدمی کیوں نہ ہو

تڑپ ہی جاتا تھا۔۔۔استاد اور شاگرد میں جو ایک خاص نسبت ہونی چاہیے وہ آپ میں اور حضرت مومن خاں میں بہ خوبی موجود ہے۔ کوئی بڑا ہی صاحب مذاق ہو تو شاید یہ کہہ سکے کہ اشعار تو مومن خاں کے ہی ہیں مگر البتہ ابتدا اور انتہا کا کہیں کہیں فرق ہے، ورنہ ہر ایک کا کام نہیں ہے کہ مومن اور قلق کے سخن میں تمیز کر سکے۔ ان کے تڑپتے ہوئے اشعار، آپ (ان) کی طبیعت کی شوخی، زبان کی سلاست، خیال کی نزاکت کے گواہ ہیں۔۔۔ غرض معاملہ بندی، بلاغت، فصاحت، متانت، ساری خوبیاں آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ مرثیہ بھی لکھا تو اس زور کا کہ میاں انیس اور دبیر کو پرے بٹھا دیا۔ اچھے اچھے سنگ دلوں کو اپنی کیفیت بندی سے آٹھ آٹھ آنسو رلا دیا۔

رباعیاں عمر خیام سے لگا کھاتی ہیں اور قصائد خاقانی و انوری کا لطف دکھاتے ہیں۔ ہاں فرق ہے تو اتنا ہے کہ وہ زبان اَور ہے اور یہ زبان اَور۔ اردو زبان کو چار چاند انہیں کے کلام سے لگے ہیں۔"

(تقریظ کلیات قلق، صفحات ۳۶۵)

حافظ امداد حسین ظہور میرٹھی کا خیال ہے :

''ہر شعر میں ایک نئی ادا ، ہر غزل پر ایک نیا جوبن ، ہر رباعی کی نئی طرز ، ہر قطعے پر نئی پھبن ۔ ایک ایک شعر ایک ایک دیوان کا مول ہے بلکہ بیش قیمت اور ان مول ہے ۔ قصائد میں عرفی اور ظہیر فاریابی کا انداز جلوہ فروش ، غزل میں جلال اسیر اور فغانی کا طرز نزاکت جوش ، رباعیات سے عمر خیام کا کلام یاد آتا ہے ، بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ اور ہی کیفیت پاتا ہے ۔''

(تقریظ کلیات قلق ، صفحات ۳٦۷ ، ۳٦۸)

مولوی عبدالحی صفا ، مؤلف تذکرۂ ''شمیم سخن'' رقم طراز ہیں :

''زمانۂ آخر میں ہر چند بہت شاعر ہوئے مگر صاحب کمال کا کلام ہمیشہ اپنا جلوہ علیحدہ ہی دکھاتا رہا ۔ اس کا گواہ دیوان قلق ہے ۔ حکیم غلام مولیٰ صاحب عرف مولا بخش مرحوم متخلص بہ قلق ، میرٹھ کے خطے میں ایک باکمال سخن فہم ، سخن سنج شاعر تھے ۔ آپ کو تلمذ حضرت مومن دہلوی سے حاصل تھا ۔ کلام آپ کا صاف و سلیس ، محاورات دل پسند و تشبیہات مناسبہ سے مملو نظر آتا ہے ۔ ہر مطلع لاجواب ، ہر مقطع رشک مطلع آفتاب ہے ۔ کہیں

حسن کی تعریف معشوق کا بیان ہے ، کسی جا
شام ہجر اور تنہائی کی داستان ہے ۔ فراقیہ و
مایوسانہ اشعار آٹھ آٹھ آنسو رلاتے ہیں ، وصالیہ
مضمون ہاتھوں طبیعت بڑھاتے ہیں ۔ ہر لفظ زبان دانی
کا مزہ دیتا ہے ۔ ہر مضمون خضر وادی نظم
بنا ہے ۔ ترکیب و بندش صاف صاف ، ہر بیت پر
صاد چشم انصاف ۔ درستیِ الفاظ و چستیِ معانی
دلوں کو لبھا رہی ہے ... ہر غزل میں شوخی
بھری ہے ۔ بلند پروازی خیالات ، معانی کو لے اڑی
ہے ۔''

(تقریظ از عبدالحی صفا ، کلیات قلق ، صفحات ۳۶۹ تا ۳۷۲)

اب مولانا حالی کی رائے سنیے : مولانا نے مومن کے
خاص رنگ کی وضاحت کر کے اردو ادب میں مومن اور
اس کے خاص شاگرد قلق کا نئے انداز سے تعارف کرایا ہے ۔
وہ لکھتے ہیں[۱] :

''جس زمانے میں کہ دھلی کے گلشن کی آخری فصل بہار
تھی ، یہاں عالم معنی کے سرمایہ داروں اور
میدان سخن کے تیز رفتاروں میں غالب ، ذوق اور
مومن جیسے شعرا جمع تھے اور دوسرے تمام شعرا
جو سخنوری اور نکتہ پروری میں نہ صرف

۱ ۔ دیکھیے تقریظ حالی ۔ کلیات قلق ، مطبوعہ مطبع انصاری ،
دھلی صفحات ۳۵۵ تا ۳۵۷ ۔

فخر دہلی بلکہ فخر ہندوستان (برصغیر پاک و ہند)
موجود تھے ، اور اُن کے فیض سے ہر ایک کے
دماغ میں شاعری کا خیال جاگزیں تھا ۔ حکیم
مغفور (قلق) جو موزونی طبع اور جودت ذہن کے
علاوہ فکر عمیق اور نظر دقیق رکھتے تھے، مشاغل
علمیہ کے باوجود اپنے کو اس مرد افگن شراب
سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ غزل گوئی کے شوق نے اُن
کو اُکسایا اور مومن مرحوم کو استادی کے
لیے منتخب کیا ۔ آہستہ آہستہ اُستاد کے دل میں
جگہ پیدا کرلی ۔ مومن مرحوم نے (جیسا کہ
اُن کے دیوان کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے)
غزل اور دوسرے اصناف سخن میں دو طرزیں روا
رکھی ہیں ؛ ایک عام اور دوسری خاص ۔ عام
طرز تو یہی ہے جو میر اور میرزا (سودا) اور تمام
مشاہیر شعرا اور بلند پایہ اساتذہ کی ہے لیکن جو
طرز مومن کی ایجاد اور اُنھیں سے مخصوص ہے ،
اگرچہ عام شعرا کے اسلوب سے بعید ہے مگر وہی
طرز اُن کی شہرت اور بلند آوازگی کا سبب بنی اور
برصغیر پاک و ہند میں نازک خیالی اور دقت
آفرینی میں اُنھیں مشہور کر گئی ۔ مومن نے
جب حکیم مولوی بخش قلق کی طبعی مناسبت اور
دلی رغبت اپنے خاص رنگ میں دیکھی تو اُن کی
طرف خاص توجہ کرکے اصلاح سخن اور اس
فن کے نکات اور رموز سمجھانے کے علاوہ اُن

پر لطف اور کرم اور شفقت فرمائی ۔ یہاں تک کہ تھوڑے عرصے میں قلق کے کلام نے اپنے استاد کے خاص رنگ میں پختگی حاصل کرلی ۔ جہاں محفل مشاعرہ منعقد ہوتی ، دوسرے اساتذہ کے ساتھ ہم طرح ہو کر غزل سرائی کرتے اور حاضرین مشاعرہ کو تعجب اور حیرت میں ڈالتے ۔''

قلق کی شاعری پر اول اہم تبصرہ مولانا حالی کا ہے اور آخری تبصرہ جسے تنقیدی حیثیت حاصل ہے ، حسرت موہانی کا ۔ یحییٰ تنہا نے بھی قلق کی شاعری کو متعارف کرانے کی کوشش کی ہے ، لیکن وہ اس لحاظ سے قابل توجہ نہیں کہ انھوں نے کلیات قلق کی تقریظات سے اقتباسات بغیر حوالے کے نقل کر دیے ہیں ۔ حسرت موہانی نے کلیات قلق کا مطالعہ کر کے متوازن رائے پیش کی ہے ۔ جس سے قلق کی شاعری کی ایک حد تک ترجمانی ہو جاتی ہے ۔ حسرت موہانی کے تبصرے کا خلاصہ یہ ہے :

قلق کی شاعری :

''مومن کے شاگردوں میں قلق کی شاعری کا رنگ اور انداز مومن سے اس درجہ مشابہ ہے کہ بعض موقعوں پر ان دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ نازک خیالی اور دقت آفرینی کی جو شان مومن خاں کی شاعری کے ساتھ مخصوص

ہے ، اس کا جلوہ قلق کی غزلوں میں بھی دل آویزی اور مسرت افروزی کی بہار دکھاتا ہے ۔ مثلاً :

یہ کس کا نقش پا خاکا ہے عالم کی صفائی کا
کہ ہنگامہ در و دیوار میں ہے جبہہ سائی کا
. . . . . . پشیمان ہونا ۔ نمایاں ہوگا ۔ حال زار پر
کینہ خواہی کو . . . . . .

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ان غزلوں کے اکثر اشعار ، دشواریِ مفہوم کے لحاظ سے مومن کے مشہور مطلع : ''سوختہ ساماں ہو گے '' یا اُنھیں کے ایک دوسرے شعر :

بچانا آبلہ پائی کو میری خار ماہی سے
کہ بام عرش سے پھسلا ہے یا رب پاؤں دقت کا

سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں ۔

کلام قلق کی یہ خصوصیت بعض موقعوں پر حد سے اس درجہ گزر جاتی ہے کہ ان کی شاعری کو بے لطف ، بلکہ کہیں کہیں بے معنی بھی بنا دیتی ہے ۔ جہاں کہیں ان کی شاعری اس اتفاق عیب سے پاک ہوتی ہے وہاں یہ نوی الفاظ ، رنگینیِ ترکیب و شادابیِ مضمون کا ایک ایسا طلسم شگرف باندھتے ہیں کہ مذاق سلیم اس کی تحسین و توصیف پر مجبور ہو جاتا ہے . . . . "

الفاظ کی تازگی اور ترکیب کی ندرت کے لحاظ سے ایسی چیزیں ھیں جو خاندان مومن کی شاعری کے ساتھ مخصوص ھیں اور جن کا وجود اس سے بہتر صورت میں ، بلکہ اس کی مانند بھی کسی دوسرے شاعر کے کلام میں مشکل سے پایا جاتا ھے ۔ مومن و قلق کی شاعریوں کی یہ مشابہت خوبی ھائے سخن کی طرح کلام کی کمزوریوں میں بھی بہ درجۂ اتم موجود پائی جاتی ھے ۔ غرابت الفاظ و تراکیب کی کثرت کلیات قلق میں بھی مومن کے دیوان سے کسی طرح کم نہیں ھے ۔ صحت زبان کی جانب نہ مومن کو کوئی خاص توجہ تھی نہ قلق کو ۔ بندش اشعار کی کم زوری سے نہ مومن کو احتراز تھا نہ قلق کو ۔ مثلاً :

غم بھی کھانے کو نہ جی بھر کے میسر آیا
تہی کاسۂ تقدیر سے دل بھر آیا

علاوہ بریں منتخب غزلوں کے سوا ان کے کلام کا زیادہ حصہ کم زور ھے ۔ مثلاً مرثیے کے ۱۸۶ بندوں میں سے شاید ایک بند بھی ایسا نہیں ھے جس کو ھم کسی مشہور لکھنوی مرثیہ گو کے منتخب مرثیے سے بہتر یا اس کے برابر قرار دے سکیں ۔ اگرچہ مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرھنگ آصفیہ نے محبت یا شاید ھم وطنی کے لحاظ سے یہاں تک لکھ دیا ھے کہ ”قلق ۔ مرثیہ بھی لکھا تو اس زور کا کہ

میاں انیس اور دبیر کو پرے بٹھا دیا . . .''
(رسالہ اردوے معلی ، جنوری ۱۹۱۱ع
صفحات ۳ تا ۸)

مذکورہ بالا آرا کی روشنی میں قلق کی شخصیت واضح ہو جاتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ مومن کی طرز خاص کے متبع صحیح معنوں میں قلق ہی تھے۔ اگرچہ وہ تسکین ، شیفتہ اور نسیم دہلوی کی طرح شہرت نہ پا سکے لیکن اُن کی شاعری معاصرین سے فروتر بھی نہیں ۔

کلب علی خاں فائق
۲ - کلب روڈ ، مجلس ترقی ادب لاہور
۱۴- مارچ ۱۹۶۶ع

گلستان نازک خیالی

معروف به

کلیات اردوے قلق

از

حکیم غلام مولٰی عرف مولا بخش قلق

مرتبہ

کلب علی خان فائق

حصهٔ غزلیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ردیف الالف

۱

جس روز حرفِ عشق ہم آہنگِ صور تھا
اے مشتِ خاک تجھ کو تأمل ضرور تھا

اک حرفِ شوق لاکھ زبانوں میں جا پڑا
وردِ ملک تھا جو وہی شور طیور تھا

رکھتا ہے تیرا دور (ورد؟) سدا نادر اتفاق
مے خانے میں وظیفۂ 'ربی غفور' تھا

یاں دل پہ ہاتھ تھا جو وہاں لب پہ مہر تھی
ہم کو بھی اپنی بات کا رکھنا ضرور تھا

آبِ سیہ میں بھی ہے 'انا اسوّد' کا جوش
یہ روسیاہ، سوختۂ تاب نور تھا

بے التفاتیوں سے غرض التفات تھی
وتنا[1] ہی تو قریب تھا جتنا کہ دور تھا

لو جوشِ قہر، شوقِ ترحم میں آ گیا
ثابت ہوا، گناہ نہ کرنا قصور تھا

اقبالِ شہ کو بزمِ گدا سے اٹھا دیا
کتنا ہمیں بھی عجز پہ اپنے غرور تھا

۱۔ قلق نے بجائے 'اتنا' مقامی بول چال کے لحاظ سے 'وتنا' استعمال کیا ہے۔

۴

آخر کمالِ عقل سے سمجھا زوالِ فہم
برقِ حصول ، شعلۂ شمعِ شعور تھا

کیا کیا نہ آرزو نے اٹھائیں قیامتیں
صورِ نفس سے سینے میں شورِ نشور تھا

دیکھا تو ہر طرح سے ہے بندہ قصور وار
تھا مختصر گناہ ، ترحم وفور تھا

بے اعتباریوں نے مری تجھ کو کھو دیا
ہے مجھ میں جو نہاں وہی تیرا ظہور تھا

موسیٰ کا کیا قصور ہے ، پوچھ اپنے شوق سے
وعدے کا تیرے تجھ سے تقاضا ضرور تھا

چھپتی ہے کوئی نسبتِ اُلفت ، بنایا ہے
شیشے کو اُس کی خاک سے دل جس کا چور تھا

اتنا بھی بے خبر کوئی، اتنی بھی بے خودی
اُس کے حضور میں بھی قلق بے حضور تھا

۲

برقِ سحابِ مہر ہے ابروے مصطفا
ہے طرّہ اُس پہ سایۂ گیسوے مصطفا

ہے تشنگانِ یاس کا کس درجہ اہتمام
کوثر لگی ہوئی ہے سرِ کوے مصطفا

ظلمت کے یہ نصیب کہ آبِ بقا ملے
کچھ پڑ گیا ہے سایۂ گیسوے مصطفا

کیوں کر نہ دیر و کعبہ میں ہم رنگ نور ہو
یاں پشتِ مصطفیٰ ہے وہاں روے مصطفا

۵

اے کاہشِ گناہ، سبک کر مجھے کہ میں
جنبش سے ہر نفس کی اُڑوں سوے مصطفا
اک پاؤں فرشِ خاک پہ، اک فرقِ عرش پر
ہیں دو جہاں کی پشت دو زانوے مصطفا
مفتِ نظارہ کوچۂ جنت کی دید ہے
وقفِ اشارہ ہے خمِ ابروے مصطفا
معراج، اوجِ وہم سے کیوں کر نہ ہو بلند
ہے نورِ عرش سایۂ مشکوے مصطفا
کیا تابِ آفتاب نہ ہو سرد حشر میں
ہے جلوہ ریز مہر وہاں روے مصطفا
کیا ہوں گے ہم ضیافتِ جنت سے شادماں
بھولے نہیں ہیں خُلقِ علی، خوے مصطفا
اہل حساب پوچھتے ہو کیا قلق کا حال
ہاں رند ہے مگر ہے ثنا گوے مصطفا

۳

ہے چاکِ سینہ دشنہ نما، وا محمدا
ہے غرقِ خون لب پہ صدا، وا محمدا
سمجھائے کوئی کس کو، سمجھتا ہے کون اب
ہے عقل سوز، داغ ترا، وا محمدا
کیا آرزو کی داد ملی ہے کہ ہائے ہائے
جز یاس آسرا نہ رہا، وا محمدا
کب کی جہاں سے شرم و حیا اُٹھ گئی مگر
تیرا نقاب ہی نہ اُٹھا، وا محمدا

رهتا ہے اس قدر کوئی نظروں سے دور دور
تجھ کو بھی ہم نے دیکھ لیا ، وا محمدا
کیوں کر نہ کھائیں ٹھوکریں اندھیرے کہ تو
آنکھوں سے مشلِ نور چھپا ، وا محمدا
لایا ہے سر پہ وعدۂ فردا ، قیامت آج
محشر سے پہلے حشر ہوا ، وا محمدا
کیا ایک حشر ، لاکھ آٹھیں گی قیامتیں
یوں بے قرار چھوڑ چلا ، وا محمدا
آنکھوں میں بن کے شوق بھٹکتا ہے اب وہ ہائے
کانوں میں تھا جو ذکر ترا ، وا محمدا
دل جوئیوں سے دل کو کسی کے لیا بھی تھا
تو نے خیال بھی نہ کیا ، وا محمدا
فرقت سے جانا خاتمِ دوراں ہے تیری ذات
قصہ غرض تمام کیا ، وا محمدا
کیوں ہجر میں جہاں کو ٹھکانے لگا دیا
کیوں سر پہ سب کا بوجھ لیا ، وا محمدا
حالِ قلق نزار ہے ایسا کہ حیف حیف
اب کون اس کا تیرے سوا ، وا محمدا

۴

کیا نکلتا ہے طریقہ دیکھیے تعزیر کا
بازوے قاتل پہ صدمہ ہے مری تقصیر کا
زخمِ دل بھرتا ہے دم کیا کیا تری شمشیر کا
ہر تمنا میں مری انداز ہے نخچیر کا

کیا ادا صیاد ھی کی دل کو آتی تھی پسند
حلقہ حلقہ دام کا اب پیچ ھے تقدیر کا

اپنی جانب اس قدر کھنچنا ترا اچھا نہیں
بے دریغی میں تری انداز ھے شمشیر کا

سخت مشکل ھو گیا دامن چھڑانا حشر کو
قصہ جب پھیلا ھماری خاکِ دامن گیر کا

اشک مژگاں سے ٹپکتے ھی زمیں کے پار تھا
دل میں شاید گھل گیا پیکاں تمھارے تیر کا

اقربا ، احباب ، ناصح ، چارہ‌گر برھم ھیں سب
ھے اثر یہ بھی ھمارے نالۂ دل گیر کا

یہ صفائے دل ازل میں بن گیا دشمن مرا
نا نوشتہ رہ گیا تختہ مری تقدیر کا

کس قدر توڑے ھوئے زنداں میں ھیں ھمت کو سب
اٹھتا ھے سو لغزشوں سے نالہ اب زنجیر کا

رنگ ، فرقت میں تری میرا اڑا کس رنگ سے
چشمِ گریاں سے رواں چشمہ ھے جوئے شیر کا

ناگہاں محشر اٹھا اور اٹھ کے بیٹھا یک بہ یک
دل تڑپ کر رہ گیا شاید ترے دل گیر کا

کیا عجب ھے تو بھی آ جائے تماشا دیکھنے
مضطرب کا تیرے نقشہ ، نقش ھے تسخیر کا

سن قلق بات اس کے منہ سے ، ھے طلسمِ طرفہ تر
گویا اک جھوکا ھے بوے غنچۂ تصویر کا

۵

قاصد کی جلدیوں نے یہ بدگماں بنایا
خط دیتے دیتے ہم نے پھر حرزِ جاں بنایا

جو رنگ اڑائے تھے کچھ عشاق کے فلک نے
بہرِ فریبِ بلبل، وہ گلستاں بنایا

دیکھو ستم ظریفی دودِ دل و جگر کی
اک آسماں کو پھونکا اک آسماں بنایا

شوخی نے تیری ظالم کس کو نہیں مٹایا
پر نقشِ پا کا تیرے کیوں کر نشاں بنایا

تو وہ کہ اک نظر میں سارا جہاں اجاڑا
میں وہ کہ تیرے دل میں اپنا مکاں بنایا

آئینے کو تو دیکھو، وہ شکل پیش لایا
مجھ کو یہاں بگاڑا اور اس کو واں بنایا

فصلِ بہار اپنی گزری ہے یوں ہی ساری
یاں آشیاں بنایا، یاں آشیاں بنایا

اتنے مکدر آنسو کس کے گرے زمیں پر
اے چرخ تو نے جس کو ریگِ رواں بنایا

کیا کچھ بھرا ہے ظالم تجھ میں فریبِ الفت
اک ہی نظر میں دل کو آشوبِ جاں بنایا

گر دل سے آئے لب پر، اڑ جائے رنگِ محشر
کس حرفِ آرزو کو یا رب فغاں بنایا

کس کی نظر سے سیکھے انداز یہ قلق نے
اس سادہ گو کو کس نے جادو بیاں بنایا

٦

شیوہ تری حیا کا رسواے عام نکلا
یہ پردہ کیا بھلا ہے جب اس سے نام نکلا

آخر ہواے گلشن لائی قفس میں ہم کو
شوقِ نظارۂ گل جاسوسِ دام نکلا

اغیار سدّ رہ تھے ، ہم جس طرف کو نکلے
جس آستاں پہ آئے ، تیرا مقام نکلا

نقش قدم نہیں ہے ، چیں بر جبیں زمیں ہے
کوچے کا تیرے رستہ نازک مقام نکلا

کچھ سن کے مدعی سے گزرا میں اپنے جی سے
نا کام کا تمھارے لو کس سے کام نکلا

سجدے میں ہے صراحی ساغر قعود میں ہے
مے خانہ تو سراسر بیت الحرام نکلا

ہم جان و مال دے کر کچھ دل میں لے رہے تھے
سوداے پختہ لیکن آخر کو خام نکلا

کیا درپئے کمیں ہے بہرِ نظارہ خورشید
زیرِ زمین چھپ کر ، بالاے بام نکلا

ہے شورِ بے وفائی تیرا گلی گلی میں
یوسف پہ خندہ بے جا ، تو خود غلام نکلا

بزمِ عدو سے اٹھنا سامانِ حشر ٹھہرا
لو وعدۂ قیامت بھی بے قیام نکلا

دیکھو تو یادِ قاتل کس درجہ جاں فزا ہے
جان آ گئی بدن میں جب منہ سے نام نکلا

وہ ذکر تھا تمھارا جو انتہا سے گزرا
یہ قصہ ہے ہمارا جو ناتمام نکلا

بے تابیوں نے مارا آخر قلق کو، دیکھا
ناداں اسی گلی سے دل تھام تھام نکلا

۷

وصل ہوتا تو نزاکت کا بہانا ہوتا
حشر تک بھی تو نہ آتے اگر آنا ہوتا

غیر سے جرم وفا گر نہیں ہوتا تو نہ ہو
سیکڑوں ڈھب تھے اگر تم کو ستانا ہوتا

رحم کرتے کہ نہ تھی خواریِ الفت معلوم
مجھ کو نادان ہی تم نے کبھی جانا ہوتا

تم مرے پاس اگر بیٹھتے کیا ٹھہرتا دل
پہلو سے اٹھنے کا صدمہ تو اٹھانا ہوتا

بخت واژوں سے مجھے مر کے بھی مرنا پڑتا
لبِ جاں بخش پہ گر میرا فسانا ہوتا

داد زخمِ دلِ ناشاد نہ کیا کیا لیتا
اپنے مژگاں کا اگر تو ہی نشانا ہوتا

گو کہ تقدیر ہی میں غیر کی لکھا تھا وصال
ہم تو جب مانتے جب تم نے نہ مانا ہوتا

رسم انصاف اٹھی خوب ہوا یہ ورنہ
زخمِ دل ہر کس و نا کس کو دکھانا ہوتا

کوششِ پردہ عبث، حوصلۂ دید کسے
جلوہ کیا کم تھا اگر منہ ہی چھپانا ہوتا

توڑتے غیر کا پیماں جو اُمیدیں بندھتیں
کرتے ٹھنڈا مجھے گر اور جلانا ہوتا

مجھ سے پیغام وصال ، اور ہی کچھ بات ہے یہ
غیر سے کہتے اگر مجھ کو سنانا ہوتا

تم بھی رہ رہ کے ندامت کو اُٹھاتے مرے ساتھ
دل لگانا کوئی بہتان لگانا ہوتا

میں اگر تجھ سے تمنائے اجل بھی رکھتا
حیلے میں حیلہ ، بہانے میں بہانا ہوتا

وعدۂ وصل سے ہم شاد تھے ورنہ ظالم
تجھ کو ناچار شبِ ہجر میں آنا ہوتا

اے قلق یوں ہی رہے گا تو سدا! خانہ خراب
تو کسی گھر نہیں کیا تیرا ٹھکانا ہوتا

۸

کچھ فتنہ ہوں زمیں کا ، کچھ شور آسماں کا
اس دل نے سر پہ رکھا جھگڑا کہاں کہاں کا

ہے گردِ رہ سے اُس کی یاں پیرہن بدن پر
محشر نے جیب اپنا دامن سے جس کے ٹانکا

گل چیں و باغ پیرا دونوں ہی ہیں قیامت
یہ رنگ گلستاں کا ، وہ ڈھنگ آشیاں کا

اے لطفِ چارہ فرما تدبیر اس کی ہو کیا
جو ہے علاج دل کا آزار ہے وہ جاں کا

سایے میں اپنے چھپ کر ملتا نہیں کسی کو
چارہ کرے گا کوئی کیا ایسے ناتواں کا

قطعہ

نامہ لکھا قلق نے سنتے ہیں اُس کی جانب
نزدیک آن پہنچا جب وقت امتحاں کا
بندہ تو نیم جاں بھی حاضر تھا بے تامل
پر کیا علاج کیجے اس کاوشِ نہاں کا
ہر موے تن ہے پیکاں ہر رگ ہے تیغِ بُرّاں
ہر دم بہ رنگِ آرّہ، آہنگ ہے فغاں کا
کچھ رحم اور کیجے تا آپ کو سنبھالوں
ایثار کیا کروں گا قدموں پہ نیم جاں کا
یہ حال پڑھ کے اُس نے اور قہر ناک ہو کر
لکھا جوابِ خط میں یہ شیوہ ہے کہاں کا
کل تک تو یہ ہی تیرا دعواے جاں نثاری
آشوب تھا زمیں کا اور شور آسماں کا
اور آج دم یہ تازہ تا جاں بچے کوئی دم
پردے میں لاغری کے ہے عذر امتحاں کا
تو اشک بن کے چھپ جا دامن میں اپنے ظالم
یا آہ ہو کے اُڑ جا جیسے اثر فغاں کا
سب تجھ سے ہی جو ہوتے عشاق اس جہاں میں
بر خود غلط نہ ہوتا یوں ناز نیکواں کا
ہوتا جو کوہ کن تو اور جوے شیر لاتا
شیریں ہی تیشہ کھاتی اس عشقِ جاں ستاں کا
یا قیس تو ہی ہوتا اور دشت دشت پھرتا
لیلیٰ کا فرق بنتا ستراؤ آشیاں کا

هم گرچہ سہل چھوٹے تشویشِ روز و شب سے
تھا بار دوش و بازو خود فکر امتحاں کا
پر دل میں سوچ ظالم غیرت کی یہ جگہ ہے
عالم کی رسم یوں ہے، یہ شیوہ ہے جہاں کا؟
یا گوشہ گیر ہونا دیر و حرم سے یکسر
یا مول لینا جھگڑا دل دے کے دل ستاں کا
سو تونے دونوں شیوے باتوں ہی میں نباہے
افسوس تجھ پہ ناداں یاں کا ہوا نہ واں کا

۹

کن نگاہوں سے دلِ مستانہ ہم پیمانہ تھا
رنگِ جستہ بسملِ خاکِ درِ مے خانہ تھا
زندگی جب تک تھی جب تک تجھ پہ ہم مرتے رہے
رزق تھا رونا، معاش آزارِ بے تابانہ تھا
ذکر تیرا سن کے ناصح سے آسی کے سر ہوا
تیرا دیوانہ مگر مطلب ہی کا دیوانہ تھا
اشک کے گرتے ہی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا
کون سی حسرت کا یارب یہ چراغِ خانہ تھا
وہ بھی کیا دن تھے کہ خونِ دل سے تھا ہم کو فراغ
اپنا ہی شیشے پہ قابو اپنا ہی پیمانہ تھا
یہ تمنا تھی تری جو دل ہی دل میں خوں ہوئی
وہ ہمارا راز تھا، جو کو بہ کو افسانہ تھا
تھا ازل میں قادر قسمت کا اندازہ ہی کم
ورنہ مشتِ خاک کا مطلوبِ دل کیا کیا نہ تھا

اپنا ہی وادی ہے وہ موسٰیِ جہاں بھٹکا بہت
طور جس کی گرد ہے ، وہ اپنا ہی کاشانہ تھا
مذہب و مشرب سے یک رو ہے وہ چشم نیم باز
دیر گہ غارت ہوا اور کعبہ گہ ویرآنہ تھا
شمع جلنے پر مرے انگشت حیرت بن گئی
اور غبارِ گرم ، کحلِ دیدۂ پروانہ تھا
اے قلق اچھی گزاری تو نے، ہم کو اس سے کیا
یا مقیم کعبہ تھا یا زائرِ بت خانہ تھا

۱۰

شب[۱] سر شوریدہ بالیں پر مرا یک جا نہ تھا
دل میں تھا اک جوش ، لب پر نالۂ مستانہ تھا
جاں کسی کی زلف میں پابندِ پیچ و تاب تھی
دل کسی کی چشم غارت گر سے ہم پیمانہ تھا
پاؤں صحرا کی طرف تھے ، ہاتھ سوے جیب تھے
نالہ سینے سے لبوں تک آتے ہی بیگانہ تھا
حسرتِ خوابیدہ کیا کیا چونکتی تھی سینے میں
دل میں جوں جوں شور افغاں ہاے بیتابانہ تھا
عاقبت کی چشم پوشی چشم نے اس حال سے
اور غفلت یہ ہوئی طاری کہ ہوش اصلا نہ تھا
لے اڑی پھر دشت گردی خواب میں سوے چمن
اور چمن بھی وہ کہ آزادوں کا دام و دانہ تھا

۱- اس مسلسل غزل کو مطبوعہ کلیات (ص ۱۱) میں 'ق' یعنی قطعہ لکھا ہے - (مرتب)

چشم نرگس نے نہ دیکھا مجھ کو بیگانہ سمجھ
حق بہ جانب ہے کہ واں پر سبزہ تک بیگانہ تھا

گل بھی ہنستا تھا مرا چاکِ گریباں دیکھ کر
زیرِ لب سوسن کے بھی کچھ اپنا ہی افسانہ تھا

بیدِ مجنوں مجھ کو عریاں دیکھ کر تھرا گیا
مو پریشانی پہ سنبل بھی مری دیوانہ تھا

دم بہ خود شمشاد تھا یک سو کھڑا اس وضع پر
داغ سوزاں سے دل لالہ بھی آتش خانہ تھا

دودِ دل کچھ کچھ جو آجاتا تھا ہمراہِ نفس
موے آتش دیدہ ہر سو نالۂ مرغانہ تھا

کرتے کرتے سیر جب آگے بڑھا دیکھا وہاں
شکل میں عشرت کدے کی ایک عبرت خانہ تھا

اک طرف سے اڑ رہی تھی واں ہزاروں خم کے خم
کوئی بےخود کوئی بےتاب اور کوئی مستانہ تھا

نغمہ بر لب ، جان برکف ، دل نگارِ آستیں
سب محبت کیش تھے کیا حلقۂ رندانہ تھا

اور اک جانب کو حلقہ زن تھے چندیں شمع رو
مہر جن کے سامنے خاکسترِ پروانہ تھا

جس طرف کو ہنس دیا میدانِ محشر ہوگیا
پھر گئیں نظریں جدھر یک لخت سب ویرانہ تھا

اُن میں سے اک فتنہ گر اٹھ کر بڑھا میری طرف
زلف تھی رخ پر پریشاں ہاتھ میں اک شانہ تھا

خود بہ خود پہلو میں آبیٹھا کچھ ایسے ناز سے
گویا وہ غارتِ گر دل میرا ہی دیوانہ تھا

اور لگا کہنے کہ گیسو تو ذرا سلجھا مرا
اس طرح سلجھا کہ یہ گویا کہیں اُلجھا نہ تھا
زلف چہرے سے سرکتے ہی مؤذن چیخ اُٹھا
آنکھ پٹ سے کھل گئی ایسی کہ میں سویا نہ تھا
پھر وہی دل تھا، وہی ماتم، وہی درد و قلق
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

۱۱

مستم دید ہے، دیدار کا خواہاں ہونا
جس قدر دیکھنا، وتنا ہی پشیماں ہونا
سخت دشوار ہے، آسان کا آساں ہونا
خونِ فرصت ہے، یہاں سر بہ گریباں ہونا
تیرا دیوانہ تو وحشت کی بھی حد سے نکلا
کہ بیاباں کو بھی چاہے ہے بیاباں ہونا
کوچۂ غیر میں کیوں کر نہ بناؤں گھر کو
میری آبادی سے آباد ہے ویراں ہونا
خاکِ وحشی سے اگر ربط ہے ٹھوکر کو تری
دورِ دامن سے نہیں دور گریباں ہونا
نہ وہ خوں ہی ہے جگر میں نہ وہ رونے کا دماغ
مل گیا خاک میں ہر اشک کا طوفاں ہونا
جی کا جی ہی میں رہا حرفِ تمنا افسوس
کہنا کچھ آپ ہی اور آپ پشیماں ہونا
دل سے اندازِ شکن، زلف نے سب جمع کیے
چھیڑ کر اُس کو کہیں تو نہ پریشاں ہونا

تجھ کو ارمانِ خرابی ہے جو اے دہلی اور
سیکھ جا گھر میں مرے رہ کے ، بیاباں ہونا

دل ہے اک قطرۂ خوں ، جس پہ یہ سینہ زوری
کچھ سمجھتا ہی نہیں ہم صفِ مژگاں ہونا

مجھ میں کچھ تاب ہو اے جاں تومیں بے تاب رہوں
ورنہ دشوار ہے اس راز کا پنہاں ہونا

یادِ مژگاں سے ادھر زخم جگر پر کھانا
اور ادھر شورشِ دل سے نمک افشاں ہونا

آج وہ وقت قلق پر ہے کہ جوں ابن خلیل
غیرِ تسلیم نہیں قتل کا آساں ہونا

۱۲

یہ کس کا نقشِ پا خاکا ہے عالم کی صفائی کا
کہ ہنگامہ در و دیوار میں ہے جبہہ سائی کا

مٹا کر نقش میرا ، ناز ہے ان کو صفائی کا
بنایا ہے مجھے آئینہ اپنی خودنمائی کا

جبینِ پارسا کو دیکھ کر ایماں لرزتا ہے
معاذاللہ کہ کیا انجام ہے اس پارسائی کا

نہ ہوگی حشر تک سیری شہیدوں کی شہادت سے
کہ آبِ تیغ اک قطرہ ہے بحرِ آشنائی کا

زہے قسمت کہ اس کے قیدیوں میں آ گئے ہم بھی
ولے شورِ سلاسل میں ہے اک کھٹکا رہائی کا

ہم اس کوچے میں اٹھنے کے لیے بیٹھے ہیں مدت سے
مگر کچھ کچھ سہارا ہے ابھی بے دست و پائی کا

کہاں تک غیرت الفت سے در گزرے کوئی ظالم
ہمیں اب امتحاں کرنا ، تری تیغ آزمائی کا

سماؤں آنکھ میں میں اُس کی یہ ہووے تو کیوں کر ہو
یہاں خو صلح کیشی کی وہاں شیوہ لڑائی کا

نہ چین آئے گا اس کو در بدر پھرنے سے تا محشر
فلک ہے تنگ تر کاسہ مرے دستِ گدائی کا

اُڑے نالے فلک کو اور چھپے آنسو تہِ دامن
دلِ بے تاب پر صدمہ سا صدمہ ہے جدائی کا

وہ سیدھی بات سنتے سنتے اے لو ہو گئے ٹیڑھے
ہماری راستی سرمایہ ہے کس کج ادائی کا

ہوئے ہیں نالۂ ناکام کس کے گردِ رہ ، یا رب
کہ ہر جنبش سے دامن گیر ہے ارماں رسائی کا

قلق یہ تیرا ہے اور تیرے ہی دل کا کلیجا ہے
کہ اُس کا دوست بن کر ہو گیا دشمن خدائی کا

۱۳

حذر اک دم خیالِ مدعی سے ہو نہیں سکتا
تمھیں الزام کیا دوں ، جب مجھی سے ہو نہیں سکتا

ہمارا خون بہ جز الفت کسی سے ہو نہیں سکتا
تبسم سے جو ہوتا ہے چھری سے ہو نہیں سکتا

محبت وہ ہے جس میں کچھ کسی سے ہو نہیں سکتا
جو ہو سکتا ہے وہ بھی آدمی سے ہو نہیں سکتا

یہ کہنا ہے تو کیا کہنا کہ کہتے کہتے رک جانا
بیانِ حسرتِ دل بھی تو جی سے ہو نہیں سکتا

اُچٹتی سی نگاہیں ، کب جگر کے پار ہوتی ہیں
کرو خوں دوست بن کر دشمنی سے ، ہو نہیں سکتا

ہر اک سے مژدۂ دیدار کا وعدہ ہے محشر میں
کریں گے جب تو کیا پردہ ابھی سے ہو نہیں سکتا

نہ مجھ کو دوش پر تا گور لے جائے نہ موت آئے
یہ کس کام آئے گی کچھ بے کسی سے ہو نہیں سکتا

ہمیں کیوں دل دیا اور دل ربائی ان میں کیوں رکھی
خدا دشمن بتوں کی بندگی سے ہو نہیں سکتا

دم رخصت وہ مجھ کو دیکھ کر بےخود تو کیا ہوں گے
نہ اٹھنے دے انہیں ، یہ بھی غشی سے ہو نہیں سکتا

مجھے کھٹکا ہے محشر کا اٹھے گا اور کچھ فتنہ
کہ وہ ظالم تو خوگر منصفی سے ہو نہیں سکتا

جب آئینہ ہے اُن کے روبرو ، پھر کیا تکلف ہے
اٹھا رکھے خودی کو ، بےخودی سے ہو نہیں سکتا

کریں وہ پاک قصہ ، یہ نزاکت سے نہیں ممکن
اٹھاؤں ہاتھ ، یہ بے طاقتی سے ہو نہیں سکتا

بہ رنگِ نالہ کس کس دھوم سے اڑتا ہے رنگ اپنا
تری فرقت کا پردہ خامشی سے ہو نہیں سکتا

کہو ثابت کرے خوں کیوں کہ اس پہ[۱] داورِ محشر
کہ عذرِ قتل تک بھی نازکی سے ہو نہیں سکتا

۱- مطبوعہ کلیات صفحہ ۱۵ 'پر' ہے - 'پہ' ہونا چاہیے -
(مرتب)

قلق پیغام تیرا اور بیاں پھر اُس ستم گر سے
کسی سے ہو نہیں سکتا ، کسی سے ہو نہیں سکتا

۱۴

ہر طرح جب اپنی مشکل کو نہ آساں دیکھنا
موڑ کر گردن تری جانب ، ہراساں دیکھنا
بزمِ عیش و ناز میں گیسوے پیچاں دیکھنا
چشمِ جمعیّت میں ہے خواب پریشاں دیکھنا
کیا برا تھا وصل میں مرنا کسی انداز پر
تھا مگر قسمت میں میری روزِ ہجراں دیکھنا
گر یہی شوخی ہے داغِ دل میں اور دل بر میں ہے
ذرّہ ذرّہ گور کا ، طاؤسِ رقصاں دیکھنا
جاے باش اُس کی گماں و وہم سے کوسوں بعید
اور تلاش اپنی ، در و دیوار زنداں دیکھنا
تشنگی سے آگ ہے قاتل ہماری مشت خاک
آبِ خنجر کوئی دم میں گردِ میداں دیکھنا
اپنے ویرانے سے اب بیم خرابی کو ہے بیم
بے سر و سامانیوں کا میری ، ساماں دیکھنا
رخنہ گر یوں ہی اگر چندے نگاہ ناز ہے
اپنے اس برقع کو تو میرا گریباں دیکھنا
آسماں کو یاد ہیں کیا کیا گرفتاری کے ڈھنگ
ہم چلے کس شوق سے سوے گلستاں دیکھنا
کیا بلا سودا ہے بہرِ غیر تم کو ورنہ کیوں
دن میں سو سو بار از خود جیب و داماں دیکھنا

تو نہ کر منظور نظروں سے جدا کرنا مرا
آئنہ داری ہے تیری ، میرا حیراں دیکھنا
اے قلق بے ڈھب پڑا تجھ کو مذاقِ انتظار
اب نہ جائے گا کبھی تیرا پریشاں دیکھنا

۱۵

جب نقدِ حسن ، رونق بازار ہو گیا
سودائے نا قبولِ خریدار ہو گیا
اُڑتا نہ تھا خزاں میں کہ طاقت رہے درست
اور فصلِ گل جب آئی ، گرفتار ہو گیا
سب کی نظر سے اشک کی مانند گر پڑا
اتنا سبک ہوا کہ گراں بار ہوگیا
وہ آنے کو ہیں ، اس قدر اے ابر گریہ کیوں
پیمانۂ فلک کہیں سرشار ہوگیا
جب اپنا حال دیکھنا ، رو پڑنا خود بہ خود
پیمانہ عمر کا کہیں سرشار ہوگیا
کوئی تو زخم ہے کہ جگر خون ہو چلا
کوئی تو خار ہے کہ دل افگار ہوگیا
ہر وقت اُن کے آنے کی رکھتا ہے آرزو
دل بھی ہمارا خانۂ اغیار ہوگیا
میں ضعف سے جھکا تو نگہ شرم سے جھکی
مجبور وہ ہوئے ، جو میں ناچار ہوگیا
آتے نہیں خیال میں وہ مدعی بغیر
سامانِ وصل سہل تھا ، دشوار ہوگیا

مجھ کو نکالا غیر کا ارماں نکال کر
ہمراہِ مرگ اور اک آزار ہوگیا
دل ہی تو ہے نہ سنگ، جگر ہی تو ہے نہ خشت
اک وقت تھا کہ جبر بھی درکار ہوگیا
جب سے سنا ہے اس کو سرِ باز پرس ہے
عاصی نہ کردہ جرم، گنہ گار ہوگیا
ہر وقت پیرِ دیر کے در پر ہے یہ جواں
شاید قلق بھی واقفِ اسرار ہوگیا

۱٦

لذتِ قتل سے مقتل کو بھی بسمل دیکھا
ذرّے ذرّے کا تڑپنا روشِ دل دیکھا
جان کس طور سے نکلے مری اے گریۂ یاس
تو وہ دریا ہے کہ جس کا نہیں ساحل دیکھا
اب کس امید پہ الفت میں قدم فرسائی
جو کچھ انجام ہے ہم نے سرِ منزل دیکھا
غیر سے تھی یہ لڑائی کہ لڑاؤ آنکھیں
خاک و خوں[1] میں ترے کوچے کے بہت میل دیکھا

۱- یہ مصرع اس کے بعد کے شعر کا مصرع ثانی ہے، اس شعر کا مصرع ثانی نہیں - کاتب کی غلطی سے مکرر درج ہوگیا ہے، یا ہو سکتا ہے کہ قلق کے مسودے میں ایک مصرع ثانی پہ دو مصرع اول درج ہوں - اس طرح شعر دولخت ہو جاتا ہے - (مرتب)

نہ ہوئی پر نہ ہوئی شکلِ صفائی پیدا
خاک و خوں میں ترے کوچہ کے بہت مل دیکھا

جو ہیں ثابت قدم اُن کو نہیں صحبت سے گزند
موجِ دریا سے کہیں ڈوبتا ساحل دیکھا

حسرت قتل ہی سے ہو گئے ٹکڑے ٹکڑے
دیریابی سے ندامت زدہ قاتل دیکھا

کوئی سے خانے پہ غش ہے ، کوئی کوثر پہ فدا
دین و دنیا کو غرض ہم نے تو غافل دیکھا

اے قلق جور و جفا پر یہ شکایت اُس سے
شکر کر شکر وفا کے تجھے قابل دیکھا

۱۷

درِ کعبہ سے عجب قافلہ ناداں نکلا
نہ تو دامن کوئی نکلا نہ گریباں نکلا

تیرا اسرار تو ہر پردے سے پنہاں نکلا
کیا تکلف ہے کہ ارماں بھی نہ ارماں نکلا

ذکرِ اغیار کے آتے ہی قیامت آئی
سخت نادم ہیں کہ وہ سخت پشیماں نکلا

غیر کو وسوسۂ تفرقہ پردازی کیا
میں تری بزم سے لے کر غم دوراں نکلا

جتنے غم خوار گھٹے اتنے ہی آزار گھٹے
دل کے آزار کا آزار ہی درماں نکلا

نامۂ شوق نے میرے مجھے بدنام کیا
انجمن سے تری ہر اک سو غزل خواں نکلا

سعی کی اتنی کہ واماندگیوں سے گزرا
پھٹ کے دامن کی فراخی سے گریباں نکلا

جس کو جاں سمجھے تھے وہ تیغِ ستم راں نکلی
جس کو دل سمجھے تھے وہ خنجرِ برّاں نکلا

حسن کو حیف سدا عشق بد آموز رہا
شکنِ دل ، اثرِ وعدہ و پیماں نکلا

مل گیا جام جسے اُس کو ملی شوکتِ جم
ہر گدائے درِ میخانہ سلیماں نکلا

دیدہ و دل سے ہوا دیدہ و دل کا نقصاں
سر و سامان وبالِ سر و ساماں نکلا

اپنے ہی ہاتھ سے آزار بڑھایا ہم نے
کیوں گریباں کو کیا بخیہ جو داماں نکلا

شہر آباد ہے پر تو بھی ہے خالی خالی
اے قلق مر کے ترا کون سا ارماں نکلا

۱۸

آتے ہی سانس سینہ چاک ہوا
نکل اے جاں کہ میں ہلاک ہوا

سوزِ پنہاں کی پردہ داری دیکھ
آہ کرنے کو تھا کہ خاک ہوا

مجھ سے ہی اُن کو اُنس ہے شاید
مجھ پہ ہی ظلم تاک تاک ہوا

اب بلا سے وہ قتلِ عام کرے
میرا قصہ تو خوب پاک ہوا

یاں ہے[1] نازک مزاجیوں کی فکر
واں ہوس ناک سے تپاک ہوا
پردہ در ، فکر پردہ نے مارا
دیکھ دل کو کہ چاک چاک ہوا
دوستی زندگی کی اب معلوم
رنج اعدا مری خوراک ہوا
رکھتے ہیں منت وصال اس پر
ہجر میں جو ترے ہلاک ہوا
اے قلق خاکسار کو یہ دماغ
خاک ہو کر بھی تو نہ خاک ہوا

۱۹

غم بھی کھانے کو نہ جی بھر کے میسر آیا
تہی کاسۂ تقدیر سے ، دل بھر آیا
کیا میں اس کوچے میں آیا ہوں کہ محشر آیا
میرا سایہ بھی مرے سایے سے بچ کر آیا
عاقبت ، حسرتِ ناکامیِ ناوک سے ترے
میرا ہر لخت جگر ، نوکِ مژہ پر آیا
مجھ کو تسکیں تو بلا سے ہوئی خط پڑھنے کی
نامہ بر ٹکڑے ہی ہر چند کہ ہو کر آیا
بارِ دامانِ نزاکت ہے ، مری مشتِ خاک
سامنے جب مرے آیا ، وہ مکدّر آیا

۱۔ 'ہیں' نسخۂ مطبوعہ ص ۱۸ میں - 'ہے' ہونا چاہیے۔ تصحیح قیاسی کی گئی۔ (مرتب)

کچھ نہیں چارۂ کوتاہیِ دستِ قاتل
کہ لبِ زخم نہ بھر کر بھی برابر آیا

بوسہ لے کر ترا خاموش ہوا ہے بے حس
دہنِ غیر تھا اک زخم کہ بس بھر آیا

حادثہ زا ہیں محبت کی نگاہیں کیا کہنا
راہ ہم دیکھتے تھے تیری کہ محشر آیا

ظلم کرتا ہے تو کر داورِ محشر، ورنہ
داد کا نام نہ لے اب کہ ستم گر آیا

وہ اب آتا ہے تو اے جان کہاں جاتی ہے
جوشِ خود رفتگی کہتا ہے، مقرر آیا

اے فلک عزم کیا کس کے طوافِ در کا
کہ قدم رکھنے سے پہلے تجھے چکّر آیا

وہ ہے قابو میں تو قابو نہیں اپنے اوپر
کب گئے ہوش کہ جب سامنے دل بر آیا

وہ ہی میں، وہ ہی فلک وہ ہی عدو، وہ ہی نصیب
جانے کیا حادثہ ہے، کیوں وہ مرے گھر آیا

ظرفِ دل میں مرے وسعت سی ہے وسعت، توبہ
تنگ کیا کیا فلکِ حادثہ پرور آیا

وائے گر آج نہ پیمانہ ہو میرا سرشار
سامنے غیر کے لبریز ہی ساغر آیا

ذلتِ عشق وہ عزت ہے کہ وقتِ گریہ
میری تعظیم کو طوفاں بھی ہے، اُٹھ کر آیا

میرے قاتل نے یہ طوفان اُٹھا رکھا ہے
تا گلوِ خلق کے آبِ دمِ خنجر آیا

سیدھی نظروں سے وہ کس وقت ملا ہے مجھ سے
تجھ میں بل کاھے کو اے زلفِ معنبر آیا
اُس نے پامال کیا غیر کی خاطر ، صد حیف
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب اوج پہ اختر آیا
بدگمانی نے مرا کام بگاڑا ورنہ
بات سو مرتبہ قاصد تو بنا کر آیا
اس کو بھی سنیے قلق اور غزل پڑھتا ہے
جانے اس بزم میں کیوں کر یہ سخنور آیا

۲۰

وادیِ عشق میں جز یاس نہ رہبر آیا
جادہ اس راہ کا ہے راہ سے بچ کر آیا
تیر بھی سینے سے ہو کر مرے بے پر آیا
وھی وامانده ھوا جو کوئی یاور آیا
حادثہ جو مرے دل پر تھا وہ اُن پر آیا
کہ عدو اُن کی شکایت کو ، مرے گھر آیا
لے چلا شوق کہ پھر یاد ترا در آیا
پاؤں اُٹھتے ھی ٹھکانے ، دلِ مضطر آیا
قتل سے میرے ندامت سی ھے اُسے
مجھی پر توڑ کے آخر کو وہ خنجر آیا
برقِ خرمن ھے کبھی ، آتشِ دامن ھے کبھی
کس کی شوخی کا اثر ، اے دل مضطر آیا
تشنہ جانی کے مری جذب کو دیکھ اے قاتل
حلق پر میرے ترا ٹوٹ کے خنجر آیا

کیا ترا ناز ہے یہ بھی کہ اٹھا لوں میں ابھی
تو جو اٹھوانے کو در سے مرا بستر آیا

اس کا دل ہل گیا اور[1] غیر کا دامن پکڑا
کچھ تڑپنے کا مزا، اے دلِ مضطر آیا

یہ فسون جلوہ نمائی کا دکھاؤں کس کو
سامنے آیا کہ اک پردہ نظر پر آیا

گردش چشم سے ساقی کی پھرا مے خانہ
مے گری جام میں اور[2] گرتے ہی چکّر آیا

آخر آخر وہ تغافل مری غفلت سے اٹھا
کب وہ آیا ہے کہ جب دم ہی لبوں پر آیا

اس صفائی کو بھی اے رشک، مقدر ہے شرط
صلح کو آیا ہے اور غیر کو لے کر آیا

دل نہ تھا، مفت کا بہتان تھا، بے شک بے شک
گویا میں خود ہی تری زلف کے سر دھر آیا

دیکھ فریادیوں کو تو بھی تو اپنے ظالم
جیبِ صد چاک لیے، عرصۂ محشر آیا

دل کو کیا پیستا ہے باتوں میں، اللہ رے جگر
سنگ دل ہونے کا تیرے ہمیں باور آیا

قتل ہو کر بھی ہوں مجرم کہ ہے گردن پر خوں
ہو کے پامال بھی میں تجھ سے نہ برسر آیا

اس کے آنے ہی کا ارمان مرے ساتھ چلا
ہائے کس حشر کو، میں گور میں لے کر آیا

---

۱ و ۲- 'اور' بر وزن فع -

۲۰

دور سے خلد دکھاتے تھے ملائک پسِ مرگ
میں یہ سمجھا تھا کہ اب پاس ترا گھر آیا

یہ نیا پردہ ، نئی شرم ہے اے خانہ خراب
کہ کبھی غیر کے کہنے سے نہ باہر آیا

اس کے کوچے میں مجھے رہتا ہے کیا کیا پس و پیش
پسِ دیوار ابھی تھا کہ سوے در آیا

بدگماں تجھ کو بھی ہے خانہ تلاشی منظور
جب چلا تیر مرے دل ہی کے اندر آیا

قتل کر ، خون ہی تن میں نہیں دعوے کے لیے
عمر بھر خوں مری آنکھوں سے برابر آیا

وہ دلِ سرد میں ناصح کے شرارے اٹھے
آگ پانی میں تو اے اشک لگا کر آیا

اے قلق کس کی طرف سے ہے ترے دل میں غبار
قطرۂ اشک بھی آیا تو مکدّر آیا

۲۱

گر فلک تجھ کو خوار ہونا تھا
میرا مشت غبار ہونا تھا

حشر کو حق نہ کیوں کہ جانتے ہم
کشتۂ انتظار ہونا تھا

مرگ دشمن سے مر گئے ہم بھی
کیا تجھے سوگوار ہونا تھا

اے فلک ہر طرح مرا ارماں
صرفِ اندازِ یار ہونا تھا

آس کا ہم انجمن نہ ہونا تھا
دردِ دل ہم کنار ہونا تھا

چشم بد دور ، تیرِ نیم نگاہ
کیا جگر ، دل کے پار ہونا تھا

کیونکہ چھپ چھپ کے تجھ کو دیکھتے ہم
قتل کیا بار بار ہونا تھا

چشم بیمار کو تری ظالم
وقفِ پرھیزگار ہونا تھا

ھر جگہ آس کی رکھنی تھی آمید
ھر کہیں جاں نثار ہونا تھا

تجھ کو اے بستگیٔ دل شبِ ہجر
دیدۂ انتظار ہونا تھا

ھائے کس کس فریب سے مارا
عاشقِ روزگار ہونا تھا

قتل کرکے تو ہنس پڑا ہوتا
پردہ در پردہ دار ہونا تھا

یا نہ ہونی تھی چرخ کو گردش
یا مجھی پر مدار ہونا تھا

اعتبارِ عدو سے رشک نہ تھا
مجھ کو بھی بے اعتبار ہونا تھا

طرفگی وقت کی ترے دیکھی
آدمی کا شکار ہونا تھا

آس کی گردن پہ ہم کو چڑھنا تھا
جرم بے اختیار ہونا تھا

اے قلق شاعری ہے رسوائی
شہرۂ ہر دیار ہونا تھا

۲۲

حسن کس طرح سے برقع کا نہ خواہاں ہوگا
جو کوئی تجھ سے ملے گا، سو پشیماں ہوگا
درد پوشیدہ کسی ڈھب سے نہ پنہاں ہوگا
تجھ پہ مرنا مرے جینے سے نمایاں ہوگا
اُس کی بے داد میں بھی لطف کا ساماں ہوگا
سر نہ ہونے کا بھی سر پر مرے احساں ہوگا
بعدِ مردن بھی یہ کم بخت دبائیں گے مجھے
اہلِ درماں کا قضا سے بھی نہ درماں ہوگا
غمزہ گر رخنہ گری میں یوں ہی بے باک رہا
برقع تنگ کبھی رشکِ گریباں ہوگا
شہر چھٹنے پہ بھی چھٹتی ہے کوئی آبادی
داغِ وحشت ہوں کہ آباد بیاباں ہوگا
قید کر پہلی رہائی کی نہ میری ظالم
میں ہوا قید تو کیوں خانۂ زنداں ہوگا
بہر آبادی ہے، ہم خانہ خرابوں کی طلب
کوئی گھر خلد کی مانند نہ ویراں ہوگا
میری آغوش سے اٹھیں گے نہ فتنے کیا کیا
بخت خوابیدہ کا گر خواب پریشاں ہوگا
دل کی دل ہی میں رہی آرزوے رنگارنگ
مرقدِ تنگ مرا صحنِ گلستاں ہوگا

حیف جاں اس کی کہ دل ہاتھ میں جس کا ہے ترے
ہائے دل اس کا کہ جس شخص کی تو جاں ہوگا

ہے یہی سوز تو کیا غم ہے سیہ روزی کا
رنگِ برجستہ مِرا سروِ چراغاں ہوگا

زندگی اپنی اک اندازِ غلط ہے گویا
سہوِ کاتب مری تقدیر کا عنواں ہوگا

بزم سے میرے نکلنے کی، نکالو مت راہ
ساتھ ہی ساتھ مرے غیر کا ارماں ہوگا

تا کجا آتش خس پوش چھپی رہوے[1] گی
داغ تا چند چراغ تہ داماں ہوگا

کیا کہوں گا میں، کہو پردہ نشیں سے احوال
کہ دل و جاں سے نہاں حالِ دل و جاں ہوگا

گور سے بھی ہے دمِ حشر نکلنا دشوار
دل میں درماندہ ستم گار کا ارماں ہوگا

رنگِ گل برق بنے گا پئے خرمن سوزی
صحنِ گلشن میں اگر وہ گلِ خنداں ہوگا

جاں سے یہ آس نہ تھی، ہوگی وبالِ خاطر
دل سے امید نہیں، جاں کا خواہاں ہوگا

اے قلق تیری گراں باریِ حسرت ہے ہے
وائے وہ دن کہ سر دوش عزیزاں ہوگا

---

۱ - رہوے گی، بجائے 'رہے گی' مقامی بول چال کے مطابق استعمال کیا ہے۔

۲۳

چرخِ سرگشتہ نے ہر شیوے کو کیا کیا اُلٹا
پر وہی کوچۂ دشمن سے نہ آیا اُلٹا

غیر نے پہلے ہی سب پردہ اُٹھا رکھا ہے
تم نے کیوں رخ سے نقابِ شکن آرا اُلٹا

بے کسی سے ہمیں ماتم کا ہے اپنے ماتم
دل کچھ اس طرح بھر آیا کہ کلیجا اُلٹا

مجھ کو بے داد نے مارا تو نزاکت نے اُسے
جس کی گردن پہ ہے خوں، ہے اُسے دعوا اُلٹا

اپنے ہی تیر کی ہم آپ نشانی ٹھہرے
منہ کے بل نالۂ دل زور میں آیا اُلٹا

رکتا ہے اشک کوئی نوکِ مژہ پر آکر
پھرتا ہے ناصحِ مشفق کہیں دریا اُلٹا

تھا مگر سلسلۂ پا سے مسلسل شر
کہ پلٹتے ہی مرے دامنِ صحرا اُلٹا

کیا پھروں قاتلِ دل جو کے میں پیچھے پیچھے
ہے تقاضائے شہادت کا تقاضا اُلٹا

ایک دن بھی نہ ملے مجھ سے وہ ہو کر سیدھے
ایک شب بھی تو نہ چرخِ ستم آرا اُلٹا

ہائے خط کا وہ مرے پاس سے جانا تھم تھم
نامہ بر کا وہ ہر اک بات پہ آنا اُلٹا

بخت پلٹا ہے تو غم خوار ہیں ٹیڑھے ٹیڑھے
سیدھے سیدھے ہیں جو وہ چرخ ہے اُلٹا اُلٹا

ظرف کو بھی تو ذرا دیکھ لیا کر ساقی
ساغرِ غیر نہ بھر ، بھرتے ہی ہوگا اُلٹا
دیکھتا ساعدِ سیمیں کو **قلق** گر قاضی
خوں بہا ہم سے ہی قاتل کو دلاتا اُلٹا

۲۴

کیوں نہ ہم پہ کھل جاتا پہلے ہی مآل اپنا
شوق و ذوق میں لیکن کس کو تھا خیال اپنا
آئنے سے بچنا تھا کرنا تھا خیال اپنا
اب سنو گے کیا میری خود کہو گے حال اپنا
کس کو ہے دماغ اتنا کیجیے چارۂ فرقت
دل نہیں بجا[1] اپنا جی نہیں بحال اپنا
سخت جانیاں ہے ہے ، جاں فشانیاں ہے ہے
دل گرانیاں ہے ہے ، کیا کہوں میں حال اپنا
لیجیے تیغ حاضر ہے اور[2] گنہ بھی ظاہر ہے
دشنہ کار خاطر ہے اب تو بال بال اپنا
جاں دو لخت رہتی ہے دل دو نیم رکھتے ہیں
کب نہیں ہے فکر اُس کی کب نہیں خیال اپنا
وصل کا کہوں کیا حال، تھا عجیب اک جنجال
رشک نے کیا پامال سایہ تھا وبال اپنا

۱- نسخۂ مطبوعہ مطبع انصاری دھلی (ص ۳۴) میں 'بچا' بے معنی ہے ؛ بجا تصحیح قیاسی کی گئی - (مرتب)

۲- 'اور' بر وزن فع -

اپنا ہم نشیں آخر ہے کمیں گزیں آخر
ہوگیا یقیں آخر تھا جو احتمال اپنا

اُس کے سامنے آنا جان ہی سے ہے جانا
رنگِ چہرہ اُڑ جانا ہے دمِ مجال اپنا

اور ہی پہ مرتے ہیں یوں ہی تم سے ڈرتے ہیں
سچ تو ہے جو کرتے ہیں غیر انفصال اپنا

میرے دل کے دینے میں دیتے ہیں قدم اغیار
کیا سمجھ لیا ہے لو سب نے پائمال اپنا

تیری مہربانی میں جوشِ رو سیاہی ہے
سایہ خاک پر میری اے فلک نہ ڈال اپنا

کیا کروں محبت کو گر عدو کی فرقت سے
جی ہوا اُداس اُس کا، دل ہوا نڈھال اپنا

دل تھا ایک کھو بیٹھے، جاں بھی[1] ایک رو بیٹھے
ب کسے مر سودا سر ہی ہے وبال اپنا

شکر ہے قلق یہ بھی، غیر تو نہیں دشمن
ہے عدو ہنر اپنا، مدعی کمال اپنا

۲۵

ایک ہاتھ اور بھی لگا جاتا
جاں نکلتے ہی دم کچھ آجاتا

چھپا رہتا ہے جی میں حرف شوق
بن کہے چپ نہیں رہا جاتا

---

۱ - تھی ؟ - (مرتب)

بزم میں تیری سچ ہے اے ظالم
کون جز شکوۂ جفا جاتا

لاکھ دل جوئیاں کرے دل بر
دل گم گشتہ کیوں کہ پا جاتا

کوئی لیتا نہیں خبر شبِ ہجر
وہ نہ آتے تو صبر آجاتا

دل کو دے کر جو بیٹھ رہتا ہے
پند گو کی گرہ سے کیا جاتا

تو کسی گھر نہیں قلق ورنہ
بن بلائے وہ آپ آجاتا

۲۶

غیر مرتا ہے تو میرا امتحاں ہوجائے گا
رشک ہے یوں بھی کہ وہ ہم داستاں ہوجائے گا

رازِ دل اپنا اگر اُس پر عیاں ہو جائے گا
دشمن جاں وہ نصیبِ دشمناں ہو جائے گا

چاک دل مہ رو کے جلوے سے عیاں ہو جائے گا
میرا ہر تارِ نظر تارِ کتاں ہو جائے گا

کس طرح ہم روئیں کیا کیا تھے ہمیں رنگیں خیال
اشکِ ناکامی سے پھیکا آسماں ہو جائے گا

گر نگہ بانی ہے دزدیدہ نگاہوں کی یہی
تو ہمارا رشکِ دل خود پاسباں ہو جائے گا

کیوں نہ کرتے امتحانِ جوہرِ تیغِ نگہ
کس نے دیکھا تھا کہ دل تک زخمِ جاں ہوجائے گا

داغ ہائے دل دکھاتے ہی تماشا بن گیا
کیا خبر تھی تجھ سا ہی سارا جہاں ہو جائے گا

کس کو تھا معلوم یہ اے زندگیِ نامراد
زیست کا ارماں بھی اک مرگِ جواں ہو جائے گا

دیکھنا ہے ہم کو بھی اب غیر مرتا ہے وہاں
کچھ تو جینے کا سہارا ہم کو یاں ہو جائے گا

رازِ دل کو چٹ اُڑا لیں گے وہ صورت دیکھ کر
بے زبانی سے مری کچھ خود بیاں ہو جائے گا

برق خود ستراؤ صحنِ باغ میں ہو جائے گی
میرا اے گل چیں جو برہم آشیاں ہو جائے گا

گو ترے بننے سے بگڑے گا طلسمات جہاں
پر ہمارا کچھ نہ کچھ مٹ کر نشاں ہو جائے گا

آخر آخر راہ تیری دیکھتے ہی دیکھتے
رفتہ رفتہ ختم دور آسماں ہوجائے گا

اک طلسم بے کسی ہے کاروانِ کائنات
دوش بر دوشِ جہاں رخصت جہاں ہو جائے گا

پردہ داری عشق میں پردہ دری سے کم نہیں
میرا اندازِ خموشی خود فغاں ہوجائے گا

جاں کا کیا کھٹکا کہ قربانِ درِ دلدار ہے
سر کا کیا صرفہ کہ صرفِ آستاں ہو جائے گا

قدرِ ضبطِ حال و پاسِ وضع تجھ کو کچھ نہیں
ہم نہ کہتے تھے قلق رسوا وہاں ہو جائے گا

۲۷

جوہرِ آسماں سے کیا نہ ہوا
در خورِ عرضِ مدعا نہ ہوا

سعیِ جاں لائقِ دوش نہ ہوئی
دردِ دل قابلِ دوا نہ ہوا

ڈھیر ہے اک غبارِ خاطر کا
خاک ہے جس کا دل صفا نہ ہوا

حیف دستِ دعا و دامنِ ناز
خیر گزری کہ تو خدا نہ ہوا

'وحدہ، لاشریک، کیا معنی
نہ ہوا تو ہی آشنا نہ ہوا

رشکِ باہم ازل سے اول ہے
ایک کی شکل دوسرا نہ ہوا

واسطے دل کے ہے جگر درکار
دل ربا بھی تو دل ربا نہ ہوا

صاف ہاتھوں سے تیرے اڑ جاتا
خوں مرا طائرِ حنا نہ ہوا

اے فلک، ملتے ملتے کھو جاتا
کسی مفلس کا آسرا نہ ہوا

یاد دلوانا کیوں نہیں معیوب
شکر کب شکوۂ جفا نہ ہوا

رہبری اور مجھ سے وحشی کی
رہ نما اپنا رہ نما نہ ہوا

بے نصیبیِ بادشاہ نہ پوچھ
اس گدائی پہ بھی گدا نہ ہوا

نہ نکلتا کبھی مرے دل سے
میرا ہی تو بھی مدّعا نہ ہوا

کون بہتر عدو سے ہو ، سچ ہے
کشتۂ ذلتِ وفا نہ ہوا

اہل قبلہ کو ہے تلاش امام
اے قلق تو ہی پارسا نہ ہوا

۲۸

کیا آشیاں بتائیں کہاں تھا کہاں نہ تھا
تھا جلوہ گر فریبِ نظر گلستاں نہ تھا

وہ بعدِ قتل سوگ میں تھا شادماں نہ تھا
افسوس ہے مجھے بھی کہ میں سخت جاں نہ تھا

تھے کعبے میں بھی اپنے ہی یارانِ روشناس
تھا کون سا کہ راندۂ دیرِ مغاں نہ تھا

تھا اپنا ہی خیال غلط مدعی نہ تھے
تھا اپنا ہی فسادِ نظر آسماں نہ تھا

ممکن کہ کوئی اس کی طرف دیکھ بھی سکے
اس پر بھی اعتماد ہمارا وہاں نہ تھا

تا داستانِ وصل تو غم خوار تھے حریف
جب دردِ دل کہا تو کوئی درمیاں نہ تھا

لذت میں آبِ تیغ کی زخموں کو پی گیا
سر دوش سے الگ تھا ولیکن عیاں نہ تھا

تو غیر ہی کے ہو مگر اُلفت کا اعتبار
ظالم ترے یقین کا مجھ کو گماں نہ تھا

کر دیتے ہم تو جب ہی قیامت کو آشکار
مہماں ازل میں فتنۂ آخر زماں نہ تھا

تو کیوں تھکا ستم سے کہ ہے بوالہوس دلیر
تھا تیرا امتحان ، مرا امتحاں نہ تھا

مرتے موے مگر نہ کھلا رازِ قتل کچھ
جو زخم کارگر تھا اُسی کا نشاں نہ تھا

گہ زیرِ آسماں تھے گہے زیرِ خاک تھے
رہنے کی جا کہیں بھی ہمارا مکاں نہ تھا

صد گونہ التفات سے کرتا تھا ایک ظلم
تھا مہرباں کہ دشمنِ نا مہرباں نہ تھا

کیوں کر جلے نہ اختر طالع مرا کہ چرخ
برقِ نگاہِ یار سے کب ہم عناں نہ تھا

ہے ضعف میں تحملِ آرام بھی ستم
تھا سنگ میرے سینے پہ خوابِ گراں نہ تھا

زخمِ دلِ عدو بھی تو اپنا ہی زخم ہے
غم غیر کا بھی میرے لیے جاوداں نہ تھا

کب کوے غیر میں نہ رہے جان و دل قلق
کب دور گرد مجھ سے مرا کارواں نہ تھا

۲۹

کب عیدگاہِ سجدہ ترا آستاں نہ تھا
پر دوشِ خاص و عام پہ سر کا نشاں نہ تھا

صد آفریں کہ کی یہ جفا میں جفا کشی
کس طرح پاس اُس کو دمِ امتحاں نہ تھا

اُفتادگی کو تہمتِ واماندگی نہ تھی
فرسودۂ تپش پئے تاب و تواں نہ تھا

کیا جانے کتنے آتشِ اُلفت سے جل بجھے
کب عکسِ ذرہ شعلۂ برقِ فغاں نہ تھا

دی جاں پیامِ وصل میں اور کس خوشی کے ساتھ
یہ محوِ سود تھے کہ زیاں بھی زیاں نہ تھا

جاں دے چکے مگر ہے وہی دل کا اضطراب
صد حیف عاشقی کہ کوئی دل ستاں نہ تھا

بت خانہ وہ مقام کہ کعبے نہ جا سکے
مے خانہ وہ جگہ کہ خیالِ جناں نہ تھا

آفات کا حدوث ہے تقلیدِ وضع سے
سرگشتگی سے پہلے مری آسماں نہ تھا

جس جس کو اُس نے قتل کیا دی حیاتِ خاص
وہ زخمِ زیست تھا جو شکارِ سناں نہ تھا

کب تیز سوئے غیر نہ جانا پڑا اُسے
کب ہر قدم قرینۂ تیغِ رواں نہ تھا

خیلِ بلا و لشکرِ حرماں کا کیوں ہجوم
رازِ نہاں مرا، جرسِ کارواں نہ تھا

پردے لگائے لاکھ اک اپنی نگاہ نے
یوسف کے خواب میں بھی کوئی پاسباں نہ تھا

آوازِ پائے مور ہے خلخالِ آسماں
پر آشنائے گوشِ خلائق فغاں نہ تھا

صد حشر نیم نالے میں ہوتے تمام ، پر
کچھ اعتمادِ وعدۂ عمرِ رواں نہ تھا

آیا وہ دیکھنے کو دمِ نزع اے قلق
کس طرح ہو یقین کہ وہ بدگماں نہ تھا

۳۰

وفا کی قدر ہوئی گر جفا شعار کیا
کہ اُلفتِ کس و ناکس سے ننگ و عار کیا

فریبِ وعدہ سے ظالم نے بے قرار کیا
غضب کیا کہ تصور کو انتظار کیا

کس اعتبار پہ جینے کا اعتبار رہا
کس اختیار پہ مر جانا اختیار کیا

وہ تو کہ غیر کی محفل میں داغِ رسوائی
میں وہ کہ دل کو بھی اپنے نہ غمگسار کیا

مٹے ہوئے ہیں تغافل کی کارسازی پر
کہ تیرے سہو کو وعدے کا یادگار کیا

نقاب چہرے پہ ایسا کبھی نہ دیکھا تھا
یہ کس کا دامنِ نظارہ تار تار کیا

اُلٹ دیا تھا خم مے اُلٹ گئی قسمت
نگاہ تشنہ نے ساقی کو ہوشیار کیا

هزار سال کوئی رازِ دل کہے تو کیا
خبر اُسے بھی نہیں جس کو راز دار کیا

کہاں تھے اہلِ حرم اہلِ دیر سے پوچھو
بتوں کے جلوے نے کعبے کو سنگ سار کیا

یہ ناتواں، نہ ملا موت کو کبھی جس پر
ہر ایک لمحے کے آنے نے شرم سار کیا

وہ بوے گل سے سدا بد دماغ رہوے گا
صبا نے خاکِ چمن کیوں مرا غبار کیا

قلق ہے اہلِ صفا کے لیے تواضع امن
گلوں کے پہلو میں پہلو تہی کو خار کیا

۳۱

تری ادا کو نہ کس کس نے اختیار کیا
قضا نے مرگ کو وعدے پہ اُستوار کیا

درست ہے کہ تجھے دل کو کیوں دیا ظالم
دروغ ہے کہ ترا ہم نے اعتبار کیا

فلک نے خاک کیا، تو بھی تو نہ آگ بجھی
کہ ذرّہ ذرّہ مرا خرمنِ شرار کیا

نہیں یہ ذرّے، ہیں اجزاے دیدۂ اُمید
نہ ترک، خاک ہوئے پر بھی انتظار کیا

نہ کیوں کے ضد ہو فلک کو کہ متہم ہے سدا
قرار کس کو دیا تھا جو بے قرار کیا

یہ دل بھی وہ ہے کہ تو غش ہے دل ربائی پر
یہ صید وہ ہے کہ صیّاد کو شکار کیا

مجھے مٹائے گا تو یا اُسے بنائے گا
مدار کاھے پہ اے چرخِ کج مدار کیا

مرا رقیب مرا رشک ھی بنا آخر
اُس انجمن سے نکالا یہ بے قرار کیا

مصیبت آئی، قضا آئی، اور بلا آئی
ھر اک کو اُس کے نہ آنے نے بے قرار کیا

اس ابتدا سے ھے اُس کا اخیر میرا سا
خوشی کی جا ھے جو دشمن کو راز دار کیا

رقیب ھو کہ عدو ھو کہ ھو حریف خفا
وہ غم گسار نہیں جس کو غم گسار کیا

پھرے ھے چھپتی[1] ھوئی سامنے نہیں آتی
تری حیا نے حیا کو بھی شرمسار کیا

قلق سپہر سے بدلے خوشی کے مانگ پناہ
نزولِ برق سرِ خندۂ بہار کیا

۳۲

خود دیکھ خودی کو، او خود آرا
پہچان خدا کو بھی، خدا را

ترچھی یہ نگاہ ھے کہ آرا
ھر جزو جگر ھے پارہ پارا

دیکھیں گے بتوں کی ھم کجی کو
سیدھا ھے اگر خدا ھمارا

۱- مطبوعہ چھپتی، تصحیح چھپتی - (مرتب)

کیوں موت کے آسرے پہ جیتے
اے زیست ہمیں تو تو نے مارا

اللہ رے دل کی بے قراری
کھاتا ہی نہیں کہیں سہارا

جان دینی ہے میری آزمائش
دل داری ہے امتحاں تمھارا

طوفان ہے جوشِ تشنہ کامی
دریا بھی تو کر گیا کنارا

شیرینیِ جاں کی کب کھلی قدر
جب زہر ہوا ہمیں گوارا

ہر شاخ پہ آشیاں ہے لرزاں
اس باغ میں ہو چکا گزارا

گردش کا قلق کی دیکھنا اوج
ہر قطرۂ خوں بنا ستارا

۳۳

ہوں وہ نشاں سراغ نہیں جس کے نام کا
ممنوں نہ میں زباں کا، نہ شرمندہ گام کا

داغِ جگر صلہ ہے دلِ تشنہ کام کا
صدقہ ہے یاں چراغ شہیدوں کے نام کا

سر بازِ تیغِ تیز ہے شیوہ کلام کا
بسمل وہ حکم ہے کہ دیا قتلِ عام کا

کیا ہو پتا سراغ کو میرے مقام کا
پامرد نقشِ پا بھی نہیں واں قیام کا

محشر میں پوچھیے نہ سبب ازدحام کا
بہتان ہے یہ آپ ہی کے قتلِ عام کا
کوئی کہیں نہیں ہے دلِ تشنہ کام کا
میرٹھ میں بھی تو کوئی (کوفی) ہیں بے دادشام کا
واعظ یہ مے کدہ ہے نہ مسجد کہ اس جگہ
ذکرِ حلال پر بھی ہے فتوٰی حرام کا
غم خوار اور رقیب کی تمئیز کیوں کہ ہو
پختہ خیال ہے مرے سودائے خام کا
یا عام کی غرض ہے مرا خاص مدّعا
یا مدّعائے خاص ہے مطلب ہے عام کا
مشقِ ستم اگر نہیں آئینِ داد و دیں
کچھ بھی حصول قاعدۂ انتقام کا
رستہ بھی میرے ساتھ سے وحشت میں ہٹ گیا
منزل کو کیوں کے حوصلہ ہو پھر مقام کا
تھا جس قدم کو اٹھنے میں آزارِ دردِ سر
اب وہ[1] ہی رفتہ رفتہ ہے فتنہ خرام کا
کیا[2] اصلِ دل کہ سحرِ طلسم خیال ہے
کیا چیز جاں کہ شعبدہ ہے اتہام کا
فردائے ہجر دیکھیے کیا اتفاق ہو
روے سحر سے اڑنے لگا نور شام کا

۱- مطبوعہ 'وہی' ہے لیکن 'وہ ہی' درست ہے - (مرتب)
۲- مطبوعہ میں 'کہ' بے معنی ہے ؛ 'کیا' تصحیح قیاسی ہے -
(مرتب)

زخمِ زباں و گوش نہیں ہوں کسی طرح
میرا نگیں نگار نہیں نقش نام کا
جاں اپنی دے کے غیر کا سر کیا کرے کوئی
لطف انتقام میں بھی نہیں انتقام کا
لو چارہ گر کی موت عیادت کو آئی ہے
کیا جاں ستاں ہے درد ترے تلخ کام کا
اُلفت میں رحم ہو تو عدو سے یہ رشک ہو
ہر دردِ خاص کشتہ ہے آزارِ عام کا
کھوئی شگفتگیِ خوشی نے شبِ وصال
ہے جلوۂ فروغِ سحر، نور شام کا
کیوں کر نہ آشیاں پہ گرے برق، دیر سے
تھا چشم انتظار ہر اک حلقہ دام کا
کیوں کر نہ پردہ داریِ اُمید فرض ہو
تھا عشق کو خیال سدا ننگ و نام کا
مانا کہ ظلم و جبرِ زلیخا و عشق حیف
پر حسن میں بھی طور ہے سارا غلام کا
انگور اور عصارۂ انگور ایک شے
پر ظرف میں ہے فرق حلال و حرام کا
کعبے سے ہو کے آؤ کہ مے خانے سے چلو
ہر مرحلے میں فاصلہ ہے ایک گام کا
کیوں کہ قدم زمیں پہ رکھے اب وہ بے دریغ
پامال خود ہے اپنی ادائے خرام کا
ہر حلقے میں نگاہ ہے، ہر تار میں ہے جاں
صیاد صید آپ ہوا اپنے دام کا

تیغِ ادا کا تیری نہیں ہے اگر شہید
عیسیٰ کو کیوں خطاب 'علیہ السلام' کا
گردن پہ تیری تیغ کی یہ خون ہے کہ ہے
سنگِ فساں[1] پہ جلوہ گلِ لالہ فام کا
فرقِ پیالہ سے تہِ خم تک نگاہ ہے
اک ہوش پر مدام ہے غافل مدام کا
گویا کہ فاش ہے لبِ معشوق کی ہوس
ہر حرف تیر گوش ہے میرے پیام کا
ساقی کے اعتبار بڑھانے کو دیکھیے
باہر ہے اپنی طرف[2] سے ہر دور جام کا
جز جوشِ گریہ موجِ تبسم کبھی نہ آئے
لب بھی ہو گر نصیب ، ہمیں تیرے بام کا
ہو نغمۂ زبور کہ توریت کا ہو سحر
ہم کو قلق ہے ذوق تمھارے کلام کا

۳۴

لگتا پتا کہیں نہیں دامانِ یار کا
اللہ رے دبدبہ مری مشتِ غبار کا
کس طرح موت وعدے سے اپنے کہیں ٹلے
کیا اعتبار ہستیِ بے اعتبار کا

۱۔ 'فشان' مطبوعہ میں ہے ۔ (مرتب)
۲۔ 'طرف' بہ سکون حرف دوم ، سوم ۔ (مرتب)

ناچارگی سے آنکھ کو جب بند کر لیا
کنجِ قفس میں جلوہ ہے فصلِ بہار کا
جو کہتا ہے وہ کرتا ہے برعکس اس کے کام
ہم کو یقیں ہے وعدۂ نا استوار کا
محشر اگر ہے اور کوئی چیز تو غلط
اک نقشِ پا ہے فتنۂ رفتارِ یار کا
بے اختیار کیوں کہ نہ ہو اختیارِ عشق
بے اعتباریاں ہیں سبب اعتبار کا
لیں دھجیاں جنوں نے یہ بعدِ رفوے جیب
دینا پڑا حساب ہمیں تار تار کا
کیوں کر کوئی تعینِ محشر کا ہو مرید
اک وسوسہ ہے آہِ دلِ سوگوار کا
کیوں کر گلے سے اس کو لگا کر نہ روئیے
ماتم ہے روزِ وصل شبِ انتظار کا
انسان کی خودی نے کیا عشق کو پسند
اس جبر میں بھی لطف ہے سو اختیار کا
پیرِ مغاں کے سجدے سے کس طرح سر اٹھائے
محجوب ہے قلق کرمِ کردگار کا

۳۵

ہے خموشی انتظار بلا
اس ہے ایک چپ ، ہزار بلا
دیکھ لے اک نظر کہ ہے منظور
صد تباہی و صد ہزار بلا

دلبری پر ہے جاں فزا بے داد
دل دہی پر ہے جاں نثار بلا
ہجر میں آسماں مدارائی
وصل میں ہے ستیزہ کار بلا
کج کلاہی کا ہم نشیں فتنہ
خمِ گیسو کی دوست دار بلا
آ گئی سر پہ عاقبت آفت
ہو گئی چشمِ انتظار بلا
ہے فدا مجھ پہ آسماں گویا
وار وار آئی بار بار بلا
مجھ سا پامالِ روزگار ہے کون
خجل آفت ہے شرم سار بلا
داغ کا میرے دردکش صدمہ
درد کی میرے رازدار بلا
صحنِ گلشن کی شمع بزم ہے برق
نوجوانی کی ہے بہار بلا
اے قلق آسرے کا کیا جینا
زندگی ہے مآلِ کار بلا

۳۶

گلی سے اپنی ارادہ نہ کر اٹھانے کا
ترا قدم ہوں نہ فتنہ ہوں میں زمانے کا
حجابِ پردہ دری تیرے منہ چھپانے کا
بناؤ آئنہ کون و مکاں مٹانے کا

مجھی سے آکے کرے مشورہ کہ کیا کیجے
تجھی سے کام پڑے گر ترے بہانے کا

غبارِ دل جو ہر اک سو بلند ہے اپنا
تو سمت سمت سے مژدہ ہے تیرے آنے کا

پکڑ کے دل کو تڑپنا اور اس طرح پئے غیر
مرے ستانے سے پایا مزا ستانے کا

ابھی سپہر سے کیا کیا نزول ہونا ہے
کہ زخم دل میں ہے انداز مسکرانے کا

نہ مل تو مجھ سے مگر پھر ملے گا خود آخر
کہ شیوہ چرخ کا ہے آرزو مٹانے کا

نویدِ فصلِ بہاری جو اُڑتی سی پہنچے
تو پھر دکھائیں تماشہ قفس اُڑانے کا

ستم ہے پرسشِ محشر ستم رسیدوں پر
کہاں سے لائیں جگر حالِ دل سنانے کا

ادائے گرم سے مانا کہ طور کو پھونکا
مگر نہ آیا سلیقہ ہمیں جلانے کا

قیامت آتے ہی آدھر کو کیوں پلٹی
کیا تھا کس نے ارادہ قدم اُٹھانے کا

اب اپنے حال سے کیوں کر نہ چشم پوشی ہو
نگہ میں ذوق ہے تیرے نظر چرانے کا

اخیر تم کو ہی دینی پڑے گی دل میں جا
نہ قصد کیجے مرے خاک میں ملانے کا

بہار کیوں نہ خزاں ہو کہ یاد ہے عالم
وہ تیرا ناز سے دامن اُٹھا کے جانے کا

ملے گی خاک قیامت میں فرصتِ فریاد
لحد میں بھی نہیں مقدور لب ہلانے کا

کدھر قفس تھا کہاں ہم تھے کس طرف یہ قید
کچھ اتفاق ہے صیّاد آب و دانے کا

قلق خموش کہ رودادِ دل قیامت ہے
کہیں اخیر بھی ہے ظالم اس فسانے کا

۳۷

دریغ[1] غیر کے مرنے کا میں اگر ہوتا
تو تیرے گوشۂ دل ہی میں اپنا گھر ہوتا

نزولِ نالۂ دل تا بہ لب اگر ہوتا
فلک بھی ہاتھوں میں تھانبے[2] ہوئے جگر ہوتا

جہاں ہے موردِ آفات ، شکوے کا کیا کام
نہ ہوتا وہ تو کوئی اور فتنہ گر ہوتا

ہماری موت پہ کیا کیا حیات جاں دیتی
جو آبِ خنجرِ قاتل سے حلق تر ہوتا

حصولِ ہستیِ اُلفت ہے درد و داغ و الم
جو دل نہ ہاتھ سے جاتا تو کیوں جگر ہوتا

جو حالِ تشنگیِ مےکشاں ذرا کھلتا
تمام گوشۂ دامانِ رحم تر ہوتا

---

۱ - مفہوم ؟

۲ - تھامے -

نہ لگتی آنکھ تو سونے میں کیا برائی تھی
خبر کچھ آپ کی، ہوتی تو بے خبر ہوتا
کلیم و خضر نہ ظلمات و طور تک جاتے
تمھارے کوچے میں انساں کا گر گزر ہوتا
اگر نہ عشق میں آلام روز و شب ہوتے
نہ چین اہلِ محبت کو لمحہ بھر ہوتا
جو آستاں کا نہ تیرے خیال بندھ جاتا
تو اس جنوں میں نہ ہرگز دماغ سر ہوتا
دیارِ یار کا شاید سراغ لگ جاتا
جدا جو جادۂ مقصود سے سفر ہوتا
دعائے وصل، میں کیوں کر فراق میں کرتا
کہ شکلِ جیب ابھی دامنِ سحر ہوتا
قلق اگر نہ محبت قبول ہم کرتے
نہ یہ دماغ نہ یہ دل نہ یہ جگر ہوتا

۳۸

حرماں بھی تو ارماں کے برابر نہیں ہوتا
پاتے ہیں اگر آب[۱] تو خنجر نہیں ہوتا
وہ سنگ دل انگشت بدنداں نظر آوے
ایسا کوئی صدمہ مری جاں پر نہیں ہوتا
یادِ رخِ مہ پارہ ذرا چھپ نہیں سکتی
خالی خور و انجم سے کبھی گھر نہیں ہوتا

---

۱ - 'آپ' اصل متن میں 'آب' ؟ - (مرتب)

اٹھتا ہے نہ اٹھے گا کبھی بارِ محبت
جب تک کہ تہِ دوش مرا سر نہیں ہوتا
عمامۂ واعظ ہی ہے سرشارِ نجاست
وہ دامنِ رنداں ہے کہ جو تر نہیں ہوتا
ہے دادِ محبت جو وہ بیداد کیے جائے
ہے رحم کہ وہ رحم سے خوگر نہیں ہوتا
اس بزم میں نکلی نہ ٹھہرنے کی کوئی شکل
جلیے تو یہ جلنا ہے کہ تھم کر نہیں ہوتا
اللہ ہی کا اک نام ہے باقی فقط اب تو
بے رحم خدا کا بھی تجھے ڈر نہیں ہوتا
کیا شکلِ رہائی کہ وہاں دام ہے اپنا
پرواز سے آگاہ جہاں پر نہیں ہوتا
کیا خانہ خرابوں کا لگے تیرے ٹھکانا
اس شہر میں رہتے ہیں جہاں گھر نہیں ہوتا
ہے تیرِ ہم آغوشیِ اعدا کا تصور
پہلو سے دلِ خوں شدہ باہر نہیں ہوتا
کیا وصل کا ارماں کہ ہمیں یاد ہے صدمہ
کہتے ہیں جسے چین وہ دم بھر نہیں ہوتا
ہر داغِ جگر میں نہیں جلوا ترا کس وقت
گلزار میں کب حملۂ صرصر نہیں ہوتا
کس وقت نگاہوں میں نہیں تارِ زمانہ
کس لحظہ خیالِ رخِ انور نہیں ہوتا
دیکھا ہے قلق تم نے تو موزوں سا جواں تھا
افسوس کوئی ہجر پیے جاں بر نہیں ہوتا

۳۹

یہ صدمۂ ہجراں سے وصال اپنا قریں تھا
ہر 'سانس لبوں پر نفسِ باز پسیں تھا

ہے ہے دمِ آخر بھی تو مصروفِ کمیں تھا
سینے میں کبھی تھا کبھی آنکھوں کے قریں تھا

شوخی نے رکھا اُس کی ، تصور سے اُسے دور
نظروں میں ہماری جو وہ تھا بھی تو نہیں تھا

کیا اُس کے تغافل میں تلاش اپنی رہی ہے
پھرتی تھی کہیں جاں ، دلِ وارفتہ کہیں تھا

یا خاک نشینی کی ہے اُس در کی تمنا
یا یہ ہی دماغ اپنا سرِ عرشِ بریں تھا

ہر سنگ میں کعبے کے نہاں عشوۂ بت ہے
کیا بانیِ اسلام بھی غارتِ گرِ دیں تھا

جنبش دمِ رخصت ہوئی دشوار اُسے بھی
افسردگیِ دل سے مری وہ بھی حزیں تھا

سر پر مرے گھر کو ، مرے گریے نے اُٹھایا
ہر بام حباب اپنے خرابے کی زمیں تھا

مرتے تو موے پر کہیں گردن نہ جھکائی
کس کا اثرِ سجدۂ در نقشِ جبیں تھا

جلوے کا ترے حسن نظر سوز ہے پردہ
جو دور نظر سے تھا وہی دل کے قریں تھا

۱- کیا -

هر ذرۂ پامال میں ہے داغِ زر افشاں
اُس قصرِ گہر خیز کا جو شاہ نشیں تھا
ناکام مگر ہو گئے ہم صاف دلی سے
گویا کہ ہر اک راز خطِ زیرِ نگیں تھا
اس درجہ ہے اغیار کو اب رحم قلق پر
جس مرتبہ پرویز کو فرہاد سے کیں تھا

۴۰

سر جھکا یاں تک کہ جھکنا بھی پشیماں ہو گیا
بارِ عصیاں عاصیوں کا بارِ احساں ہو گیا
زلف تھی اُس کی کہ عکسِ تیرگیِ بخت تھا
وصل کی شب میں ظہورِ روزِ ہجراں ہو گیا
عبرت آلودہ نظر طرفِ چمن نرگس کو[1] ہے
واسطے دو دن کے یاں کس کس کو ساماں ہو گیا
سایۂ صندل بھی تھا جس کے لیے بارِ گراں
اب وہی سر ہے کہ وقفِ سنگِ طفلاں ہو گیا
جوشِ رحمت سے ہوئی تردامنی جب موج زن
اشکِ خجلت نے یہ سر کھینچا کہ طوفاں ہو گیا
جو کھلا کاکل کا بل طوقِ گلو میرا بنا
جو مری اُمید ٹوٹی تیرا پیماں ہو گیا
کب تلک پردہ دری دیکھا کرے اُس کی کوئی
عاقبت پیوندِ دل جزوِ گریباں ہو گیا

---

۱ - 'کو' اصلِ متن ؛ 'کی' ؟ - (مرتب)

کیوں رقیبوں کا کروں شکوہ کہ میں نے کیا کیا
دوست اُس کا بن کے اپنا دشمنِ جاں ہو گیا
واقعی دونوں طرف سے ہے بنائے اتحاد
تیر نذرِ دل ہے اور دل نذرِ پیکاں ہو گیا
رحم کر مستوں پہ کب تک طاق پر رکھے گا تو
ساغرِ مے ساقیا زاھد کا ایماں ھو گیا
دیکھیے عہدِ جوانی میں فسوں سازی تری
اے قلق طفلی میں تو پیرِ غزل خواں ہو گیا

۴۱

قدر دانِ دوست اب وہ شوخِ پُر فن ہو گیا
میں ھلاکِ شیوۂ اندازِ دشمن ھو گیا
جھک پڑے سو کارواں تصویرِ ارماں دیکھ کر
چاہِ یوسف بعدِ مردن اپنا مدفن ھو گیا
اب نہ وہ کھٹکا نہ وہ دھڑکا نہ وہ آلودگی
زخمِ دل آخر نچڑ کر پاک دامن ھو گیا
بت بھی کیا نا آشنا ھیں اور کتنے آشنا
دور ھو کر کعبے سے پاسِ برھمن ھو گیا
سہل سمجھے ھیں خیالِ قامتِ دلبر یہاں
اور وھاں پر ھر قدم محشر کا رہ زن ھو گیا
کر لیا جو کر لیا احوال اپنا کر لیا
ھوگیا سو ھو گیا ، ھو جائے بدظن ، ھوگیا
حیف وہ نوحہ کہ دل میں آتے ھی نغمہ ھوا
ھائے وہ نغمہ جو آکر لب پہ شیون ھو گیا

اُس کا خالِ لب شرارِ جامۂ هستی بنا
دانۂ قسمت همارا برقِ خرمن هو گیا

زخم دل تیزی سے آخر نوکِ مژگاں بن گیا
هر جگر کے پار جس کا صاف روزن هو گیا

خاک اُڑی اپنی که آخر دب گئے سب زور و شور
پائے مالی سے مری پامال[1] توسن هو گیا

روزنِ دیوار هے اور چشم دریا بار هے
تها نظر میں اپنی اک مدت سے روزن هو گیا

بخیه‌گر نوکِ مژه کس کس ادا سے هو گئی
میرا هر لختِ جگر اب چشم سوزن هو گیا

کیا محبت بهی بری شے هے که اُس بے دید[2] کو
جس قدر آیا یقیں ، اُتنا هی بدظن هو گیا

دوستی کب چرخ سے تهی مدّعی کیوں کر هوا
عشق نے جس کو بنایا دوست دشمن هوگیا

اے قلق کیا کیا جلے هیں جی ترے انداز پر
محفلِ گل فام میں تو برقِ گلشن هو گیا

۴۲

همارا رنگ پریده هے آسماں کیسا
وفا کا سایۂ رفتار هے جهاں کیسا

ستم ستم نهیں بازیچۂ محبت هے
وه دیکهتے هیں که هوتا هے نیم جاں کیسا

---

۱ - اصل متن 'ماپال' - (مرتب)
۲ - بے درد -

وہ دیکھتے ہیں کہ اہلِ نظارہ کتنے ہیں
کسے ہے پاسِ حیا اور نگاہباں کیسا
اٹھانے کو مرے اٹھا ہے حشر محفل میں
میں ہوتے ہوتے سبک ہو گیا گراں کیسا
چھڑا کے منہ کو نظر سے گرائے ہے کیا کیا
سنور سنور کے بگڑتا ہے راز داں کیسا
چمن میں شور بھرا میری ناتوانی کا
تہی ہوا ہے مرا مجھ سے آشیاں کیسا
چھپائے دیتا ہے سایہ نگاہ کا اپنی
کیا ہے کاہشِ ہر دم نے ناتواں کیسا
ہوئے ہیں نالہ و فریاد تک بھی غارت غور
لٹا ہے منزل الفت میں کارواں کیسا
قلق بھی وصل کے دھوکے میں آگیا ہے ہے
غضب کہ مارا گیا مفت نوجواں کیسا

۴۳

نہ رہا شکوۂ جفا نہ رہا
ہو کے دشمن بھی آشنا نہ رہا
بے وفا جان و مال بے صرفہ
کیا رہا جب کہ دل ربا نہ رہا
سبھی اغیار ہیں سبھی عاشق
اعتماد اس کا ایک جا نہ رہا
خاک تھا جس چمن کی رنگِ ارم
پتے پتے کا واں پتا نہ رہا

وصل میں کیا وصال مشکل تھا
یاد پر روز ھجر کا نہ رہا
خط مرا واں گیا گیا، نہ گیا
سر قاصد رہا رہا، نہ رہا
دل میں رہتا ہے کون غم کے سوا
کوئی اس گھر میں دوسرا نہ رہا
غیر اور شکوۂ جفا تم سے
ہائے میں قابلِ وفا نہ رہا
کیا ہوا کیوں قلق کو روتے ہو
کوئی اس دھر میں سدا نہ رہا

۴۴

اُتنا ھی واماندہ تھا جتنا کوئی چالاک تھا
جو نشیمن سے اُڑا وہ بستۂ فتراک تھا
آسماں اھلِ زمیں سے کیا کدورت ناک تھا
مدّعی بھی خاک تھی اور مدّعا بھی خاک تھا
شامِ فرقت یاس سے ارماں یہ گریہ ناک تھا
صبر بھی آیا تو بے صبری سے داماں چاک تھا
روز تم بنتے رہے اور روز ھم مٹتے رہے
عاقبت خوں ھی ھمارا زینتِ پوشاک تھا
ہائے وہ عالم کہ تھے آزاد ھر تکلیف سے
بے شعوریِ جنوں میں کیا بلا ادراک تھا
کیا سبک حرکت پہ اس کی طیش آتے ھیں مجھے
جو گیا نالہ فلک پر وہ ھی آتش ناک تھا

یاسِ ظاہر ہائے ہائے اُمیدِ باطن حیف حیف
رشتۂ بخیہ گری تھا جو جگر میں چاک تھا
کیوں نہ اُلفت رنج دے یاروں سے رسوا کردیا
کوہ کن گستاخ تھا ، مجنوں ذرا چالاک تھا
کفر اور اسلام میں دیکھا تو نازک فرق تھا
دیر میں جو پاک تھا کعبے میں وہ ناپاک تھا
ہو گئی اک بات میں اُس کی غلط اُمید و بیم
پردہ در کے آتے ہی محشر میں قصہ پاک تھا
کس قدر جاں کاہ ہے ضبطِ **قلق** کا سانحہ
ایک ہی دم سرد کھینچا ہے کہ جل کر خاک تھا

ردیف الباے تازی

۴۵

دردِ دل و جگر مرے رخ سے عیاں ہے اب
پروازِ رنگ ضعف سے شورِ فغاں ہے اب
ہے پھر جو التفات تو کیا امتحاں ہے اب
اس دشمنی کو دیکھیے پھر مہرباں ہے اب
رنگ آشنا نگاہ کے اُٹھتے ہی اُڑ گئے
بوے بہار گردِ پسِ کارواں ہے اب
آتا نہیں ہے کوئی بھی مدت سے زلزلہ
دیوانہ تیرا حیف بہت ناتواں ہے اب

ناحق کی چھیڑ کون رکھے برق و باد سے
گل ہی نہیں تو کس کو سرِ آشیاں ہے اب
اپنے ہی بارِ دوش ہیں سر کیا اٹھائیں گے
وہ ذوق و شوق اور وہ جوانی کہاں ہے اب
تسکیں وفائے وعدہ کی کیوں کر نہ ہو مجھے
فردائے حشر کہتے ہیں جس کو وہاں ہے اب
رنجِ عدو بدل نہ سکا رنجِ دوست سے
جو تھا نہاں نہاں سے ، عیاں سے عیاں ہے اب
جس کا ترانہ سینہ گدازِ بہشت تھا
اس بزم گہِ عیش کا ماتم نشاں ہے اب
وہ دن گئے کہ مرنے پہ مرتے تھے ہائے ہائے
ہر شیوۂ وفا ستم جاں ستاں ہے اب
مرتے ہی اپنے فتنوں نے کڑھ کڑھ کے جان دی
سنتے ہیں اس گلی کو کہ دارالاماں ہے اب
سایے سے میرے ضعف و نحافت کے ہے نفور
اس طبعِ نازنیں پہ نزاکت گراں ہے اب
اب تک قلق کا مجھ کو قلق ہے کہ ہائے ہائے
وہ اگلے لوگ اور وہ محبت کہاں ہے اب

۴۶

اس ماہ نے یہ راہ دکھائی تمام شب
بس خواب میں بھی نیند نہ آئی تمام شب
جاتی کہاں سے تیرگیِ بخت وصل میں
اس نے نقاب ہی نہ اٹھائی تمام شب

دیکھا جو صبح ماہ کو تھا زرد کیا کہیں
تھی بے حجاب جلوہ نمائی تمام شب

واں شغل اُن کا نغمہ نوازی تمام روز
یاں ورد اپنا نالہ سرائی تمام شب

ہے احتراق بخت کو میرے کہ خواب میں
دیکھا کیا ہوں دستِ حنائی تمام شب

برگشتہ روز کہتے ہو تم کیوں رقیب کو
شاید رہی ہے آج لڑائی تمام شب

پھر بدر کیوں ہلال ہوا، کی نہ ہو کہیں
اُس سنگِ در پہ ناصیہ سائی تمام شب

کیوں کر شبِ فراق کو اپنی کہوں سیاہ
نظروں میں تھی وہ جلوہ فزائی تمام شب

اب کس طرح نہ آنکھ لگے گی کہ ناصحا
تو نے کہانی اُس کو سنائی تمام شب

مے پی کے آج شام ہی سے وہ بگڑ گیا
اغیارِ بوالہوس کی بن آئی تمام شب

'مومن' کی طرح ہجر کا کھٹکا رہا قلق
وہ آئے تو بھی نیند نہ آئی تمام شب

۴۷

پی بھی اے مایۂ شباب شراب
گرم جوشی سے ہے کباب شراب

مریمی اُڑ گئی مسیحا کی
لبِ نازک پہ ہے شراب شراب

اُس سے ہم جا بھڑے عدو کے گھر
ہے بڑی خانماں خراب شراب

کیوں کہ مطلق حرام ہی کہیے
پیجیے گا ملا کے آب شراب

بہر ہر ظرفِ امتحان ساغر
ہر تمنا کا انتخاب شراب

بعد ازیں محتسب قسم لے لے
توبہ کرتا ہوں لا شتاب شراب

ضائع اوقات کو نہیں کرتے
پیتے ہیں وقتِ ماہتاب شراب

سخت ماتم ہے اے شباب ترا
کہ رلاتی ہے خونِ ناب شراب

محتسب اس کا خون ہے کس پر
جو ہے پیتا بجائے آب شراب

مصحف و خرقہ بیچتے ہیں ہم
ہو گئی جان کو عذاب شراب

اُس کی بخشش ہے بے حساب اگر
ہم بھی پیتے ہیں بے حساب شراب

ہر گھڑی ذکر مے ہے اے واعظ
ہو گئی تیری تو کتاب شراب

اے قلق مے کدے میں سجدے کیوں
کون دے گا پئے ثواب شراب

۴۸

تم سے کس کا نکل سکا مطلب
مفت میں اپنا ہو گیا مطلب
تنگ وحشت سے ہوں لکھا جب کچھ
کھلتے ہی خط کے اڑ گیا مطلب
اس قدر رشک وائے ناکامی
حرفِ مطلب سے ہے جدا مطلب
دوست دشمن سے کیوں نہ رکھا کام
نامرادوں کا کچھ تو تھا مطلب
دشت گردی کا طعن لیلیٰ پر
کیسے خود کام سے پڑا مطلب
دل تلک بھی شریکِ راز نہیں
آرزو سے چھپا رہا مطلب
بے غرض ہو کے بھی غرض نہ گئی
نامرادی سے ورنہ کیا مطلب
کہتے ہیں حرفِ آرزو جس کو
اس کا اب تک نہ کچھ کھلا مطلب
رشک سے میرے رشک تم کو کیوں
گویا اغیار ہی سے تھا مطلب
کیا چھپائیں گے کام ناکامی
بے خودوں کا ہے خود نما مطلب
تھا لفافے کو پیچ و تاب قلق
بے کھلے خط کا کھل گیا مطلب

ردیف الباے فارسی

۴۹

کیا خبر تھی نقدِ دل لیتے ہی کھو جائیں گے آپ
بے مروت مجھ سے میری طرح ہو جائیں گے آپ
نم بہ نم ، دجلہ بہ دجلہ ، خوب رلوا کر ہمیں
رسم و راہِ آشنائی کو ڈبو جائیں گے آپ
غیر کا خط وہ سمجھتے ہیں کہ لکھتے ہیں جواب
اس تغافل کا ٹھکانا ہے کبھو جائیں گے آپ
چشم پوشی اس قدر دیکھا کرے کب تک کوئی
ہم کہیں گے قصۂ دل اور سو جائیں گے آپ
یہ توقع ہے مبادا مرگِ دشمن روک لے
نعش پر میری بھی ، اُٹھتے وقت ہو جائیں گے آپ
اُس کے کوچے کو بھی دشت و کوہ سمجھے ہیں کہیں
حضرتِ خضر آئے نامہ لے کے تو[1] جائیں گے آپ
چشم تر آئے ہیں آخر وقت ، پر غیروں کے ساتھ
گردِ غم دل سے مرے گویا کہ دھو جائیں گے آپ
قاصدوں کو کیا پتا بتلائیں واں کا ہم نشیں
گر نہیں جاتا کوئی ، جانے بھی دو ، جائیں گے آپ
گر یہی ہے حسنِ روز افزوں ، دگرگوں ہے جہاں
حضرتِ ناصح مرے ہم درد ہو جائیں گے آپ

۱- اصل متن 'لو' (مرتب)

دیکھنا ایمائے وصل آ۔ ہی ذکرِ غیر کے
جاگتے بھی ہوں گے تو دانستہ سو جائیں گے آپ
اے قلق ہے آفریں جوشِ ندامت کو کہ ہم
دفتر اعمال کو اپنے ڈبو جائیں گے آپ

۵۰

جلتا ہوں اپنی آگ میں مثلِ چنار آپ
لپٹے ہے اڑ کے شعلے کو میری بہار آپ
پھر میرے جوشِ گریہ کے سیلاب دیکھیے
پہلے نکال لیجیے جی کے بخار آپ
جب ہووے مجھ کو گردشِ ایام کا یقیں
کھینچیں اسی طرح سے مرا انتظار آپ
میں رنجِ مدعی میں رہوں رات دن کہ تم
میں جاں نثار ہوں کہ مرے جاں نثار آپ
وعدے پہ بھی وہ آئے تو محشر کے بعد آئے
بڑھتا ہے مثلِ عمرِ فراق انتظار آپ

ردیف التاء فوقانی

۵۱

بے نشانی ہو تو ہو شاید نشانِ کوئے دوست
نقشِ پا رکھتے نہیں ہیں ، رہروانِ کوئے دوست
رشک آئے گا جہاں اے نامہ بر رکنا وہاں
تجھ کو میں بتلائے دیتا ہوں نشانِ کوئے دوست

جا بہ جا چاہِ زمیں دوز اہل گریہ نے کیے
رہتے ہیں ہم دردِ یوسف ساکنانِ کوے دوست
خواب گاہِ غیر ہے معلوم اے افسانہ گو
نیند آئے سن کے کیوں کر داستانِ کوے دوست
قافلہ بچھڑا ہے اپنا دیکھیے کیوں کر ملے
ہیں پرے ملکِ عدم سے رہ روانِ کوے دوست
مرنے پر مرتے ہیں لیکن موت قسمت میں کہاں
جاں فزائی سے ہیں عاجز جاں فشانِ کوے دوست
ہر گھڑی آ آ اٹھاتے ہیں مجھے منکر نکیر
گور میں بھی ہوں میں گویا میہمانِ کوے دوست
مصر کا بازار اس کے عہد میں آوارہ ہے
سیکڑوں یوسف لیے ہیں کاروانِ کوے دوست
تیر باراں ہے کس و مظلوم کا خوں رات دن
ہے زمینِ کربلا اب آسمانِ کوے دوست
شمع کی رفتار سے معلوم ہوتا ہے ہمیں
دشمنِ گام و قدم ہیں راز دانِ کوے دوست
دزد و دولت ایک جا دنیا میں گر رہتے بہم
تو قلق تجھ کو بناتے پاسبانِ کوے دوست

۵۲

کوچۂ غیر میں گزاری رات
ہوئی روزِ جزا ہماری رات
دن کو سوئے وہ جا کے غیر کے پاس
کر گئی کام آہ و زاری رات

زندگی اب تو خارِ بستر ہے
کہ تڑپتا ہوں ساری ساری رات

شام سے بندھتا ہے خیالِ مژہ
سولی پر کٹتی ہے ہماری رات

کاہشِ جان نے کی یہ جاں کاہی
غم نے کی میری غم گساری رات

عیش کے واسطے تمہارا دن
سوگ کے واسطے ہماری رات

زندگی کے ہزار ساماں ہیں
رہی کیا کیا اُمیدواری رات

کیا جیئے گا وہ ناتواں شبِ ہجر
جس پہ ہو وصل کی بھی بھاری رات

بزمِ دشمن میں صاف جا بیٹھے
تھیَ ہمیں کیا ہی بے قراری رات

ہر ادا پر وہ آن آن بنی
وصل کیا موت تھی ہماری رات

اب **قلق** میں رہا ہے کچھ باقی
صبح پھر کیا اگر گزاری رات

۵۳

کہیے کیا اور فیصلے کی بات
وصل ہے اک معاملے کی بات

اُس کے کوچے میں لاکھ سرگرداں
ایک یوسف کے قافلے کی بات

گیسوئے حور اور زاہد بس
ذکرِ کاکل ہے سلسلے کی بات

غیر سے ہم کو رشک ، صلِ علیٰ
کہیے کچھ اپنے حوصلے کی بات

ایک عالم کو کر دیا پامال
یہ بھی ہے کوئی مشغلے کی بات

کیا بگڑنا انہیں نہیں آتا
صلح بھی ہے مجادلے کی بات

دیکھ کیا کہتے ہین خدا سے ہم
اک ذرا ہے مقابلے کی بات

اس قدر اور قریبِ خاطر تو
عقل سے ہے یہ فاصلے کی بات

داورِ حشر سے بھی حال کہا
نہیں رکتی کہیں گلے کی بات

نہ چلے پاؤں اور نہ سر ہی چلے
بے سر و پا ہے آبلے کی بات

کوئی مضموں کبھی نہ پیش آیا
شعر میں کی ہے پھر صلے کی بات

ہم نشیں عرش ہل گیا شبِ ہجر
پوچھ مت جی کے زلزلے کی بات

اے قلق دل کو سوچ کر دینا
کچھ نہیں ٹھیک ولولے کی بات

۵۴

تو جائے تو اس شکل سے آ جائے قیامت
پھر منہ کسی صورت سے نہ دکھلائے قیامت
تو آئے تو خود رفتہ یہ ہو جائے قیامت
خورشید قیامت ہو تہ پائے قیامت
کیا اس کے کبھو وعدۂ فردا کا ٹھکانا
امروز ہے جس کے پس فردائے قیامت
یہ شور محبت دل شوریدہ میں تھا کچھ
ہر زخم کے دامن میں ہے صحرائے قیامت
جب داور محشر ہی نہیں زخم چشیدہ
کیا اہل شہادت کو تمنائے قیامت
کیا حشر اٹھائیں گے ترے اہل کدورت
اک نالے میں دب جاتا ہے غوغائے قیامت
اللہ رے پامالی الفت کی بلندی
رکھا ہے مری داد کو بالائے قیامت
کیوں کر نہ مجھے صور سرافیل سلاوے
افسانے سے اس کے ہی ہے غوغائے قیامت
لو آج ہی سے ہے دل ناشاد کا نشتر
وہ وعدہ کہ مجروح ہے فردائے قیامت
جو گام کہ اغیار کی جانب کو اٹھا ہے
اے کاش ترے سامنے ہی لائے قیامت
محشر بھی قلق اپنا ہی ہے قصۂ آخر
عاصی کے سوا کون ہے رسوائے قیامت

ردیف التاے هندی

۵۵

خط زمیں پر نہ اے فسون گر کاٹ
دردِ سر کاٹنا ہے تو سر کاٹ
گر لکھوں اس کو نامۂ الفت
حرفِ مطلب کو دے مقدّر کاٹ
قتل سے میرے گر پھرے قاتل
دانت سے لوں زبانِ خنجر کاٹ
گر ہے بیداد ہی پسند تجھے
گردنِ غیر اے ستم گر کاٹ
غمِ برق و تگرگ کو نہ خرید
کشتِ امید کو سراسر کاٹ
وقت دے زیرِ خار زار گزار
موسمِ گل تہ گلِ تر کاٹ
پلے مردی سے دست برد نہ چھوڑ
جیبِ شاہ و گدا برابر کاٹ
قوتِ ہضم ہے بہ قدرِ ظرف
کیا کرے موجِ آبِ گوہر کاٹ
صبر و تسلیم ہی کے اندر رہ
عمر رنج و خوشی سے باہر کاٹ
تیغِ برّانِ وقت سے ہر دم
رشتۂ آرزو کو یک سر کاٹ

مطلع ثانی

مت بنا گھر چمن کے اندر کاٹ
مت لگا دل گل و صنوبر کاٹ
آشیاں کے لیے چمن کا سے (کذا)
مرغِ حرص و ھوا کا ھر پر کاٹ
قدرِ آرام کچھ تو کر معلوم
روز دشوار، رات دوبھر کاٹ
شرط کچھ تیغ باندھنا ھی نہیں
زیست کو آئے جو میسّر کاٹ
اے قلق رنج ھو کہ ھو آرام
کاٹ جیسے کٹے سبک تر کاٹ

ردیف الثاے مثلثه

٥٦

ھر وقت لب پہ آپ کا اب نام ھے عبث
وہ دن گئے کہ بوسہ بہ پیغام ھے عبث
دل دے کے دل کا لینا ھی اب نام ھے عبث
پختہ ھوا جنوں، ھوسِ خام ھے عبث
ضد سے مری عدو کا خیال آ پڑا تمھیں
ملزم ھوں میں ھی آپ کو الزام ھے عبث
نے کشتۂ فراق نہ لبریزِ اشتیاق
بہرِ وصال غیر کا ابرام ھے عبث

دل دینے سے غرض بھی کچھ اے قاسمِ ازل
ہر آرزو عبث ہے کہ انجام ہے عبث
تقدیر کیا کہ سب ہی پھرے پر نہ دن پھرے
اے روزگار! گردشِ ایام ہے عبث
انجام کچھ نہیں مرے آغاز کا مگر
کس کام کی یہ زیست کہ ہر کام ہے عبث
آغازِ بازگشت ہے انجام سعی یاں
اے صبح تجھ کو آرزوے شام ہے عبث
جب دل نہیں دماغ سوے دل ربا کہاں
مطلب نہیں تو پرسش پیغام ہے عبث
قدرِ حریف تک ہے حریفانہ چھیڑ چھاڑ
جم ہی نہیں تو آرزوے جام ہے عبث
یہ آب و دانہ کنجِ قفس ہی میں لائے گا
صیاد کیوں فریفتۂ دام ہے عبث
جب دل کو دے دیا تو چھٹے ہر تلاش سے
امیدوار آپ کا ناکام ہے عبث
شیریں ادا ہوئی ہے غضب تلخیِ امید
دل جوئیوں میں لذتِ دشنام ہے عبث
آزادگی الجھنے سے رہتی ہے دورِ گرد
جوشِ جنوں کو فکرِ در و بام ہے عبث
تجھ کو قلق مٹایا زمانے نے ہر طرح
کچھ ننگ ہو تو جستجوے نام ہے عبث

۵۷

الفت میں اور کرتے ہیں بیداد ، الغیاث
بیداد ہی ہے داد تو فریاد، الغیاث

پھر سرد سرد خنکیِ خاطر ہے ، الاماں
پھر شاد شاد ہے دلِ ناشاد ، الغیاث

جیبِ وفا میں ہاتھ یہیں سے نہ ڈال لیں
کیا حشر میں کریں گے نہیں یاد ، الغیاث

جان دادہ کا خطاب ہے 'خود میر'[۱] الحذر
اور نام دل ستاں بت بیداد ، الغیاث

لائی لگا کے آنکھ[۲] تو ماری نگاہِ تیز
تیرے ستم سے اے ستم ایجاد ، الغیاث

مجھ سے وفا کے لب پہ شرر بار الحفیظ
تجھ سے جفا کی جان پہ جلاد الغیاث

ہم پر نہیں تو دام و قفس ہی پہ رحم کر
اب تو چمن میں ہے صیاد الغیاث

کون و مکاں ہلیں تو بنا کیا ثبات کی
کیسی پڑی ہے عشق کی افتاد ، الغیاث

کرنے لگے وہ یہ دلِ ناشاد پر ستم
ہلنے لگی ہے عرش کی بنیاد ، الغیاث

چھٹتے ہیں اور پکڑتے ہیں دامانِ دام کو
کرتے ہیں اور ہوتے ہیں آزاد ، الغیاث

۱- اصل متن (ص۵۲) 'میر الحذر' (مرتب)
۲- اصل متن (ص ۵۲) آنکھ' (مرتب)

دل کی طرح سے لٹتا ہے کوئی بھی بے پناہ
ہوتا ہے اس طرح کوئی برباد ، الغیاث

کہتے ہیں وہ کہ غیر رہیں گے ارم میں بھی
کیوں کر کرے نہ حسرتِ شداد ، الغیاث

دیکھا ہے تجھ کو اور مری حالت کو کیا کہیں
کرتے ہیں مل کے قمری و شمشاد الغیاث

یہ گرم خوں مری رگِ جاں سے ہے جوش زن
نوکِ زبانِ نیش ہے فصّاد الغیاث

اللہ رے بیانؔ کہ تھے کیا اثر کے لوگ
کیوں کر کرے نہ طرزِ قلق یاد ، الغیاث

ردیف الجیم تازی

۵۸

قولِ افلاطوں غلط ، بالضد اگر ہوتا علاج
رنجشِ بے جا کا ہوتا شکوۂ ہر جا علاج

کس طرح سودا نہ بڑھ جائے گا فرطِ فکر سے
عقل میں آتا نہیں اے چارہ گر تیرا علاج

کچھ تو مایوسی کے بھی ساماں کو مہلت چاہیے
گو کہ رنج افزا ہے پر مجھ کو پسند آیا علاج

تھا برا خوں مجھ گراں جاں کا تری گردن پہ یار
خوں رہا سر پر طبیبوں کے کیا اچھا علاج

اب اطبا کیا جئیں جاتی رہی وجہِ معاش
بچ گیا بیمارِ غم اور ہو گیا رسوا علاج
میں بھی تو دیکھوں اطبا کی ذرا تشخیص کو
کون سودائی کرے گا جوشِ سودا کا علاج
مر گیا بیمارِ اُلفت رنجِ درماں سے دریغ
فرض تھا درماں اگر تو لا علاجی تھا علاج
عشق میں گر زندگی چاہے تو چاہے موت کو
جو کہ ہو جویائے صحت اُس کا ہے مرنا علاج
بے خبر جو دردِ جان و دل سے ہیں بہرِ حیات
کرتے ہیں تدبیر کیسی کیسی اور کیا کیا علاج
کتنا ہے بے حس کہ قدرِ دردِ اُلفت کچھ نہیں
کیسا چارہ گر کو سودا ہوگیا کیسا علاج
ایک جینے کے لیے صد نازِ چارہ گر سہوں
ناسزا ہے زندگی اور سخت نازیبا علاج
اور گر جاتے ہیں حرفِ قم کو سن کر ضعف سے
ناتوانوں کا ترے کیوں کر کرے عیسیٰ علاج
زندگی جب تک ہے جب تک ساتھ آزار ہے
عیسیِ مریم سے کہہ دو کیجیے اپنا علاج
درد ہی ہے یہ جو بستر سے اُٹھا بٹھلائے ہے
پھر تو پیوندِ زمیں ہوں گر ہوا میرا علاج
اے قلق فنِ طبابت سے ہوں کیا کچھ منقبض
بو علی کے کاش میں اسہال کا کرتا علاج

۵۹

انبساطِ خوشی تمہارا رنج
دل ربایانہ ، روح افزا رنج

وصل کی بد شرابیاں ہیں یاد
بے مے و جام ، بادہ پیما رنج

سب کا جی توڑتا ہے تھک جانا
دل جو بیٹھا تو پھر نہ اٹھا رنج

تنگ ورزیِ حادثات نہ پوچھ
غم زدا غم ہے ، رنج فرسا رنج

فرقتِ غیر کا نہیں صدمہ
میری صورت پہ کیوں کہ چھایا رنج

داغ کا تیرے درد ہے مرہم
درد کا تیرے چارہ فرما رنج

غیر کے گھر ہوا وصال نصیب
کیا اٹھانا پڑا ہے بے جا رنج

ہم نہ ہوتے تو تو ہی کیوں ہوتا
تو نہ ہوتا تو کچھ نہ ہوتا رنج

دل لگانے میں کیا مزہ ہے اب
کر دیا بوالہوس نے رسوا رنج

پردۂ وصل اٹھ گیا ہے ہے
کیا ہی سہتے ہیں بے محابا رنج

وصل ہوتا تو ہم دکھا دیتے
تھا مقدر میں کیوں کہ لکھا رنج

۵۹

نہ کیا قاسمِ ازل نے لطف
گر دیا تھا مجھی کو دیتا[1] رنج

کیا وہی در تھا ٹھوکروں کے لیے
گر کے ہم نے اٹھائے کیا کیا رنج

ہے کشی کا تمھاری ہمدم غیر
ہے کسی کا مری سہارا رنج

اے قلق اس کے ساتھ ساری خلق
ور شریک اپنے ایک تنہا رنج

ردیف الجیم فارسی

٦٠

دستِ نازک سے تو تلوار نہ کھینچ
میرے آزار سے آزار نہ کھینچ

سینے سے تیر کو زنہار نہ کھینچ
رحم کر ، لذتِ آزار نہ کھینچ

کھینچ بیٹھے نہ وہ تجھ سے بھی ہاتھ
انفعال اے ستمِ یار نہ کھینچ

اپنی الفت کو چھپا رہنے دے
نعش میری سرِ بازار نہ کھینچ

پاؤں پڑتی ہے قیامت ہر گام
سر کو اے فتنۂ رفتار نہ کھینچ

---

۱ - اصل متن ''دنیا'' (مرتب)

مدعی تیری نزاکت کے ہیں ہم
حلق پر خنجرِ خوں خوار نہ کھینچ

اس قدر بھی نہ سبک حرکت ہو
غیر کا رنجِ گراں بار نہ کھینچ

میرا ہر لختِ جگر اے مژگاں
مثلِ منصور سرِ دار نہ کھینچ

سر کی ہے قدر تو ہر بار سے بچ
منت سایۂ دیوار نہ کھینچ

جیب سے اس کی تو اے گل نہ لپٹ
میرے دامن کو تو اے خار نہ کھینچ

حیلۂ مرگ سے بے قدر ہے مرگ
تہمتِ قتل ستم گار نہ کھینچ

وہ تو وہ ، موت بھی یوں کب آئے
انتظار اے دلِ بیمار نہ کھینچ

صدمہ دیتی ہے جدائی سب کی
زخم سے ناوکِ خوں بار نہ کھینچ

چھوڑ دے شوقِ عنانِ ناقہ
حسرتیں اے دلِ افگار نہ کھینچ

ہے ہمیں ضبطِ **قلق** کا ماتم
آہ بھی اے دلِ ناچار نہ کھینچ

ردیف الحاے مہملہ

۶۱

بے کس کا کون ہے کہ اجل نے بھی دی طرح
آئے گا چین مجھ کو بھی یا رب کسی طرح
دل کو لگا کے داؤ میں اس بت کے آ گئے
دم سازیوں سے روز نئی طرح کی طرح
برہم مزاج کیوں کہ نہ ہو تو کہ خود بہ خود
کیا فرشِ خواب چیں بہ جبیں ہے بری طرح
بے مثل شوخیوں میں ہے تو کیا کہ دیکھ لے
قابو سے اپنا دل بھی ہے باہر تری طرح
شامِ فراق موت ہے، صبحِ وصال حشر
دل دے کے زندگی تو ہے مشکل سبھی طرح
کیوں اس گلی میں حشر بلاتے ہو جانے دو
پردے کا ہے خیال تو ملیے کسی طرح
اب چاہتے ہو چاہنے والوں کو مجھ بغیر
پہلے یہ دل فریب تمھاری نہ تھی طرح
اس میں کہاں کی بوے محبت سما گئی
کاکل کا حال بھی ہے پریشاں مری طرح
کیا وارداتِ تازہ ہے اے جانِ عشوہ گر
دل کی نئی ادا ہے، جگر کی نئی طرح
ہنگام جاں کنی بھی ہے وہ ہی بتوں کا دھیان
بے طرح ہے مآل جو یہ ہی رہی طرح

گیا ایک عذر غیر کے ملنے کا فاش ہے
ثابت ہے خون آپ پہ اپنا کئی طرح
مضمونِ وصل کا نہیں معلوم رنگ ڈھنگ
کچھ مدّعا کھلے جو کرے مدّعی طرح
دل دے کے کیوں کے جان کو اپنی کوئی بچائے
اعجوبگی سے آپ کی ہے اجنبی طرح
ہے روزِ حشر فیصلہ اک ہی جواب میں
سب عاشقوں کی آپ کے ہے ایک سی طرح
اُردو میں اے قلق تو نہ کر ضائع میرا وقت
ہے امتحانِ طبع تو لا فارسی طرح

ردیف الخاے معجمہ

٦٢

نہ کس طرح سے ہوں دربان و پاسباں گستاخ
جنابِ حسن کا ہے ہر مزاج داں گستاخ
بیاں گرفتہ دم و شوخیِ زباں گستاخ
کہ رازِ دل ادب آموز و راز داں گستاخ
مباد دامنِ قاتل کو خوں مرا لپٹے
کہ شوق و ذوق میں ہوں وقتِ امتحاں گستاخ
عجب نہیں جو غضب سے کرے وہ قتلِ عام
کہ رحم حیلہ طلب اور نشاطِ جاں گستاخ

ضرور ہے کہ تکلف نہیں محبت میں
کہ میرے قتل میں ہے طرزِ تیغ راں گستاخ
الٰہی خیر کہ آئے قضا کہیں اُس کی
پیام بر ہے ہمارا رواں دواں گستاخ
ہجومِ شوق کی بے باکیوں کے یہ انبوہ
کہ شہرِ دل میں ہے ہر ایک کارواں گستاخ
ہوا یہ مشورۂ خامشی سے جوشِ دروں
کہ منعِ ذکر سے ہے شوقِ داستاں گستاخ
ہوا ہے قیس تو مجنوں ، یہ کیا جنوں ہے تجھے
نہ تھام ناقۂ لیلٰی کی تو عناں گستاخ
نہ ضبطِ وضع چھڑا اے غمِ دورں بے باک
نہ فاش راز کر اے کاوشِ نہاں گستاخ
الٰہی ایسے بھی چالاک تیرے بندے ہیں
ادا شریر ، بیاں شوخ اور زباں گستاخ
میں اُس کی بزم میں قابو سے اپنے باہر ہوں
کہ عرضِ عجز ہے منظور اور بیاں گستاخ
فلک نے نالے سے چالاکیاں مری سیکھیں
کہ کرتی پیر کو ہے صحبتِ جواں گستاخ
اگر قبول دعا ہو گئی تو کیا ہوگا
ابھی سے سجدے ہیں سو پیشِ آستاں گستاخ
قلق ملا ہے **نظیری** کو کیا صلہ کہ تجھے
سوال ِزشت ، غنی سنگ دل ، زباں گستاخ

ردیف الدال مہملہ

٦٣

دیکھ کر حسرتِ شدّاد کی داد
مل گئی ہم کو بھی بیداد کی داد

آشنا کون ہے مایوسوں کا
کچھ نہیں ، کچھ دلِ ناشاد کی داد

کیا لیا اُس نے پکڑ کر ہم کو
ہائے رے کوششِ صیّاد کی داد

تلخیِ مرگ ہے جاں کا انجام
دشت ہے خانۂ آباد کی داد

رغبتِ نیک نہ بد سے نفرت
سب سے آزاد ہے آزاد کی داد

سہو کے واسطے ہے یاد مری
عین نسیاں ہے مری یاد کی داد

یاں مٹا دیتے ہیں خطِ تقدیر
خاک دے گا کوئی بہزاد کی داد

لطمہ ہے موجِ صفا کی تعزیر
عقدہ ہے طرۂ شمشاد کی داد

داغ تھا زخمِ وفا کا مرہم
درد تھا خاطرِ ناشاد کی داد

نامرادی تھی مرادِ انصاف
خودکشی تھی ستم ایجاد کی داد

درد ہے سینۂ بلبل کی دوا
خار ہے حسنِ چمن زاد کی داد
اے قلق وہب ہے تجھ کو گویا
کیا تری طرزِ خدا داد کی داد

٦۴

ہے ابتدائے عشق مگر انتہا کے بعد
کہتے ہیں پھر جلائیں گے تجھ کو فنا کے بعد
آخر مآلِ حال تو اپنا میں سن رکھوں
کیا کیجیے گا عشوہ و ناز و ادا کے بعد
ہے ماجرائے نادر و طرفہ خیالِ وصل
شایاں جفا سے پہلے نہ ممکن وفا کے بعد
باہر حدِ کلام سے احوالِ عاشقاں
آغازِ قصہ ہوتا ہے صوت و صدا کے بعد
نان و نمک کا لطف ہے اول تلاش سے
اور فاقے کا مزہ ہے نوید و صلا کے بعد
کیوں کر نہ آستیں میں چھپا کر پڑھیں نماز
حق تو ہے یہ عزیز ہیں بت ہی خدا کے بعد
سودا فروشِ زلف کا اللہ رے مرتبہ
ہرگز کسی طرح نہیں مجرم خطا کے بعد
جینے کی آرزو نہ گئی بعدِ مرگ بھی
مرنے کی تجھ پہ رہ گئی حسرت فنا کے بعد
کیا کیا تڑپ کے شبِ وصل کی سحر
باقی اک آرزو رہی ہر مدعا کے بعد

اک تیری یاد نے مجھے سب کچھ بھلا دیا
تشویشِ مدعا ہے دعا کے بعد

ہونٹوں کو تیرے چوس کے خونِ جگر پیا
باقی تلاشِ زہر ہے آبِ بقا کے بعد

یا رب مجھے نصیب ہو دربارِ یثربی
تا عرض کچھ کروں میں دعا و ثنا کے بعد

٦۵

رمزِ ہستی دہنِ ہوش ربا کا ایجاد
لن ترانی سے کیا جس کی صدا کا ایجاد

صبرِ ایوب بہ جا گریۂ یعقوب درست
سخت کافر تھا کیا جس نے وفا کا ایجاد

لاآبالیِ محبت کا ستم تو دیکھو
خونِ عاشق سے کیا رنگ حنا کا ایجاد

عشق میں دل ھی سہی جور و جفا کا موجد
حسن میں کس نے کیا ناز و ادا کا ایجاد

اہلِ اُلفت کی تمنا بھی تماشا ھے کوئی
رحم کے واسطے کرتے ھیں خطا کا ایجاد

کیوں غضب یار کا میں جانِ عدو پر توڑوں
اے وفا تو ھی تو کرتی ھے جفا کا ایجاد

اے قلق کوئی نہ منکر ھو کسی شکل سے پھر
گر خودی ھاے بتاں سے ھو خدا کا ایجاد

ردیف الذال معجمه

٦٦

تلخیِ زندگی سے مجھے کس قدر لذیذ
کس درجہ میرے دل کو ہے خونِ جگر لذیذ

مے خوار ہی ہیں تارکِ لذات واعظا
للہ غور کر کہ مئے تلخ تر لذیذ

کیوں کر نہ سر کٹائیں شہادت کے واسطے
ہے آبِ تیغ اُس کا ہمیں سر بہ سر لذیذ

بے زار و بے مزہ نہ ہو دینے میں کس طرح
دشنام تلخ کھاتے ہیں ہم جان کر لذیذ

اے بے وفا ملاپ میں ہے لطفِ زندگی
ملتے ہی دیکھ ہوتے ہیں شیر و شکر لذیذ

کچھ لے اُڑی ہے اُس کی 'شکر خواب' کا مزہ
ہوتی کہاں سے ورنہ ہوائے سحر لذیذ

اے کاش ہجر کا ہو مزہ غیر کو پسند
ہے ذکرِ تلخ میرا لبِ نوش پر لذیذ

کھلتا ہے ماجرا تری میٹھی نگاہ سے
کیوں کر نہیں ہے آبِ دم نیشتر لذیذ

اتنی وصالِ غیر سے شیریں ادا ہے تلخ
جتنا کہ تلخ کام کو زہرِ نظر لذیذ

شیرینیِ وصال سے، لب بند ہو گئے
تلخیِ مرگ ایسی ہے اے چارہ گر لذیذ

ناکامیوں سے رهتا هے ناکام، کام یاب
رکھتا هے حسرتوں کو دلِ بے خبر لذیذ

اے ناشکیب تو نے سنا کیوں پیام تلخ
فرهاد تها فسانۂ شیریں اگر لذیذ

لذت نہیں هے قسمتِ جوهر میں هائے هائے
هوتا کسی طرح نہیں آبِ گہر لذیذ

دقت میں وہ بشر هے کہ جس کا کلام خوش
آفت میں وہ شجر هے کہ جس کا ثمر لذیذ

هر طور زندگی کا قلق کچھ مزہ نہیں
هر طرح چارہ زهر هے، دردِ جگر لذیذ

ردیف الرائے مہملہ

٦٧

سر سنگ پر هے[1] قدم خار خار پر
اک ناتواں تمہارا هے بھاری هزار پر

پڑتی هے آنکھ اس کی مرے حالِ زار پر
لو میں بھی چڑھ گیا نظرِ روزگار پر

۱- اصل متن (صفحہ ٦۰) میں ''هے تو قدم خار خار پر'' هے۔ 'تو' زائد اور غلط هے؛ مصرع ساقط الوزن تھا، اس لیے تصحیح قیاسی کی گئی۔ (مرتب)

جی سے اتر گئی ہیں فلک کی بلندیاں
جب سے نظر ہے اس کی ہمارے غبار پر
کیا مجھ سے ننگِ خلق کی ملت سے فائدہ
ہو کیوں نہ دشمنی کا گماں رازدار پر
کیا کیا ہوئے ہیں عشق میں پامال ہائے ہائے
اب جادۂ جنوں ہے گریباں کے تار پر
میری سنے کہ اُن کی کہے یا کہ اپنا حال
کیا کیا عذاب ہیں دلِ ناکردہ کار پر
کیوں کر چھپاؤں حال تکلف سے حیف حیف
کس طرح کھول دوں غمِ دل راز دار پر
بھڑکا رہے ہو رشک سے کیوں سوزِ استخواں
ٹھنڈا کرو چراغ ہمارے مزار پر
دل خوں ہوا تو کرتا ہے وہ اور دل دہی
اب اور قہر توڑتا ہے جانِ زار پر
جیتے رہے ہیں مردنِ دشوار کے لیے
مرتے رہے ہیں عمر بھر اندازِ یار پر
وہ شرمگیں نگاہ قیامت ہے نشے میں
وہ نیم باز آنکھ غضب ہے خمار پر
کیا جانیے کہ کون سی حسرت کا خوں ہوا
ماتم برس رہا ہے ترے سوگوار پر
کیوں جاؤں اس گلی میں کہ دشمن کے گھر وہ آئے
مجھ کو نظر ہے تفرقۂ روزگار پر
کیوں کر وہ آئے یار ہے دشمن تو کچھ نہیں
سامانِ زندگی ہے مرا انتظار پر

اُٹھتے ہیں پاؤں اپنے ہی پامال کے لیے
چلتے ہیں ہاتھ اپنے ہی جیب و کنار پر
واماندگی کہاں تک اب اے کاروانِ شوق
پڑتی ہے آبلوں کی نظر خار خار پر
لو شب کو ہائے چرخ سے وہ بدگماں ہوئے
آئی بلا ستم زدۂ روزگار پر
ہے بال بال خاطرِ صیّاد پر فدا
منقار تیر زن ہے جو خنجر گزار پر
جوں اشک آب و دانہ ہمارا ہے اپنے ساتھ
اے ہم صفیر کس کو بھروسا بہار پر
تم نیم شب نہ آتے نہ اُٹھتا کوئی ولے
کیا اختیار نالۂ بے اختیار پر
وہ حال میرا دیکھ کے کچھ سر فرو ہوئے
کیا جانے کیا بنے نگہِ شرمسار پر
کیسی بڑی ہے رنجشِ دشمن، نہ پوچھیے
ہے اب گمانِ غیر تنِ سوگوار پر
بے چین سن کے ہوتے ہیں احباب اے قلق
ہوتا ہے تیرا شعر بھی تیرے شعار پر

٦٨

ناتوانی مجھے لپٹی ہے توانا ہو کر
لاغری میری اُڑی شہرتِ عنقا ہو کر
قطعِ تقریبِ عیادت کی بھی اُمید ہوئی
ہوگیا اور بھی بیمار میں اچھا ہو کر

اپنا گھر چھوڑ کے وہ غیر کے گھر رہنے لگے
ہائے کیا شرم چڑھی ہے انہیں رسوا ہو کر

عشق آراستہ کیا کیا نہ کرے گا خود کو
حسن ہے جلوہ فزا آئنہ سیما ہو کر

رک گئے غیر کے گھر، وہ کہیں جاتے جاتے
رہ گئے دل میں مرے کاوشِ بے جا ہو کر

وہ جو نظروں ہی میں رہتا تھا خیالِ رنگیں
عاقبت دل میں رہا خونِ تمنا ہو کر

یہ جو اک وسوسۂ رغبتِ خوباں ہے اب
حشر لائے گا کبھی شوقِ تماشا ہو کر

ملتے ہی تجھ سے کھلا ہم کو بھی اپنا عقدہ
اپنا احوال کھلا قطرے کو دریا ہو کر

ربط اے پردہ نشیں سب سے رہا تیرے لیے
زندگی اپنی کٹی حرفِ اشارہ[1] ہو کر

کبھی دل میں تھا فغاں اور کبھی آنکھوں میں اشک
نہ رہا ایک جگہ تو تو کسی کا ہو کر

کیا کہیں آج ہے پامال دو عالم پہ نظر
گزرے اس طرف سے تم کیوں کہ دوبارا ہو کر

کیوں کہ ہم شکلِ اشارہ نہ ہو نالہ لب پر
بن گئی جان پہ سرگرم نظارہ[2] ہو کر

۱- 'حرف اشارہ' میں بہ حالت اضافت ہائے مختفی تبدیل نہیں ہوسکتی۔ قافیے کی وجہ سے الف سے بدلنا معائبِ سخن میں داخل ہے۔ (مرتب)
۲- 'سرگرم نظارہ' ایضاً (مرتب)

اے قلق اور نہیں چارۂ افسردہ دلی
پھونک دے خرمنِ ہستی کو شرارا ہو کر

٦٩

کچھ زیست پہ جینا ہے نہ کچھ موت اجل پر
اک شکلِ توہم ہے رخِ یاس و امل پر
ساقی کی نظر گر ہے یوں ہی رد و بدل پر
مے خانہ بنے گا کبھی مسجد کے محل پر
کیا کیا سرِ عارض شکنِ زلف ہے بل پر
خورشید تفِ داغ ہے تقدیر زحل پر
ہوتے ہی ہم آغوش شبِ وصل سدھارے
تھی تنگیِ فرصت کو نظر میری بغل پر
بے قدریِ دوراں نے نہیں کس کو جلایا
ہے ظلِّ ہما داغ سرِ اہل دول پر
موت آئے پہ بھی مر نہیں سکتے ترے ناکام
مشکل ہے کہ جی اٹھتے ہیں پیغامِ اجل پر
کیا جانیے کیا ہوگی دم جلوہ قیامت
ہفتاد و دو ملت ہے کمربستہ جدل پر
اس ہستیِ موہوم پہ یہ فاصلۂ حشر
مایوسیِ جاوید ہے یک لمحہ امل پر
ہوتا نہ کوئی لے کے خدائی کو بھی راضی
دینے کا یقیں کیوں کہ ہو قسامِ ازل پر
ہر مشکلِ دشوار ہے شرمندۂ آساں
ہر عقدۂ سربستہ کی بنیاد ہے حل پر

زاهد نہ اٹھا پردۂ ناموسِ کلیسا
گر جائے گا کعبہ مرے سجدے کے محل پر
رک رک کے خدا جانے حشر آئے گا کس وقت
رہ رہ کے جبیں پر تری بل پڑتا ہے بل پر
ہو جائے قبا جامۂ ہستی تو عجب کیا
خمیازۂ حسرت سے قیامت ہے بغل پر
اک ڈھیر غبارِ دل و دیدہ کا ہوں اپنے
ہستی سے مری خاک پڑی علم و عمل پر
پھر طوف میں دیوانہ ہے کیوں ساری خدائی
کعبہ نہیں صدقے اگر اس بت کے محل پر
کس کس کی خبر لے کہ جہاں مرتا ہے تجھ پر
واماندگی چھا ہی گئی آخر کو اجل پر
اظہارِ عداوت سے کبھی منہ نہ چھپایا
ہے باورِ الفت مجھے یارانِ دغل پر
سارے شکن و پیچ مرے دل سے اڑائے
درہم ہے تری زلفِ سیہ کون سے بل پر
لڑنے کے لیے آتے ہیں اگر وہ
ہے صلح مگر شرط مقدر میں جدل پر
جیتے ہی رہے جان گنوانے کے بھروسے
مرتے ہی رہے ہم تو تمنائے اجل پر
یا لائیں نہ مستوں کو پکڑ کر پئے تعزیر
یا میکدہ تعمیر ہو قاضی کے محل پر
خوش وقتیِ گل اور خلش خار کے ہم جیب
اس بزم کا ہے رنگ خرابی و خلل پر

تو دیکھ قلق میرے مراتب حکما میں
کچھ شعر مرا فخر نہ کچھ ناز غزل پر

۷۰

اس قدر دھڑکا کلیجا حالتِ دل دیکھ کر
حادثہ ہے مضطرب صدمہ ہے بسمل دیکھ کر
ہے فدائے قتل خلق اعجازِ قاتل دیکھ کر
خود بہ‌خود جی اٹھا ہے بسمل کو بسمل دیکھ کر
وجد میں چرخ و زمیں تھے رقصِ بسمل دیکھ کر
کٹ گئے آخر کو سب اندازِ قاتل دیکھ کر
حیف بے دردی کی تہمت قدرِ ہمدردی کے ساتھ
بڑھ گیا دونا تغافل مجھ کو غافل دیکھ کر
اڑ گئے شکلِ تصور ہو کے صیدِ انتظار
قیس نے لیلیٰ کو کھویا سوے محمل دیکھ کر
سخت بے رحمی ہے زنداں کی مروت توڑنی
ٹوٹتا ہے جی مرا رسم سلاسل دیکھ کر
داورِ محشر نہ قتلِ عشق کی کرّ باز پرس
خوں بہا مارا نہ جائے روے قاتل دیکھ کر
چھپ نہیں سکتی محبت سو عداوت کیوں نہ ہو
خون ہمارا جوش میں ہے ، تیغِ قاتل دیکھ کر
بوالہوس کو کیا خبر کیا وصل کا انجام ہے
ہوگئی وحشت مجھے سامانِ محفل دیکھ کر
شوخیاں کیوں کر نہ آئیں آنکھ میں رہ کر انھیں
ہوگئے بے پردہ وہ بھی پردہ حائل دیکھ کر

آپ سے کوئی جھکے تو آپ بھی جھک جائیے
دل بھی مائل ہو گیا زلفوں کو مائل دیکھ کر
پڑ گیا آنکھوں پہ پردہ جب اٹھی ان کی نقاب
کس کو تھی تابِ نظر دیتا[1] میں کیا دل دیکھ کر
کاملوں کے واسطے ہے یاں بڑا نقصان کمال
سلخ کے رہتے ہیں جو یا مہ کو کامل دیکھ کر
گر نہ ہوتی یاس تو جینے نہ دیتی آرزو
برق گرتی ہے مگر انجامِ حاصل دیکھ کر
ذرے سے [2] تا آسماں کوئی نہ پہنچا یار تک
سب ہوئے درماندہ اپنی اپنی منزل دیکھ کر
ہر کوئی خمیازہ آرائے فراغت ہے یہاں
موجِ دریا اٹھتی ہے آغوشِ ساحل دیکھ کر
بعدِ محشر کچھ کہیں گے ہم بھی الا سوچ کر
دادِ دل چاہیں گے لیکن عدلِ عادل دیکھ کر
سر نوشت اپنی بھی ہے شاید سوادِ خطِ غیر
کھل گیا لکھا ہوا تحریرِ باطل دیکھ کر
سادگیٔ حسرتِ عشاق دیکھا چاہیے
مرگ کو سمجھے ہیں آساں زیست مشکل دیکھ کر
دیکھیے ہمت شکستہ پاے راہ عشق کی
بیٹھتا ہے جی تو درد اٹھتا ہے منزل دیکھ کر

۱- اصل متن (ص ۶۴ مطبوعہ کلیات) میں 'دنیا' ہے - (مرتب)
۲- اصل متن (ص ۶۵) میں 'ذرہ سے لے تا آسماں' ہے - مصرع ساقط الوزن تھا ؛ 'لے' حذف کیا گیا - (مرتب)

اے قلق اک سرسری سی بات ہے جورِ فلک
مرد ہوتا ہے مقابل اپنے قابل دیکھ کر

۷۱

اعجازِ ابرو و لب ہر دم دکھا دکھا کر
ظالم نے مجھ کو مارا لیکن جلا جلا کر
دیر و حرم کو دیکھا ، دیر و حرم نہ دیکھے
پچھتائے یاں بھی آ کر پچھتائے واں بھی جا کر
میری بغل تو کیا ہے وہ آپ سے ہیں باہر
میں نے ہی کی خرابی آئینے کو دکھا کر
ہوگا ، ضرور ہوگا ، دیدار اور تمھارا
کیوں حشر کو اٹھایا اس حیلے کو اٹھا کر
کیوں کی شکایت اس کی اب کہہ حکایت اپنی
ناصح کبھی تو جی کی کچھ ہم سے بھی کہا کر
ڈوبا ہی چاہتا ہے امید کا سفینہ
طوفاں اٹھا رکھا ہے دل نے رلا رلا کر
کعبے سے پھیر رکھا یا رب یہ کس نے ہم کو
بت خانہ و صنم کا جلوہ دکھا دکھا کر
کس کس سے منہ چھپائیں، بچ کر کدھر کو جائیں
تہمت میں آ گئے ہیں کوچے میں تیرے آ کر
اللہ رے کبریائی کرتے ہیں بت خدائی
ہوتی نہیں سنائی واعظ تو کچھ بکا کر
نرغے میں ہے طبیعت آزار دوست نیت
کیا خاک چین پایا تم نے مجھے ستا کر

مرتے ہوا قلق پر آزار کچھ نہ پایا
دل پر رکھے تھا ہر دم سینے سے ہاتھ اُٹھا کر

۷۲

لے گا کیا وادیِ وحشت سے تو اُلٹا پھر کر
کہ وہیں جاتا ہے ہر سمت سے رستا پھر کر
اب وہ صورت ہی نہیں اور ہی نقشہ ہے کچھ
آنکھ دکھلاتی ہے یہ نرگسِ شہلا پھر کر
دیکھنا دیکھنا ارماں کی ہجوم آرائی
بل بے نرغہ نہ پھری چشم تماشا پھر کر
رحم بن جاتی ہے واں صورتِ عصیاں ڈر کر
کعبہ بن جاتی ہے یاں شکلِ کلیسا پھر کر
اُس کی کروٹ کے بدلتے ہی مرا بدلا رنگ
لے گیا دل کو بغل سے ستم آرا پھر کر
عشق کے کھنچنے سے ہے حسن کی رغبت برپا
لا بٹھاتی ہے اُسے خاطرِ شیدا پھر کر
کوہ ہے سنگ دلی تیری ہر اک سے ظالم
نالہ دل کوب نہ کس طرح ہو اُلٹا پھر کر
قطرہ افشانیِ وحشت کا پسینہ تھا مگر
ہو گیا خشک مری خاک پہ دریا پھر کر
پیشوائی کو مری نعش بھی اُٹھی تو بھی
نامہ بر کوچۂ دل بر سے نہ آیا پھر کر
اقربا پھر گئے ، احباب پھرے ، خلق پھری
پر کبھی تو نے ہی بے رحم نہ دیکھا پھر کر

پاؤں پھیلائے یہ دل نے ترے کوچے میں کہ میں
گر کے سایے کی طرح در سے نہ اٹھا پھر کر
گردشِ چشم کو اس کی تو دلاتا ہے یاد
اے فلک تو نے زمانے کو پھرایا پھر کر
اس کے کوچے سے قلق جان ہی دے کر نکلا
ایسی ٹھوکر سے گرا تھا کہ نہ سنبھلا پھر کر

۷۳

آشوبِ زلزلہ نہیں آشفتہ سر سے دور
زنداں[۱] ہمارا چاہیے دیوار و در سے دور
وہ پھر رہے ہیں آنکھ میں لیکن نظر سے دور
شوخی تو دیکھیے کہ وہ گھر میں ہیں گھر سے دور
وحشی کے تیرے آنے کی زنداں میں دھوم ہے
کیا دور بھاگ جائے جو دیوار و در سے دور
تقریب ان کے ہنسنے کی یہ بھی تھی ایک اور
افسوس ہے کہ مرتے ہیں ہم نوحہ گر سے دور
اے چارہ‌گر میں کشتۂ نازک مزاج ہوں
ہے چارہ دردِ سر کا مرے دردِ سر سے دور
کیا مرغِ صبح خوان و مؤذن کو مجھ سے رنج
میری شبِ فراق ہے کوسوں سحر سے دور
آغاز کی خبر ہے نہ انجام پر نظر
شوقِ گریزپا نے کیا راہ بر سے دور

---

۱ - رہنا -

جو واں تلک گیا وہی اپنا رقیب ہے
اے آہ پاس جائیو لیکن اثر سے دور

بیداد وہ کرے ہے جو گاہے ہوا نہ ہو
فریاد وہ سنے ہے جو ہو شور و شر سے دور

گر کچھ نہ ہو اشارۂ اُلفت وہ پاس ہے
اندیشۂ رقیب سے اور زور و زر سے دور

اے رشک اُس کی بزم میں تو بھی نہ آئیو
رکھنا خبر مری مگر اُس بے خبر سے دور

واعظ وہیں کٹے گی شبِ ہجر سچ بتا
جنت مقام امن ہے خوف و خطر سے دور

کیاؔ بے محل میں داورِ محشر کو دوں جواب
ہے ہے کہ حشر بھی ہے تری رہ گزر سے دور

چھوڑ اے قلق کہاں نہ رہنِ زوال ہو
بے شک شرف ہے منزلِ علم و ہنر سے دور

ردیف الرائے فارسی

۷۴

رشتۂ رسم محبت مت توڑ
توڑ کر دلؔ کو قیامت مت توڑ

کام ناکامی بھی اک کام سہی
توڑؔ اُمید کو ہمت مت توڑ

رات فرقت کی پڑی ہے اے دل
ایک ہی نالے میں طاقت مت توڑ
اُس کی رحمت کو نہ بے کار سمجھ
مے و میخانے کی نیت مت توڑ
دیکھ اچھی نہیں یہ خرمستی
ساغرِ بادۂ فرصت مت توڑ
اے دل اُمید رہائی مت باندھ
اور آفت سرِ آفت مت توڑ
پوچھ مت لذتِ مے اے واعظ
جانور دامِ شریعت مت توڑ
صحنِ مسجد کو کیے جا پامال
قیدِ آئینِ طریقت مت توڑ
مے کدہ دیکھ کے جنت کو نہ بھول
حرص سے بندِ قناعت مت توڑ
اُس کا احسان اُٹھانا ہے ہمیں
گردن اے بارِ ندامت مت توڑ
اے قلق بت کدے میں باندھ احرام
ہم سے للہ رفاقت مت توڑ

ردیف الزاے معجمه

۷۵

ویسا ھی بدگمان ہے وہ بد گماں ہنوز
آتا ہے ساتھ نعش کے ، ہے وہمِ جاں ہنوز

اللہ رے دشمنی مرے حالِ تباہ پر
اعدا بھی رو چکے وہ نہیں شادماں ہنوز

طولِ شبِ فراق کے شکوے کی کیا مجال
وہ شوخ خوابِ ناز میں ہے سرگراں ہنوز

ہے آرزو کوئی دلِ غم دیدہ میں ابھی
اک چال پر ہے دورۂ ہفت آسماں ہنوز

وہ دل نہیں ، دماغ نہیں ، وقت وہ نہیں
ناصح کو وہ ھی[1] ذکر وھی داستاں ہنوز

اب آچکی بہار اِدھر جا چکی خزاں
رکھا ہے شاخِ گل پہ مرا آشیاں ہنوز

بے التفاتیوں میں بھی اک التفات ہے
ہے نذرِ نیم ناز مری نیم جان ہنوز

ٹھوکر سے اپنے سایے کی گرتا[2] ہوں میں کہ ہے
زور آزماے شوق دلِ ناتواں ہنوز

---

۱ - اصل متن (صفحہ ۶۸) وھی - (مرتب)

۲ - اصل متن ص ۶۹ میں 'کرتا' (مرتب)

کیا صبحِ ہجر زلزلۂ حشر کی سنوں
کانوں میں ہے بھرا ہوا شورِ اذاں ہنوز
اس وقت میں بھی عشق کا کچھ کچھ ظہور ہے
بخیے سے دور گرد ہے چاکِ کتاں ہنوز
زنداں عجب جگہ ہے کہ لگتا ہے سب کا جی
یوسف کا حال دیکھیے ہے میہماں ہنوز
دل سینے میں نہیں تو نہ ہو بے دلی نہیں
افسانے کے لیے تو ہے منہ میں زباں ہنوز
بہرِ نگاہِ راز ہے ہمراہ نعش کے
وہ جاں ستاں ہے دیکھنا کیا دل ستاں ہنوز
گو ذرہ ذرہ ہے مری بربادِ مشتِ خاک
پر شوق کی نظر میں نہیں رایگاں ہنوز
میں کیا کہوں قلق کی زباں کو کہ سحر ہے
جیتا ہے بارے شکر وہ جادو بیاں ہنوز

۷۶

کسی کو چین نہ دے دورِ آسماں شب و روز
کہ روز و شب کو بھی فرسودگی ہے یاں شب و روز
کچھ اعتماد کسی کا نہیں محبت میں
نگاہباں کو ہے درکار پاسباں شب و روز
کچھ اعتبارِ اقامت نہ اختیارِ سفر
کہ صبح و شام کا کھٹکا لگا ہے یاں شب و روز
نہ پوچھ خیرہ کشیِ سپہر صبح و مسا
کہ لمحہ لمحہ ہے بسمل تو نیم جاں شب و روز

عجیب دور ہے مے خانے کا بلا تغییر
کہ شام و صبح کدھر کو گئی کہاں شب و روز
کمال نقص ہے بنیادِ کائنات میں کچھ
کہ ذرے ذرے کا ہوتا ہے امتحاں شب و روز
وہاں پہ دیکھیے کیا کچھ ملے گا نقدِ مراد
کہ سال و ماہ ہے یاں عمر رائگاں شب و روز
جہاں کی ہے کوئی آخر تو منزلِ آرام
کہ روز و شب ہیں برابر رواں دواں شب و روز
نہ مرتے ہم تو بن آتی، زمانہ مر جاتا
ہمارے قصے کی ہر سو ہے داستاں شب و روز
ہر ایک جسم میں جاں دل فگار کانٹا ہے
کہ فکرِ زیست میں مرتا ہے اک جہاں شب و روز
خدا ہی جانے بت میں کیا برائی ہے
وہ روز و شب ہے بد اندیش و بدگماں شب و روز
ہزار گریہ و ہر گریہ لاکھ طوفاں ہے
کہ ایک رنگ پہ ہے چشمِ خوں فشاں شب و روز
غم و الم سے بھی خوش ہوتے میں تو ڈرتا ہوں
وہ میرے رنج سے رہتا ہے شادماں شب و روز
خدا ہی جانے کہ ٹپکا پڑے ہے کیا لب سے
لرزتی رہتی ہے منہ میں مری زباں شب و روز
قلق وداعِ محبت کا وقت آ پہنچا
کہ دل سے اٹھتا ہے اب دردِ جاں ستاں شب و روز

ردیف السین مہملہ

۷۷

اس قدر ہو گئے ہم زیست سے ناچار کہ بس
چارہ سازوں سے طبیعت ہے یہ بیزار کہ بس

میرا ہر لفظ پہ یہ ذہن پریشاں کہ نہ پوچھ
اُس کو ہر بات پہ اس مرتبہ تکرار کہ بس

نہ اُسے پاس ہے میرا نہ حیا ہے اُس کی
دلِ خود کام بھی ہے اتنا خود آزار کہ بس

دمِ آخر مری پرسش کو مگر صبر آیا
ہے یہ آوازِ فغاں سے مری ہر بار کہ بس

سخت دل گیر قفس دام پریشاں خاطر
کیا غضب ناک ہے صیادِ ستم گار کہ بس

اُس نے تو کام تمام اپنا کیا تھا لیکن
بول اُٹھے بیچ میں بیہودہ سرِ اغیار کہ بس

آپ کے پاس ہے دل میں نے کہا جب اُس سے
جیبِ خالی کو دکھا کہتا ہے عیّار کہ بس

دیں چھڑا دینے کو وہ آنکھ یہ کافر کہ غضب
دل اُڑا لینے کو وہ زلف یہ طرار[1] کہ بس

بے بسی سے دمِ آخر نہیں چلتا کچھ بس
اہلِ ماتم کو وصیت مری ناچار کہ بس

۱- اصل متن (صفحہ ۱۷ کلیات قلق) میں 'طر مار' غلط ہے۔ 'طرار' تصحیح قیاسی ہے (مرتب)

تشنۂ قدر عجب گوہرِ بے قیمت ہوں
دور سے دور ہی کہتا ہے خریدار کہ بس

نام عیسیٰ کا کوئی لے کہ نکل جائے دم
تنگ جینے سے ہے ایسا دلِ بیمار کہ بس

رحم سے تیرے وہ دل گیر اجل ہے کہ پناہ
مرگ سے میری وہ شرمندہ ہے آزار کہ بس

موت جس کو نہ چھوئے چھوڑتا ہے اُس کو وہ
دل گرفتہ یہ رہائی سے گرفتار کہ بس

جا اب اے حسرتِ دیدار نہ دیکھا کیا کیا
بیٹھ اب اے ہوسِ شوقِ درِ یار کہ بس

کر لیا سارے زمانے کو قلق نے دشمن
کیا بلا نشۂ الفت میں ہے سرشار کہ بس

۷۸

نہ رکی سیلِ چشم تر، افسوس
نہ بجھی آتشِ جگر، افسوس

خاک دنیا میں جی کسی کا لگے
تم سے ویراں ہیں گھر کے گھر، افسوس

فرق ظاہر ہے اصلِ گیسو میں
دل کے پیوندِ رشتہ پر، افسوس

اُن کو آتی ہے جب ہنسی مجھ پر
مجھ کو آتا ہے کس قدر افسوس

خونِ حسرت کہاں نہ ہوا
کیجیے ماتم کدھر کدھر، افسوس

تیرے بھی ناز ہم اٹھائیں گے
سخت جانی سے چارہ گر، افسوس
دشت و دریا کی ضد نہیں جاتی
ہے مری خاک در بہ در، افسوس
کیا ہی بھولے ہیں دل ربائی پر
دے دیا دل کو جان کر، افسوس
دعویٔ فہم ہی ہے نافہمی
تھے خبردار بے خبر، افسوس
کیا امیدِ جواب قاتل سے
آئے ہے جائے نامہ بر افسوس
اس ستم گر کے التفات پہ ناز
اے قلق تیرے حال پر افسوس

۷۹

یوں وصل سے ہوں دور میں گل پیرہن کے پاس
جس طرح قید مرغِ چمن ہو چمن کے پاس
مر رہوے جا کے طاقتِ رفتار سے پرے
در ماندۂ وطن بھی نہ جائے وطن کے پاس
پاسِ خوشیِ غیر نہیں ہے اگر اسے
آ کر وہ کیوں رہا مرے بیت الحزن کے پاس
سر پھوڑنا دلیلِ محبت نہیں ہے کچھ
شیریں نہ تھی شبیہ تو تھی کوہ کن کے پاس
در هم کو کوے غیر میں مرنا پڑے، پڑے
مدفن مگر بنے گا تری انجمن کے پاس

حکمِ عقیدہ ہے کہ رہیں گے بتوں سے دور
مسجد نئی بنائیں گے دیر کہن کے پاس

اس نرم دل پہ سخت نظر، شمع اس قدر
پروانوں کا ہے ڈھیر ہمیشہ لگن کے پاس

ایسی ادا سے غیر جا ہے ترے قریب
جیسے کوئی مغیل لگا دے سمن کے پاس

کیا ذکر لطف و مہر کا جور و جفا کے ساتھ
کیا کام عیش و ناز کا رنج و محن کے پاس

وہ شکلِ بوسہ پوچھتے ہیں عینِ ذوق میں
اور طرفہ یہ کہ لب ہیں برابر دہن کے پاس

دل پر لگے گی[۱] صدمۂ خود رفتگی کی ٹھیس
بے ساختہ نہ آ قلقِ خستہ تن کے پاس

۸۰

چمن سے کم نہیں اب خوے اعتکافِ قفس
جو چھوٹ جاؤں تو کرتا رہوں طوافِ قفس

جو مجھ کو چھوڑ دے صیاد ٹوٹ جائے کمر
بہ شکل فاے قفس ہو گیا ہوں ذفِ قفس

جو میں نہ ہوں تو نہ ہو کچھ حصولِ فصلِ بہار
مرا غلافِ قفس اور چمن غلافِ قفس

ہجومِ شوقِ تماشا ہے جلوۂ حرماں
مری نگاہ سے در بستہ ہے شگافِ قفس

۱- اصلِ متن (صفحہ ۴۲ کلیات قلق) میں 'لگی کی' ہے - (مرتب)

مرے سراغ میں صیاد ہے گیا گزرا
کہ لاغری سے ہوں عنقائے کوہِ قافِ قفس
ہوا ہوں سرد زمستانِ سردمہری سے
جز آسماں کوئی بنتا نہیں لحافِ قفس
ہر اک اسیر کا نالہ ہو تو وہ زیرِ خدنگ
گر اتفاق سے برپا ہو اختلافِ قفس
فلک کے پنجے سے کوئی کدھر نکل کر جائے
ظفر نصیب ہے جاں دادۂ مصافِ قفس
قلق اسیرِ محبت ہے اور کیا کرتا
قفس کے ساتھ رہا مثلِ سین و قافِ قفس

ردیف الشین معجمہ

۸۱

ہر آبلۂ پا ہے مرا اخگرِ آتش
میں شوق میں ہوں شعلۂ آتش، سر آتش
ہر اشکِ سرِ بحر مرا اخگرِ دامن
ہر نالہ پۓ باغ مرا صرصرِ آتش
فریادِ دلِ چرخ میں ہے خنجرِ زہراب
اور آہ رگِ سنگ میں ہے نشترِ آتش
ہے سردیِ اُلفت تری غرقابیِ دریا
اور شعلہ مزاجی ہے تری خنجر آتش

جب دیکھتا ہے شمع کو خنداں سرِ محفل
پروانے کے لگ جاتے ہیں بال و پرِ آتش

اے شمع پگھلتی ہے مگر شعلے سے بچ کر
ناسورِ جگر اپنا ہے چشمِ پرِ آتش

ہے منہ میں زباں تیرے اگر ماہیِ سیماب
دل پہلو میں میرے بھی ہے جادوگرِ آتش

کچھ اور نہیں اس کا جلانے کے سوا کام
ہے سردیِ اُلفت سے مگر جوہرِ آتش

دل سوز مرا سوز ہے میں سوز کا دل سوز
آتش مری دل دار ہے میں دل برِ آتش

کیا کہیے گدازِ دلِ افسردہ کا عالم
ہر اشک، خنک بھی ہے مرا ساغرِ آتش

ہے سینۂ تفتہ مرا آتش کدۂ داغ
ہے دیدۂ خوں بار مرا مجمرِ آتش

وہ صاعقۂ غرفہ تصور[2] میں ہے ہر دم
رہتا ہے مرے پیش نظر منظرِ آتش

اغیار کی ہے گرمیِ صحبت کا یہ ساماں
ہے دامنِ مہتاب مجھے چادرِ آتش

۱- کلیات قلق مطبوعہ صفحات ۷۳ اور ۷۴ پر یہ شعر دو مرتبہ لکھا گیا ہے - (مرتب)

۲- اصل متن (صفحہ ۷۴ میں 'تصویر' ہے جو مصرع کو ساقط الوزن کرتا ہے اور بے معنی ہے - 'تصور' تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

چل مجھ سے ذرا بچ کے تو اے بادِ سحر گاہ
ہے خاکِ پراگندہ مری محشرِ آتش
کس برق کے جلوے نے قلق تجھ کو جلایا
ہے آہِ دلِ سوختہ جاں پرورِ آتش

۸۲

الٰہی ہو غش سے مداوائے غش
مرے ساتھ ہی غش کو بھی آئے غش
وہ کیوں دیکھنے میرا آ جائے غش
کہ پھر حشر تک غش ہی پر آئے غش
تمنا کا ماتم ہے چندے ضرور
نہ کچھ خوفِ سکتہ، نہ پروائے غش
عجب امتحاں غیر کا یہ کیا
کہ ہر دم ہیں خود حیلہ آرائے غش
عدو کو سکھانی ہے اُلفت اُنھیں
وہ کرتے ہیں کیا کیا تمنائے غش
ملے دانہ پانی اسیروں کو کیوں
کہ صیّاد کو ہے تماشائے غش
ترے عاشقوں کے یہ نازک دماغ
کہ ہیں ہر قدم سایہ آسائے غش
مرا سر ہے اور بےکسی کا ہے دوش
بہ جز غش نہیں چارہ فرمائے غش
نشورِ قیامت ہو خارِ دماغ
اگر اُن کے جاتے ہی آ جائے غش

جو تصویر اُن کی ہے حیرت طلسم
تو نقشہ ہے میرا سراپاے غش
اُڑے گا مرا ساتھ بو کے دماغ
چمن ہے مرے واسطے جاے غش
چلے تم کہاں خوب رخصت ہوئے
تماشا تمھیں بھی تو دکھلائے غش
سنگھانی نہ تھی زلف کی بو مجھے
کہ ہر شب ہے وحشت میں سوداے غش
رخِ نازنیں اپنا دھوتے ہیں وہ
تماشا ہے مجھ کو گر آ جاے غش
قلق بھی تھا یاروں میں کیا نکتہ یاب
وہ رھنا ہر اک بات پر ھاے غش

ردیف الصاد مہملہ

۸۳

رھتا ہے واں حجاب میں شورِ رباب و رقص
یاں جوشِ پیچ و تاب میں شورِ رباب و رقص
اے اھلِ بزم کوئی بھی فرصت شناس ہے
ہے سخت اضطراب میں شورِ رباب و رقص
واعظ تری زبان ہی میں ہے یہ حور و خلد
یا ہے تری کتاب میں شورِ رباب و رقص

صوت سرود شیب میں جوشِ خشوع و خواب
بانگِ اذاں شباب میں شورِ رباب و رقص

ہم گریہ ناک خوفِ ملاہی[1] سے ہوں اگر
پیدا ہو موجِ آب میں شورِ رباب و رقص

لازم ہے آفتاب میں جوشِ خم شراب
واجب ہے ماہتاب میں شورِ رباب و رقص

ہوتا ہے اُس کی بزم کا افسانہ ہر کہیں
رہتا ہے شیخ و شاب میں شورِ رباب و رقص

تنہائی میری کم نہیں کچھ تیری بزم سے
نالوں سے ہے عذاب میں شورِ رباب و رقص

اے آہ و نالہ کون سی تقریب ہے یہ اور
سنتا ہوں روز خواب میں شورِ رباب و رقص

کیوں کر نہ تیری بزم کا مہماں ہو ہر کوئی
کیوں کر رہے حجاب میں شورِ رباب و رقص

تھا جو کہ اہلِ ذوق سے اے محتسب سوال
ہے اُس کے ہی جواب میں شورِ رباب و رقص

ہر نغمہ ، ہر اصول تغیر پذیر ہے
ہے دردِ انقلاب میں شورِ رباب و رقص

تو بھی فریبِ رقص سے گردش میں آ پھنسا
ہو کیوں نہ پیچ و تاب میں شورِ رباب و رقص

۱- 'ملاہی' (ع) مذکر - لہو کی جمع الجمع ، کھیل کود ، وہ چیزیں یا افعال جو یاد خدا سے غافل کریں -
(نوراللغات ، ۴۴۰ ص ۳۵۱)

آج اُس کی بزمِ ناز میں ہنگامہ ہے نیا
ہے شورشِ عتابؔ میں شورِ رباب و رقص
افلاس سے میں چپ ہوں قلق کاش ہو نصیب
اس صبر کے ثواب میں شورِ رباب و رقص

ردیف الضاد معجمہ

۸۴

اس عہد میں نہیں ہے بشر کو بشر سے فیض
عینِ حجاب ہی ہے نظر کو نظر سے فیض
شامِ فراق کی جو بڑی ہے شبِ دراز
شورِ نشور ہوگا سحر کو سحر سے فیض
کس وقت میں نہ رنگ تھا جوہر کے واسطے
کس دور میں تھا اہلِ ہنر کو ہنر سے فیض
وحشت سے میری درہم و برہم ہوا یہ گھر
سایے تلک کا بھی نہیں اب در کو در سے فیض
انجام خود عروجِ بلا ہے پئے عروج
آخر کو زخمِ تیغ ہوا سر کو سر سے فیض
ہستی یہاں ہے آفتِ ہستی کے واسطے
اک سنگ ہے نموے ثمر کو ثمر سے فیض
تشنہ لبی ہے ساحلِ جو کو عطاے جو
تابِ جگر ہے آبِ گہر کو گہر سے فیض

دیوانگی ہے جہد و تلاشِ مراد خواہ
ویرانگی ہے اہلِ سفر کو سفر سے فیض
سنگِ زمیں نمودِ ثمر کو ثمر سے رزق
برقِ فلک بہارِ شجر کو شجر سے فیض
غفلت جتائیں کیوں کہ تغافل شعار کو
کیا دیر آشنائے خبر کو خبر سے فیض
اس طرح سے ہے دل کے لیے غم ترا عطا
جس طرح سے کہ لختِ جگر کو جگر سے فیض
جب تک نہ تھی نمود تو اک شکلِ بود تھی
در خود گمی فروغِ شرر کو شرر سے فیض
اوروں پہ سو نگاہ اور اپنے پہ اک نہیں
گویا نہیں ہے اہلِ نظر کو نظر سے فیض
کیوں خود نما ہو اتنا کہ جاتی رہے نمود
آخر ہے داغِ نورِ قمر کو قمر سے فیض
چل اے **قلق** وہاں کہ جہاں تو ہو اور نہ ہم
یاں بخل رہ گیا ہے بشر کو بشر سے فیض

ردیف الطاے مہملہ

۸۵

دعوئ ترکِ وفاداری غلط
میری ناچاری کی ناچاری غلط

وہ نگہ خوش خواب ، بدمستی دروغ
وہ مژہ مصروفِ بے کاری غلط

خط وہ میرا دیکھ کر رکھتے درست
نامہ بر کی گفتگو ساری غلط

مدعی کی آنکھ تو پھوٹی نہیں
آسماں کی مردم آزاری غلط

عشق کو منظور رسوائی دروغ
حسن کو پاسِ حیا داری غلط

ہر طرف صیاد ھی سے ہے دوچار
صید کو خوفِ گرفتاری غلط

بےکسی کوئی نہیں بےکس نواز
بلکہ ہے خود غم کی غم خواری غلط

مژدہ اور رندوں کو دیتے رائگاں
جوے صہبا خلد میں جاری غلط

رہ گئے ہم آسماں کو دیکھ کر
اس کا آشوبِ ستم گاری غلط

دل کو دامن کے اٹھاتے تک اٹھاے
مدعی کی ناز برداری غلط

سہل ہے انجام تشویشِ محال
میری دشواری کی دشواری غلط

ہو گئی ہر شکل سے صحت ہمیں
ہر طرح رسمِ وفاداری غلط

سر گیا گردن پہ احساں چھوڑ کر
اے سبک دوشی سبک ساری غلط

نام لے کر تیرا رو پڑنا صحیح
دل کو لے کر گریہ و زاری غلط

اے قلق اتنی تمھیں فکرِ نماز
کچھ نہ کچھ ہے، پاسِ دیں داری غلط

ردیف الظاے معجمہ

۸۶

ہم اور اس طرح سے کریں غیر کا لحاظ
ان بے لحاظیوں پہ بھی تیرا رہا لحاظ

جب تک کہ نام طرزِ تغافل کا تھا لحاظ
کیا کیا گھٹائے حوصلے، کیا کیا رہا لحاظ

کیوں کر کروں نہ شرم کہ پردے میں ہے خودی
کیوں کر نہ ہو پسند کہ ہے خودنما لحاظ

کرتا تھا لاکھ لاکھ قیامت کا سامنا
وہ جو اک اس کی چشم کی گردش میں تھا لحاظ

خلوت میں تیری آئے تو کیا قہر ہو گیا
یاں تو ذرا کسی کو کسی کا نہ تھا لحاظ

تم نے نظر چرا کے خبردار کر دیا
یاں جانتا تھا کون کہ ہوتا ہے کیا لحاظ

بسمل کیے ہی دیتا ہے مشتاقِ وصل کو
اُس شرمگیں نگاہ میں حسرت فزا لحاظ

جو کچھ کہوں میں آپ سنے جائیے خموش
بے شرم مجھ سا کون ہے اور تم سا با لحاظ

کیوں پوچھتے ہو غیر کا احوال مجھ سے تم
یہ تو کہو کہ آج ہوا تم کو کیا لحاظ

ہم تو وفا کو کرکے بہت ہو گئے ذلیل
کچھ بھی جفا سے تجھ کو ہے اے پُر جفا لحاظ

اُس نے جدھر نگاہ کی پردے اُدھر پڑے
گردش میں اُس نگاہ سے کیا کیا رہا لحاظ

اغیارِ بوالہوس کا ہجوم اور تم خموش
بے شرمیوں کی فکر میں ہے آپ کا لحاظ

جب تو قریبِ غیر ہو اور مجھ سے دور دور
کیوں کر حیا کے پاس ہو اے بے حیا لحاظ

جب پاسِ اعتمادِ محبت نہیں رہا
کیا خویش و اقربا کا اب اے بے وفا لحاظ

کیوں کر قلق فغاں نہ کرے کیوں نہ چپ رہے
محشر فریب شرم ہے اور فتنہ زا لحاظ

———

ردیف العین مہملہ

۸۷

چل دیے ہم اے غم عالم ، وداع
شورِ ماتم تا کجا ، ماتم وداع
جاتے ھی تیرے ھر اک کا کوچ ہے
جاں وداع و دل وداع و دم وداع
روزِ میت بھی نہیں کم عید سے
پہلے رحلت سے ھوا ھر غم وداع
ھے قیامت ایک دن اس کا قیام
دل کو کر اے طرۂ خوش‌خم وداع
اُس کا رستہ کوے غیر اور اپنا خلد
وہ اُدھر رخصت ، ادھر ھیں ہم وداع
غیر کی خاطر ھے تو جانے بھی دو
کیجیے اُس کو خوش و خورّم وداع
ھائے رے عمرِ رواں کا قافلہ
ھر قدم ، ھر آن ھے ھر دم وداع
کیوں نہ ھوں آغوشِ حسرت صبح و شام
روز و شب عالم سے ھے عالم وداع
ھے بہ قدرِ حوصلہ یاں اتفاق
جام سے ھرگز نہ ھوگا جم وداع
سن چکا ھوں میں ترا عزمِ سفر
آنکھ سے میری نہ ھوگا نم وداع

حسرتِ بے اختیاری دیکھنا
تن سے جاں ہوتی ہے کیا تھم‌تھم‌وداع
اب کہاں صبر و قرار و تاب و ہوش
ساتھ ہی اُس کے ہوے پیہم وداع
لا تعین بے نشانی نے کیا
کیجیے آرام رخصت، رم وداع
مہلتِ رنگِ چمن خوں کیوں نہ ہو
ہو گئی جب فرصتِ شبنم وداع
اے قلق چلیے کہ منزل دور ہے
ہو رہیں گے یار سب باہم وداع

۸۸

دیدۂ صرفِ انتظار ہے شمع
میری حالت کی یادگار ہے شمع
نہیں دل میں کسی کے سوز و گداز
کہ تماشاے روزگار ہے شمع
پئے جنبش سدا تڑپتی ہے
تپشِ ناتواں شکار ہے شمع
رخِ روشن ہے نورِ بینائی
چشم عشاق کا غبار ہے شمع
روزِ تیرہ میں بدنما خورشید
شبِ روشن میں تیرہ کار ہے شمع
یادِ گل رخ سے پھول جھڑتے ہیں
کس بشاشت سے نوبہار ہے شمع

خاک ناسور دل بھرے اس کا
زخمیِ گریہ ہائے زار ہے شمع

حسن دیوانہ سب کو کرتا ہے
اپنے ہی آپ پر نثار ہے شمع

صبح ہوتے ہی ٹمٹماتی ہے
آپ کی چشمِ پُر خمار ہے شمع

کیوں نہ روئے نہ کس طرح سے جلے
کہ فغانیِ راز دار ہے شمع

نہیں بجھتی لگی ہوئی جی کی
شعلۂ جانِ سوگوار ہے شمع

ہے ادھر داغ برقِ پروانہ
اور ادھر چشمِ ابر بار ہے شمع

حسن بھی ہے مآلِ کار وبال
بزم در بزم کیا ہی خوار ہے شمع

جھانکنا پردے سے بری خو ہے
خود بہ خود آپ شرمسار ہے شمع

شبِ تنہائی اور تو اور یہ
اے قلق تیری غم گسار ہے شمع

ردیف الغین معجمہ

۸۹

اُن سے کہا کہ صدقِ محبت مگر دروغ
کہنے لگے یہ سچ ہے کہ ہر طرح پر دروغ

دزدِ حنا پہ دزدیِ جاں کا ہے اتہام
خونِ دل و جگر سرِ تیغِ نظر دروغ

آنا صباحِ حشر کا شام فراق جھوٹ
اُڑ جانا شورِ نالہ سے، رنگِ سحر دروغ

ہر لحظہ تیغ جاننا ابرو کا افترا
ہر لمحہ ذوقِ قتل میں سر ہاتھ پر دروغ

سر سنگِ در سے پھوڑنا وحشت میں نا ثبوت
گر جانا سیلِ اشک سے دیوار و در دروغ

خونِ جگر بجائے مئے ناب نا درست
آتش زنیِ شعلہ فشاں چشم تر دروغ

جاں اور نگارِ تیرِ مژہ کس قدر غلط
دل اور اسیرِ رشتۂ مو سر بہ سر دروغ

بے جاں ہو اور جیتے ہو فرقت میں اختراع
بے دل ہو اور نیازِ نگہ ہے جگر دروغ

ٹکڑے نگاہِ ناز سے دل آپ کا درست
وہمِ نظر سے دور ہماری کمر دروغ

اُڑتا ہے رنگ ساتھ ہی آوازِ ناز کے
چینِ جبیں سے آپ کو اتنا خطر دروغ

ہے ناسپاسِ وصل دلِ ہجر دوست خبط
ہے پاک بازِ چشمِ حقیقت نگر دروغ
کوچے میں میرے لے کے صبا آئے گی بجا
تم خاک ہو گئے ہو سرِ رہ گزر دروغ
ہم کو تلاش آپ کی اور در بہ در محال
جذبِ دل و جگر سے امیدِ اثر دروغ
ہم اور نعش اٹھانے کو آتے، خلافِ عقل
مرگِ شبِ فراق کی ہر سو خبر دروغ
یہ ضبط وضع نام قلق قصہ مختصر
شاعر ہو ہر طرح ہے تمہارا ہنر دروغ

۹۰

سارے ہی سارے جسم میں روحِ رواں ہے داغ
پیرانہ سال میں بھی ترا نوجواں ہے داغ
مرتے ہیں اور موت کا حیلہ نہ بن پڑا
صدمہ نہ پوچھیے کہ الم سے نہاں ہے داغ
کوئی دکھا سکے ہے کہ یہ درد ہے ترا
کوئی بتا سکے ہے کہ دل میں یہاں ہے داغ
دریا کہاں، نجوم کہاں، حادثات سے
ناسور جرمِ خاک ہے اور آسماں ہے داغ
یہ گرم و سردِ دھر کا ازلی طلسم ہے
ہے دجلہ خیز سینہ تو آتش فشاں ہے داغ
اللہ رے اپنی کاہشِ جاں کی فزوں سری
کیا دل ربا ہے درد تو کیا دل ستاں ہے داغ

برقِ تپاک سے کہیں اعدا جھلس نہ جائیں
کیا کہیے تیری گرمیِ صحبت بیاں ہے داغ
خواب و خیالِ وصل کے سامان ہو گئے
سب کے عوض فراق میں اب میہماں ہے داغ
رنگیں ادائیوں کے وہ انبوہ ہائے ہائے
طاؤس کی طرح سے نظر میں تپاں ہے داغ
ہر چند جل بجھے ہیں مگر بزمِ یار[1] میں
مثلِ چراغِ صبح ہمارا نشاں ہے داغ
ہر دم یہ شعلہ خیز کہ سوہانِ برق ہے
سوزِ دلِ برشتہ سے شکلِ فغاں ہے داغ
واعظ عذابِ دوریِ بت میں محال ہے
سینے میں اہلِ دل کے جہنم فشاں ہے داغ
بھڑکا یہ اک ذرا کہ ہوا خاک ہر خیال
برقِ ادا کا تیری مگر رازداں ہے داغ
کیا ایک میں کہ سب ہی کو ہے لو لگی ہوئی
خورشید ہو کے تیرا فلک پر عیاں ہے داغ
دیکھا **قلق** کو ، رنگ وہی ڈھنگ ہے وہی
پیرانہ سال میں بھی ترا نوجواں ہے داغ

۱۔ 'یاد' اصل متن (صفحہ ۸۳) میں غلط ، 'یار' تصحیح قیاسی ۔ (مرتب)

ردیف الفاء

۹۱

رهنما کیا همیں درکار بیاباں کی طرف
چاک کیا کم هے جو بڑھتا چلے داماں کی طرف

کوئی الزام نہیں گردشِ دوراں کی طرف
اپنا سر جاتا هے اپنے هی گریباں کی طرف

شمع ساں مل گئے هم خاک میں کشته هو کر
نه گیا خون همارا کسی داماں کی طرف

کوئی تو دام بچھا هے که هر اک جھوکے میں
لیے جاتی هے صبا هم کو گلستاں کی طرف

پھر گئے سب نه پھری مردمِ چشمِ ظالم
دیکھنا چاهیے انساں کو تو انساں کی طرف

غنچۀ باغ هوے سارے پراگنده مزاج
اے صبا گزری هے کس بخت پریشاں کی طرف

مصر کے کوچه و بازار میں حشر آنا تھا
کارواں جانے نه پاتا کبھی کنعاں کی طرف

مه و خورشید کو آئینه بنایا کس نے
ره گئے دیکھ کے وه دیدۀ حیراں کی طرف

هائے وه جاں که نه گھبرائے نشاطِ دل سے
حیف وه دل که نه دیکھے الم جاں کی طرف

کس کے دامن کے پکڑنے کی بڑھی هے امید
هاتھ آجاتا هے اکثر جو گریباں کی طرف

ھو کے پھر آتے ھیں گرمیِ نظر سے نالے
اشک جاتے ھیں اگر دامنِ مژگاں کی طرف

فرشِ رہ خاک ہماری اسی امید میں ھے
لں قدم اس کے جو گزرے کبھی زنداں کی طرف

نہیں وہ دل کہ جو مٹ جائے تن آسانی پر
نہیں وہ سر کہ جو مصروف ھو ساماں کی طرف

پھر نئے چرخ کے بننے کے پڑے ھیں انداز
پھر غبار اپنا اڑا دامنِ جاناں کی طرف

دیدنی حسرتِ مفلس کی ھے آوارہ نگاہ
کبھی ساماں کی طرف اور کبھی مہماں کی طرف

اے قلق اپنا بھی وعدہ مگر آ پہنچا ھے
کہ نزول آج ملائک کا ھے میداں کی طرف

۹۲

نہیں جس کو خبر دل ھی کی وہ دل بر سے کیا واقف
بغل ھو جس کی بے آسیب غارت گر سے کیا واقف

بتوں کا جو نہ ھو ساجد عبادت کو وہ کیا جانے
نہ ھو رحمت کا جو قائل مے و ساغر سے کیا واقف

نہ لطفِ مرگ جو سمجھے وہ کیوں جینے سے ناخوش ھو
نہ حسِ زیست ھو جس کو دل و دلبر سے کیا واقف

ترا دشمن کے گھر جانا ھی گردوں کو بہانہ تھا
وگرنہ گردشِ بے جا مرے اختر سے کیا واقف

پھرانے کے لیے وعدوں کا رستہ خوب ھے لیکن
تری تمکین و رعنائی دلِ مضطر سے کیا واقف

قیامت ہی پہ اک کیا ہے ، اٹھیں گے لاکھ ہنگامے
ابھی اے گردشِ دوراں تو اس ٹھوکر سے کیا واقف

وہ خود ناتجربہ ہے کیا کرے درماں مرا عیسیٰ
مژہ پرنم ، نہ دل میں داغ ، خشک و تر سے کیا واقف

یہاں پر جو کوئی آیا ، عدو کے آنے سے آیا
وگرنہ شورشِ محشر تمہارے در سے کیا واقف

اسیرِ جاں نثاری طرزِ آزادی کو کیا سمجھے
گرفتارِ محبت رسمِ بال و پر سے کیا واقف

نہ ہو دل جس کے پہلو میں وہ کیوں جاں کا خطر رکھے
نہ ہو سر دوش پر جس کے وہ بارِ سر سے کیا واقف

شہادت کی ہو گر کچھ قدر تو واعظ مرے بت پر
گلوے خشک مغز ، آبِ دمِ خنجر سے کیا واقف

نہ ہو سوز آشنا جب تک گدازِ دل کو کیا سمجھے
نہ ہو جو تشنہ لب بے حس وہ چشمِ تر سے کیا واقف

خضر کیسا قضا بھی میری منزل میں نہیں آتی
کہ جس کی راہ ہو گم گشتگی رہبر سے کیا واقف

نہیں گر افترا واعظ بیاں تیرا تو پھر کیا ہے
نہ جائے جو کہ اس کوچے میں وہ محشر سے کیا واقف

قلق یہ معنیِ باریک تیرے کیا کوئی سمجھے
رگِ خوابِ حریفاں کاوشِ نشتر سے کیا واقف

ردیف القاف

۹۳

تجھے کل ھی سے نہیں بے کلی نہ کچھ آج ھی سے رھا قلق
تری عمر ساری یوں ھی کٹی تو ھمیشہ یوں ھی جیا قلق
ھوا دل کے جانے کا اب یقیں، کہ وہ درد بر میں مرے نہیں
نہ وہ اضطرابِ قضا کہیں نہ وہ حشر خیزِ بلا قلق
مجھے حشر کر دیا بیٹھنا مجھے قہر ھو گیا ٹھہرنا
ھے بسانِ صبر گریزپا نہیں غم گسار مرا قلق
اُنھیں نالہ کرنے کا رنج کیا، اُنھیں آہ بھرنے کا رنج کیا
اُنھیں میرے مرنے کا رنج کیا اُنھیں میرے جانے کا کیا قلق
یہی رشک نے دیے مشورے کبھی پردہ اُن کا نہ کھولیے
مرے جی ھی جی میں پھرا[1] کیے مرے دل ھی دل میں رھا قلق
نہ تو روے غیر نہ گھر رھے نہ شبِ فراق میں مر رھے
نہ وفا کرے نہ ستم سہے نہ جفا ھوئی نہ ھوا قلق
نہ وہ میں رھا نہ وہ تو رھا نہ وہ آرزو نہ وہ مدعا
ھوا زندگی کا بھی فیصلہ مگر ایک تیرا رھا قلق
رھے لاکھ صدمے نفس نفس جیے کیوں کہ کوئی پراے بس
شبِ وصل مرنے کی تھی ھوس، شب ھجر جینے کا تھا قلق
نہیں چین اُن کو بھی ایک دم کہ ھے فکرِ جور کا غم سا غم
ھوئے مجھ پہ روز نئے ستم رھا اُن کو روز نیا قلق

---

۱ - 'بھرا' اصل متن صفحہ ۸۵ میں (مرتب)

کرے ربط کوئی کسی سے کیا کہ اٹھا طریق نباہ کا
نہ کرے گی تجھ سے وفا جفا ، نہ کرے گا مجھ سے وفا قلق
میں جلا تو شعلے میں جوش تھا جو ہوا میں خاک ہے زلزلہ
میں ہزار شکل بدل چکا پہ کسی طرح نہ چھپا قلق
نہیں تیرے پھرنے کا کچھ گلہ کہ زمانہ سارا بدل گیا
جو شبِ وصال میں چین تھا وہی روزِ ہجر بنا قلق
وہ ہے التفات دمِ ستم کہ زیادہ اس سے نہیں کرم
مرے چاکِ دل کا رفو الم مرے دردِ جاں کی دوا قلق
گئے واں بھی پر نہ گھٹا الم چھٹے سب سے پر نہ چھٹا الم
مرے پاس سے نہ ہٹا الم مرے ساتھ سے نہ ٹلا قلق
ابھی تھا صلائے زن سبق ابھی تھی کتاب ورق ورق
کبھی مدرسے میں رہا قلق کبھی میکدے میں رہا قلق

۹۴

هر عداوت کی ابتدا ہے عشق
کہ محبت کی انتہا ہے عشق

لو زلیخا کو کب ہوا ہے عشق
کس قدر طاقت آزما ہے عشق

فلک و مدعی و یار و اجل
سب بھلے ہیں مگر برا ہے عشق

دیکھیے اس کا ہوگا کیا انجام
اب خدا سے ہمیں ہوا ہے عشق

ہوچکا ہم سے کچھ جو ہونا تھا
تو نے یہ حال کیا کیا ہے عشق

وامق و قیس و کوہ کن کیا تھے
اجل و آفت و بلا ہے عشق

دیکھنا شوق و شرم کا شیوہ
حسن خود بیں ہے خود نما ہے عشق

کون جانے تھا اس کا نام و نمود
میری بربادی سے بنا ہے عشق

دل کرو خوں تو کیا ہے دل داری
جاں جاتی رہے تو کیا ہے عشق

غم زدائی میں غم فزا کیا کچھ
دلربایانہ جاں ربا ہے عشق

با وفا وہ ہیں بے وفا ہے حسن
بے وفا ہم ہیں با وفا ہے عشق

غمزہ سا غمزہ غم میں کرتا ہے
کچھ سے کچھ اب تو ہو گیا ہے عشق

کیسے کیسوں کی اس نے لی ہے جاں
دیکھنا کیا ہی خوش ادا ہے عشق

کیوں کے ماتم نہ اب وفا کا رہے
میرے مرتے ہی مر مٹا ہے عشق

دیکھنا مرگ و زیست کے جھگڑے
جاں فزا حسن و جاں گزا ہے عشق

ویسا ہی ہے فرشتہ جیسی روح
اے **قلق** تیرا آشنا ہے عشق

۹۵

ہو جدا اے چارہ گر ہے مجھ کو آزارِ فراق
بے وصال اچھا ہوا بھی کوئی بیمار فراق

شوخیِ پردہ نشیں کی عشوہ سازی دیکھنا
دل ہے بد مستِ وصال اور دیدہ بیدارِ فراق

ایک نالے میں پھرے گا مہر و مہ کو ڈھونڈتا
اے فلک مت چھیڑ مجھ کو ہوں عزادار فراق

وصل تھی میری سزا ہجر انتقامِ غیر تھا
کب ہوا خو کردۂ ہجراں گرفتارِ فراق

کوئی کرتا ہے خطا اور کوئی پاتا ہے سزا
غیر گستاخِ وصال اور میں سزاوارِ فراق

دم بہ دم بجلی گرے یا نہرِ خوں جاری رہے
التیام اس سینے کا کیا جو ہے افگارِ فراق

آنکھ کب لگتی ہے حیلے سے جو تجھ سے لگ گئی
داستانِ وصل کب سنتا ہے بیدارِ فراق

دام میں صیاد کے کیوں کہ نہ بلبل مر رہے
دامنِ ہر برگِ گل میں تھا نہاں خارِ فراق

سو بہار آئے مگر جاتا ہے کوئی داغِ دل
لالہ و گل کا نہیں مشتاق خوں بارِ فراق

اب قلق ٹھوکر سے تیری جی چکا مرنے کے بعد
آشنائے وصل کب ہو نازِ بردارِ فراق

ردیف الکاف تازی

۹۶

نہ پہنچے ہاتھ جس کا ضعف سے تا زیست دامن تک
سراغِ خوں اب اُس کا مر کے جائے خاک گردن تک

سر و ساماں سے ہیں یہ بے سر و سامانیاں اپنی
کہ ہے جوشِ جنوں میرا گریباں گیر دامن تک

نہ کی غفلت سے قدرِ دل، عبث الزام دل بر پر
متاعِ خفتہ کے جانے کے سو رستے ہیں رہزن تک

یہ حیلہ بھی نہیں کم موت کے آنے کو گر آئے
نہ آئے جو کہ بالیں پر وہ کیا جائے گا مدفن تک

کچھ ایسا اختلاط آپس سے اٹھا اس زمانے میں
نہ قاتل آئے ہے مجھ تک نہ جائے موت دشمن تک

مری محنت کا ضائع ہونا ہی تو اک قیامت ہے
کہ باد و برق آفت میں رہیں گے میرے خرمن تک

وفا کی نذر ہے میری ہی جانِ حسرت آلودہ
اثر کی قدر ہے میری ہی آہِ قافلہ زن تک

غبارِ دل کسی ڈھب سے نہ قاتل کا ہوا ثابت
کہ صاف اُس کی ہوا کی تیغ مجھ سے میرے کشتن تک

میں اپنے حوصلے سے اور وہ اپنے جامے سے باہر
نہ خنجر کا اُسے کھٹکا نہ یاں صرفہ ہے گردن تک

نہیں ہوتا رفو چاکِ گریبانِ فنا ہرگز
منگائیں چرخِ چارم سے اگر عیسیٰ کی سوزن تک

گراں جانی چمن میں بھی نشانہ ہو گئی آخر
کہ بارِ دوشِ گلبن ہے مری شاخِ نشیمن تک
قلق مرتا ہے اور ہوتا ہے ماتم کا یہ ہنگامہ
مگر رونا ہے اس کا تو نہ آیا بزمِ شیون تک

۹۷

ناصح کی بات بات میں ہے کیا بلا نمک
زخمِ دل و جگر میں مرے بھر دیا نمک
دل ہی نہ ہو برشتہ تو باتوں میں کیا نمک
سچ ہے کہ بے کباب ہے کس کام کا نمک
دشنام کے سوا نمکیں لب پہ کچھ نہیں
لو زہر بختِ تلخ کی دولت ہوا نمک
اے تند خو کہاں نمکین لب وہ خوش مزہ
یعنی کہ تیز تیری زباں سے ہوا نمک
تھا زہر لب جو خندۂ شیریں شبِ وصال
زخمِ جگر میں صبحِ جدائی بنا نمک
ہے تلخ اپنی زیست سے تیرا جگر فگار
کافور دونوں ہو گئے کیا مشک کیا نمک
چنوائے گا فلک اسے پلکوں سے عاقبت
ہر جائے اشکِ شور نے پھیلا دیا نمک
کب تک نہ زخم خوردۂ لب زہر کھائیں گے
یہ قحط ہے کہ مشک کی قیمت بکا نمک
بہرِ مذاقِ خلق کیا خود کو آب آب
میرے گدازِ دل ہی سے شاید بنا نمک

اهلِ مذاق کے لیے لذت ضرور ہے
شبنم نے چاکِ سینۂ گل میں بھرا نمک
بسمل ہوں دے بیاض دل و دیدہ سے متلون
ہے اے قلق سخن میں ترے کیا بلا نمک

۹۸

جی سے ہی اپنے جاؤں آنا ہے کون یاں تک
رونا بھی آخر آوے فرمائیے کہاں تک
کیوں کر نہ سر کشی کی تہمت ہمارے سر ہو
فریادِ عجز تک بھی پہنچی ہے آسماں تک
راہِ عدم کی سختی بتلائے کوئی کیوں کر
واماندگی ہے یاں تک ہلتی نہیں زباں تک
بجلی کا روز گرنا ، ہر لمحہ ابر گھرنا
صرصر کا گرد پھرنا اک میرے آشیاں تک
دامن پکڑ ہی لیں گے آخر کو رفتہ رفتہ
مر کر تو خاک اپنی پہنچے گی آستاں تک
رہنے دے ہم کو چپ ہی اے داورِ قیامت
کیا حالِ دل کہیں گے افگار ہے زباں تک
واعظ تمھارا حیلہ کیا خوب بن پڑا ہے
یہ شکر کی جگہ ہے آئے درِ مغاں تک
دشوار یاں تحمل اور واں وہی تغافل
جینے کی تاب کس کو مرنے کے امتحاں تک
ناصح کی غم گساری مجھ کو بھی دیکھنی ہے
لے جائے کوئی اس کو اس آفتِ جہاں تک

ناچار صبر ٹھہرا اب دردِ نا صبوری
بے تاب رہ چکے ہیں ہم طاقت و تواں تک

مجبور ہے بشر گو ، پر اے قلق نہ چوکو
اپنا سا کر ہی گزرو جو تم سے ہو، جہاں تک

۹۹

ہے اس کی بزم میں رندِ خراب ایک پہ ایک
چھڑک رہا ہے شراب و گلاب ایک پہ ایک

گھٹائے جائے گا تا چند ماہ و مہر کو تو
بڑھائے جائے گا کب تک نقاب ایک پہ ایک

اٹھائے جاتی ہے رسوائی پردے پردے کو
کہ ڈالے جاتی ہے غفلت حجاب ایک پہ ایک

یہ اتفاق ، یہ صحبت کہاں ، کہاں جنت
یہ دیر ہی میں ہے مستِ خراب ایک پہ ایک

دل و جگر کے تو ہے پارے پارے سے فریاد
کہ خوردہ گیر ہے روزِ حساب ایک پہ ایک

کرشمہ سنجیِ مستی سے بد مزہ ہے ادا
کہ چشم و زلف ہیں پر پیچ و تاب ایک پہ ایک

نہ چھیڑ اٹھائیے واعظ قلق سے ، چپ رہیے
دھری رہے گی وگرنہ کتاب ایک پہ ایک

۱۰۰

نہ جائے گا سر و سودا مرا زنہار گردن تک
رہے گا خم بہ خم گیسو گلے کا ہار گردن تک

سرِ اہل نظر کیوں بار ہوتا دوشِ عالم پر
بنی ہوتی اگر گھر کی تری دیوار گردن تک

ہمیں نیچا دکھایا آسماں نے کس قرینے سے
کہ ظالم نے بنایا ہے قدِ دل دار گردن تک

بہ جائے خلد مےخانہ بنانا تھا کہ کیا حاصل
اگر شیر و شکر میں غرق ہوں مےخوار گردن تک

تمھیں کیا کیا نہ آیا پر نہ آیا کامِ ناکامی
نہ آیا ایک دن بھی خنجرِ خواں خوار گردن تک

ہوئیں جب تک نہ بند آنکھیں نگاہوں سےگرا رکھا
آٹھایا اتہامِ سرکشی سو بار گردن تک

میں خود ہو جاؤں اپنا طوقِ گردن اے گراں جانی
نہ ہوں گر ہاتھ اٹھنے ضعف سے دشوار گردن تک

مخالف اور موافق کا ہے مجمع میری ہستی پر
کہ ہے تیغ و رسن کی گرمیِ بازار گردن تک

جو سر آترے تو بارِ ناتواں آترے ترے دل سے
مجھے درکار تو خنجر تجھے درکار گردن تک

لیا تو نے قلق کیوں سر پہ خوں اپنی طبیعت کا
نہ سر مار اس زمیں میں سخت ہے گفتار گردن تک

۱۰۱

اے ستم آزما جفا کب تک
کشتۂ زندگی وفا کب تک

گرمیِ کوششِ جفا کب تک
دعویِ شہرتِ وفا کب تک

اے دلِ زھدخو ریا کب تک
نامرادانہ مدعا کب تک

ایک میں مل گیا خدا مارا
یوں نباھے گا دوسرا کب تک

امتحاں پر یہ امتحاں تا چند
آزما ، آزمائے گا کب تک

حسرت آئے گی دم میں سو سو بار
اے ہوس شورِ مرحبا کب تک

قدرتِ صبر عاقبت کتنی
جرأتِ طاقت آزما کب تک

تم سمجھ جاؤ میری خاموشی
نہ کہوں کہیے مدعا کب تک

کیجیے اب مرے نباہ کی فکر
یارِ صبرِ گریزپا کب تک

خواب میں بھی وہ آئیں گے تا چند
میں ملا بھی تو یوں ملا کب تک

دل میں کب تک تمہارے کھٹکوں گا
چشمِ دشمن میں میری جا کب تک

تندرستیِ دل ہے بے جانی
دردِ بے درد کی دوا کب تک

ترک کی صاف اس نے گویائی
نرگسِ سرمہ سا خفا کب تک

اے دلِ بے قرار و بے آرام
نالہ تا چند ، تا کجا ، کب تک

اے قلق وصل میں بھی ہوں ناشاد
طالعِ نارسا ، رسا کب تک

ردیف الکاف فارسی

۱۰۲

اتنے بجھے کہ دی ہوسِ خشک و تر میں آگ
ناسورِ دل میں شعلے ہیں ، داغِ جگر میں آگ

کیا کیا بھڑک رہی ہے دلِ پر شرر میں آگ
اے شعلہ خو لگاتا ہے تو کس کے گھر میں آگ

حرفِ مرادِ غیر کا نقشہ نہ کیوں جمے
تو لمحہ بھر میں موم ہے اور لمحہ بھر میں آگ

اے شرمِ ضبط اب بھی نہیں ہے تو آب آب
لگتی ہے خود بہ خود مرے دیوار و در میں آگ

اس شعلہ خو سے آتشِ دل خاک جل بجھے
لگتی نہیں شرار ہے جیبِ شرر میں آگ

کب تک دلِ رقیب کو ٹھنڈا کرو گے تم
اور کب تلک رہے گی دبی میری بر میں آگ

اے شمع جل بجھے گی بھڑک کر تو ہی اخیر
لگتی کسی طرح نہیں رختِ سحر میں آگ

یوں حشر داغ ماتمِ احباب سے ہوں میں
جیسے نشانِ قافلہ ہے رہ گذر میں آگ

لے اے فلک خنک دلِ اغیار ہی کو رکھ
دے اے فغانِ یاس آمیدِ اثر میں آگ

اے چرخ مت جلا شبِ ہجراں میں رحم کر
اے جوشِ ماہتاب نہ دے میرے گھر میں آگ

جل جل کے اے قلق تو ہوا ڈھیر راکھ کا
کب سے سلگ رہی تھی دلِ بے خبر میں آگ

ردیف اللام

۱۰۳

کس قدر دل ربا نما ہے دل
خانۂ غیر ہو گیا ہے دل

ہر گھڑی کیوں نہ زلزلے میں رہے
مشہدِ حسرت و وفا ہے دل

موت بھی سہل کچھ نہیں اپنی
کس لیے طاقت آزما ہے دل

مصلحت اس میں ہو نہ[1] کوئی کاش
دشمنِ جان ہو گیا ہے دل

سب سے لگ چلنے کی ہوئی ہے خو
کس قدر صرفِ[2] آشنا ہے دل

شیخ صنعاں کا یاد ہے قصہ
سخت کافر ، بری بلا ہے دل

اپنی حالت میں مبتلا ہوں آپ
دل ربا جاں ہے ، جاں ربا ہے دل

بسل بے واماندگی کی تیز روی
جیسے جانے پہ آ گیا ہے دل

کس جفا کار کی وفا ہے جان
کس ستم کش کا مدعا ہے دل

تیری اُلفت کا نقد داغِ جگر
میری حسرت کا خوں بہا ہے دل

کہیے کس سے لگا لیا لگّا
اے قلق کیوں کے لگ چلا ہے دل

۱۔ یہ مصرع اصل متن (۹۳) میں غیر موزوں ہے :
مصلحت اس میں ہو کوئی کاش
کوئی سے پہلے 'نہ' اضافہ کرکے تصحیح قیاسی کی گئی ہے -
مرتب

۲۔ ن : یار -

۱۰۴

جز موجِ پیچ و تاب نہیں ماجرائے دل
گردابِ رست خیز ہے پیکر نمائے دل

آزار ہے جو عشق تو آزار ہی سہی
اتنا کسے دماغ جو کیجے دوائے دل

اک ربط ہے کسی سے مگر مجھ سے سو عناد
جو طور آپ کے ہیں وہی ہے ادائے دل

تیرا فسانہ ہے مرے نوحے کے ساتھ ساتھ
لب پر ہے ہائے جاں تو زباں پر ہے ہائے دل

ایسی پڑی ہے کچھ کہ اٹھے حوصلے کے پاؤں
جی بیٹھ ہی گیا ہے کہاں تک اٹھائے دل

چلتا ہی ہو گیا وہ چرا کر نگاہ کو
کہتا ہی رہ گیا میں کھڑا ہائے ہائے دل

یہ ہی ہے وہ مکاں جسے کہتے ہیں لا مکاں
ہے انتہائے ہر دو جہاں ابتدائے دل

غماز ہی سے ضبط، نہ ہم راز ہی سے ربط
مطلب سے آشنا ہی نہیں مدعائے دل

عالم کی باز گشت ہے مقصود کے خلاف
عشرت برائے غم ہے تو غم ہے برائے دل

رکھتی ہے آدمی کو مروت شریکِ درد
دلبر کا بھی خیال نہیں ہے سوائے دل

نالہ سکوتِ غیر سے رکتا نہیں **قلق**
تحسین و آفریں نہیں کچھ مدعائے دل

۱۰۵

کوئی بھی مرحلہ نہیں تسکیں فزائے دل
کیوں خستگیِ سعی ہے زنجیرِ پائے دل

بنتا ہے بعد گرنے کے قصرِ خرابِ عشق
مٹتا ہے پہلے کھچنے سے نقشِ وفائے دل

واماندگی ہے قافلۂ عشق کا نشاں
برجستگیِ رنگ ہے شورِ درائے دل

دم بھر جو چین خواب میں ہی آئے کیا مجال
جب سے نگاہِ ناز ہے صبر آزمائے دل

لگتا ہے بے دلی سے پتا کچھ تو دل بھی تھا
ہر جزوِ دل پکارتا ہے ہائے ہائے دل

کثرت ھجوم شوق ہے وحدت ادائے حسن
ہے نفیِ ماسوا سے غرض ماورائے دل

جب مدعی کو تیری عداوت کا ہو یقیں
میری طرح سے کاش کے تجھ پر ھی آئے دل

بزم فراغ اپنی ہے آشوب گاہِ غم
عشرت کدہ تمہارا ہے ماتم سرائے دل

نیرنگیِ خیال و طلسم وبال ہوں
کس اعتماد پر کوئی مجھ سے لگائے دل

ظاہر ہے میری اھلِ دلی بے دلی میں بھی
ہر جزوِ۱ دل پکارتا ہے ہائے ہائے دل

۱- یہ مصرع بجنسہ شعر نمبر ۵ کا مصرع ثانی ہے۔ (مرتب)

یکتائی کا فریب ہے بہرِ ہجوم شوق
تا بعد ازیں کسی کا کسی پر نہ آئے دل

کیا جانیے قلق کی ثقاہت کو کیا ہوا
سینے پہ اُس کا ہاتھ تھا اور لب پہ ہائے دل

۱۰۶

بلبل نہ کس طرح ہو نثارِ ادائے گل
ہر گریے کے جواب میں سو خندہ ہائے گل

فطرت پہ کر نگاہ نہ سوئے عروج دیکھ
ہر فرقِ شاخ ہے پئے پامالِ پائے گل

رنگِ چمن ہے گریۂ بلبل پہ خندہ زن
پامالِ اضطراب ہے ہر گل، قفائے گل

اٹھتے ہی اک نگاہ کے سو رنگ اُڑ گئے
جز داغِ لالہ کوئی نہیں آشنائے گل

ہر برگ زرد رنگ ہے، ہر غنچہ لال[1] منہ
کیجیے تو کس نشاط پہ کیجیے ہوائے گل

ہر بزم بعدِ بزم ہے شیون کا اہتمام
داغِ بہارِ رفتہ ہے ہر گل بہ جائے گل

اک غم سے تیرے لاکھ خوشی کے لگاؤ ہیں
داغِ جگر سے اپنے ہے نشو و نمائے گل

۱- اصل متن (صفحہ ۹۵) لعل - (مرتب)

ردیف المیم

۱۰۷

زور آزمائی کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم
اپنے ہی بارِ دوش ہیں واماندگی سے ہم

ملتے ہیں تیرے واسطے اب مدعی سے ہم
پھرتے ہیں کیسے کیسے خوشی نا خوشی سے ہم

کیا ایسے ہی ذلیل تھے پہلے بھی چاہ سے
احوال اپنا پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

یاد آگئیں جو شب کو تری بے حجابیاں
سایے میں اپنے چھپ گئے شرمندگی سے ہم

اے بختِ ہرزہ گرد سفر میں ہے کیا دھرا
پھرتے ہیں اپنے شہر میں بھی اجنبی سے ہم

ڈالو بھی خاک غیر کی صورت پہ تم کہیں
مرجائیں تاکہ رشک میں دب کر اسی سے ہم

کہتے ہیں بے خبر ہمیں احباب و اقربا
کیا ہم پہ اب گزرتی ہے پوچھیں کسی سے ہم

تم ہو نہ اپنے بس میں نہ ہم اپنے ضبط میں
مجبور تم ہو غیر سے ناچار جی سے ہم

ہے رحم کی جگہ جو کچھ انصاف دل میں ہو
دامن ترا پکڑتے ہیں کس سادگی سے ہم

ہر پائمال نالہ کناں ہوگا ساتھ ساتھ
لے کر اٹھیں گے حشر کو تیری گلی سے ہم

کس نے سنگھایا عطر کہ گیسو ہوئے ہلا
اب ہوش میں نہ آئیں گے ہرگز غشی سے ہم
رستے میں عمرِ رفتہ گئی چھوڑ کر قلق
اب[1] اپنے بارِ دوش ہیں واماندگی سے ہم

۱۰۸

اے خارِ خارِ حسرت کیا کیا فگار ہیں ہم
کیا حال ہوگا اس کا جس دل میں خار ہیں ہم
ہر چند دل میں تیرے ظالم غبار ہیں ہم
کتنے دبے ہوئے ہیں کیا خاکسار ہیں ہم
کیا جانے کیا دکھائے کم بخت رازِ دشمن
بے اختیار ہو تم اور بے قرار ہیں ہم
واں شوخیوں نے مارے ناکام کیسے کیسے
یاں سادگی سے کیا کیا امیدوار ہیں ہم
نے رخت میکدے میں نے کعبے کا ارادہ
ہیں دل لگی کے بندے یاروں کے یار ہیں ہم
واں سرگزشتِ دشمن وہ کہہ رہے ہیں منہ پر
یاں بے خودی ہے اس پر کیا راز دار ہیں ہم
ساقی تری نگاہیں کب تک رہیں گی پلٹی
ہے نشہ زاہدوں کو اور بادہ خوار ہیں ہم
کعبہ ہے سنگِ بالیں زہادِ خفتہ دل کا
اور مے کدے کے اندر شب زندہ دار ہیں ہم

---

(۱) مطلع اول کا مصرع ثانی بہ ادنٰی تغیر مقطع کا مصرع ثانی بنا لیا ہے۔ (مرتب)

اللہ رے ظرف دل کا سب کی جگہ ہے اس میں
بے غم رہے ہے دشمن کیا غم گسار ہیں ہم
اے حشر بچ کے چلنا اے چرخ ہٹ کے گرنا
ہے برق سایہ جس کا وہ خار زار ہیں ہم
اتنی خلش مژہ کی اب بڑھ گئی کہ گویا
زخم دلِ عدو میں خنجر گزار ہیں ہم
کب تک رہے گا دشمن جامے سے اپنے باہر
ہو آگ آگ جس سے تم وہ شرار ہیں ہم
دشمن کی جیب میں تم صبر و شکیب میں ہم
تم دستِ کوتہی ہو پارے نگار ہیں ہم
وادیِ جستجو سے گزریں تو کیا عجب ہے
وارفتہ کیسے کیسے لیل و نہار ہیں ہم
کیا بادۂ جوانی مرد آزما نشا تھا
اب اے قلق وبالِ خواب و خمار ہیں ہم

۱۰۹

اس پر مٹے ہوئے ہیں تجھ پر نثار ہیں ہم
گر بادِ تند ہے تو مشتِ غبار ہیں ہم
دشمن کی مصلحت سے خود رازدار ہیں ہم
تا امتحاں ہو کتنے بے اعتبار ہیں ہم
خوابِ وصال گھٹ کر آخر خیال ہوگا
اے شوق بڑھ نہ اتنا نا کردہ کار ہیں ہم
مانندِ سرمہ پس کر ہر چشم میں جگہ کی
پر ہیچ ہر نظر میں کیا خاکسار ہیں ہم

گرتے ہیں خاک پر ہم سائے سے اپنے پہلے
ناوک رسیدہ کس کے لاغر شکار ہیں ہم
یک لمحہ جس نے دیکھا دل تھام تھام دیکھا
کس نخلِ ماتمی کی یا رب بہار ہیں ہم
کیوں تم ستا ستا کر ایذا اٹھا رہے ہو
آنکھوں میں خار ہیں ہم دل میں غبار ہیں ہم
کیا بوالعجب ہے دنیا ہر بات پر عجب ہے
خاموشیوں سے شورِ شہر و دیار ہیں ہم
ہر لمحہ سینہ کوبی ہے زندگی ہماری
دریائے بے خودی میں موجِ کنار ہیں ہم
پیتے ہو مے دما دم غیروں کے ساتھ واں تم
اور یاں صدائے قلقل سے سنگ سار ہیں ہم
مایہ دل و جگر کا ٹپکا نچڑ نچڑ کر
سختیِ جاں سے گویا مشتِ فشار ہیں ہم
ہے زندگی ہماری گویا فریبِ غمزہ
مایوس چارہ گر ہیں امیدوار ہیں ہم
ہم تجھ پہ مر رہے ہیں جیتے ہیں اس سے ورنہ
جاں تک ہے بار اب تو ایسے نزار ہیں ہم
مقدور تک تو روکا صبرِ گریز پا کو
کیا اختیار خود پر بے اختیار ہیں ہم
اٹھیے **قلق** بس اٹھیے کوچے کو اس کے چلیے
کیا سوچ ہے اجل پر اب تو سوار ہیں ہم

۱۱۰

کیا آکے جہاں میں کر گئے ہم
اک داغ جگر پہ دھر گئے ہم
مہماں جہاں تھے ایک شب کے
شام آئے تھے اور سحر گئے ہم
جوں شمع تمام عمر روئے
ہر بزم سے چشم تر گئے ہم
اپنی ہی نظر نہیں وگرنہ
تو ہی تھا ادھر جدھر گئے ہم
نالے میں اثر تو کیوں نہ ہوتا
پر تیرا لحاظ کر گئے ہم
ہم جانتے ہیں کہ تو ہے ہم میں
گو ڈھونڈنے در بہ در گئے ہم
جھگڑا تھا جو[1] دل پہ اس کو چھوڑا
کچھ سوچ کے صلح کر گئے ہم
اس دشت کے خار و خس سے بچ کر
جوں بادِ سبک گزر گئے ہم
تھیں لطف سے دل میں جرأتیں کچھ
پر تیرے غضب سے ڈر گئے ہم
حسرت ہی سے ہم بنے تھے گویا
آنکھ اٹھتے ہی اٹھتے مر گئے ہم
دیرینہ رفیق تھا **قلق** ہائے
وہ کیا ہی موا کہ مر گئے ہم

۱- مصرع ساقط الوزن تھا ۔ ”جو“ تصحیح قیاسی ہے ۔ (مرتب)

۱۱۱

خدا سے ڈرتے تو خوفِ خدا نہ کرتے ہم
کہ یادِ بت سے حرم میں بکا نہ کرتے ہم

جو رشکِ ذوق کو پہلے سے جانتے ہوتے
نگاہِ شوق کو یوں آشنا نہ کرتے ہم

جہاں ہے شکرِ عداوت نہ کرنے پر شکوہ
وہاں پہ غیر کا کیوں کر گلا نہ کرتے ہم

جفا کو اب وہ کرے کیوں کہ اس نے جان لیا
خوشیِ مرگ میں رنجِ وفا نہ کرتے ہم

دریغ ظلم میں کیوں کر بھلا نہ کرتے تم
نشاطِ جور میں جاں اور فدا نہ کرتے ہم

کبھی نباہ نہ کرتے جفا ہی کو کرتے
کہ جان دے کے بھی ترکِ وفا نہ کرتے ہم

اگر نصیب میں ہوتا شریکِ درد کوئی
تو کس طرح سے تمھیں آپ سا نہ کرتے ہم

یقیں نہ تھا کہ کسی سے بھی وہ وفا کرتا
پھر اس پہ جان بھی نذرِ جفا نہ کرتے ہم

جو عمرِ خضر بھی دیتے تو رائگاں جاتی
تمھاری زلف کا کیا کیا فسانہ کرتے ہم

کسی کو حشر میں گر دیکھتا کوئی تو ضرور
دلِ نگار دکھاتے حیا نہ کرتے ہم

قلق وہ دل میں گر آتے تو یہ چھپاتے راز
کہ کوئی کام کبھی دل کشا نہ کرتے ہم

۱۱۲

آپ کے محرم اسرار تھے اغیار کہ ہم
دل غم ناک کے تم رہتے تھے غم خوار کہ ہم
شکوہ آلود نصیحت نہیں اچھی ناصح
آپ ہیں کشتۂ بیداد ستم گار کہ ہم
حشر اگر کہوے مددگار ہمارا ہے کون
بول اٹھے صاف ترا فتنۂ رفتار کہ ہم
آپ کی شان کا سامان کہاں سے آیا
یوسف حسن کے تھے آپ خریدار کہ ہم
ہم برا غیر سے ملنے کو سمجھتے تھے کہ تم
اپنے مطلب کے ہیں اغیار طلب گار کہ ہم
ہائے ۔ رحمی دلدار سے بےقدری جان
زیست سے آپ ہماری ہوئے بیزار کہ ہم
جانتے ہم ہیں برا ربط جتانے کو کہ غیر
ہوں گے مشہور ہوس ناک ترے یار کہ ہم
قتل کیا ہو کوئی خنجر میں نہیں طرز نگاہ
داد اے عشق ہے جلاد گنہگار کہ ہم
نہ محبت کی خبر اس کو نہ ہم کو اس کی
سادگی کہہ تو سہی یار ہے عیار کہ ہم
روز و شب میرے پھرانے کو پھرے جاتا ہے
چرخ ہے گردش بیکار سے ناچار کہ ہم
ہو کے پامال ٹھکانے سے لگی خاک اپنی
تو ہے آشفتہ سر کوچہ و بازار کہ ہم

ان کو تم چاھتے ھو ، آپ کو ھم چاھتے ھیں
لائقِ رحم ھیں فرمائیے اغیار کہ ھم

اے قلق پاؤں زمیں پر نہیں رکھتا مغرور
چرخ ھے خاکِ درِ حیدرِ کرار کہ ھم

۱۱۳

نقشِ بر آب نام ھے ، سیلِ فنا مقام
اس خانماں خراب کا کیا نام کیا مقام

ھر روز تازہ منزل و ھر شب نیا مقام
مہلت نہیں قیام کی دنیا ھے کیا مقام

جا مل گئی جسے تری دیوار کے تلے
ھے اس کو گورِ تنگ بھی اک دل کشا مقام

ڈرتے ھیں ھم تو نام بھی لیتے ھوئے ترا
تو ھی بتا کہ پوچھیے کیوں کر ترا مقام

انسان کی سرشت میں ھے عذرِ لنگِ ضعف
ثابت ھوا کہ دور ھے مجھ سے مرا[1] مقام

اندازہ ھی غلط تھا مگر امتیاز کا
یعنی محل غیر ھی تھا آپ کا مقام

کھلتا نہیں[2] کبھی ، نہ کبھی صاف ھی رھے
کس طرح ھو ثبوت کہ دل ھے ترا مقام

۱- ' سرا ' اصل متن (صفحہ ۱۰۰) میں ۔ ' مرا ' تصحیح قیاسی -
(مرتب)

۲- ' کھلتا ھے ' اصل متن (صفحہ ۱۰۰) میں ' جس سے مصرع ساقط الوزن ھے ۔ ' کھلتا نہیں ' تصحیح قیاسی (مرتب)

واعظ منازعت کا سبب مجھ میں تجھ میں کیا
مسجد ترا محل ہے مرا مے کدہ مقام
یاں واں، ادھر آدھر یوں ہی گر پڑ کے کی[1] بسر
مثلِ غبارِ راہ رہا جا بہ جا مقام
اے اہلِ دیر ذکرِ حرم تم سے کیا کریں
پوچھو بتوں ہی سے کبھی کعبہ بھی تھا مقام
کیا کیا بیاں جہاں کے کریں امن و چین کو
اُس کے بھی در پہ اپنا تو مدت رہا مقام
کیا جانیے **قلق** کہ ارادہ ہے اپنا کیا
مطلب سے کچھ سفر نہ سرِ مدعا مقام

ردیف النون

۱۱۴

طرزِ نگہ یہ جامے سے باھر نقاب میں
رسوائیاں حجاب طلب ھیں حجاب میں
ہے زلزلے میں گاہ، گہے اضطراب میں
اُس کی بلا رہے دلِ خانہ خراب میں

۱- مصرع ناموزوں اصل متن میں تھا - 'کی' اضافہ کر کے تصحیح قیاسی کی گئی - (مرتب)

ناسور جتنے ہیں دلِ پُر اضطراب میں
اُتنے ہی رخنے ہوں گے تمھاری نقاب میں
آنا ہے اُن کا آتے ہی جانے کے واسطے
درماندہ حشر ہے کشش و اضطراب میں
ہے آتشِ قدم سے مری دشت فرقِ طور
سایے سے میرے آگ لگے ماھتاب میں
غم خوار آسماں بھی سہی، پر ہے جاے شک
پھرتا ہے ساتھ ساتھ مرے پیچ و تاب میں
کیوں کر نہ اپنا سر رہے اپنے ہی پاؤں پر
سنتے ہیں اُس کا گھر دلِ خانہ خراب میں
غیروں کو ہونٹ چاٹتے ہم دیکھتے کبھی
ہوتا مزہ جو تیرے دھن کے لعاب میں
ساقی بھی آب آب ہے برگشتہ بخت سے
دریا ہمیشہ خشک ہے جامِ حباب میں
عالم مگر فریب کے اندر فریب ہے
ہر تشنہ غرقِ آب ہے موجِ سراب میں
حالِ زبوں نے اُس کے بھی اوسان کھو دیے
اغیار سے سوال ہے خط کے جواب میں
کس نے اُنھیں فسانۂ یوسف سنا دیا
اب بھول کر بھی وہ نہیں آنے کے خواب میں
خالی بسرِ رقیب، نہ پیمانہ میرا پُر
حسرت بھری کہاں سے جہانِ خراب میں
واعظ کر اهلِ زهد کا تو بھی تو امتحاں
سب کا عیار کھلتا ہے بزمِ شراب میں

بے پردگی کے واسطے پردہ ہے آپ کا
یعنی کہ کچھ حجاب نہیں ہے حجاب میں
پچھتا رہا ہوں میں بت و بت خانہ چھوڑ کر
امیدِ خلد نے مجھے ڈالا عذاب میں
یہ انتظار میں مری صورت بدل گئی
قاصد ہے خط کو دے کے مجھے اضطراب میں
اڑتے ہیں ساتھ رنگ کے میرے حواس خلق
ہے انقلاب سے مرے چرخ انقلاب میں
طرزِ ادائے ناز ہے ہر شیوۂ ستم
میں محوِ التفات وہ بے خود عتاب میں
یاران نکتہ یاب سے چل کر ملو قلق
ہیں دقتوں سے لفظ و معانی عذاب میں

۱۱۵

جیتا ہوں ذوقِ دل سے مرے تن میں جاں نہیں
انبارِ شکوہ لب پہ ہے، لیکن فغاں نہیں
ٹلنے کا میرے سر سے کبھی آسماں نہیں
کس کس کا سدّ راہ، تیرا آستاں نہیں
گو ہے جنوں کا جوش ادب کا مگر ہے ہوش
سر کوبیاں وہاں ہیں جہاں آستاں نہیں
ممکن نہیں کہ حشر اٹھا کر بھی بیٹھ جائے
دل کا غبار گردِ پسِ کارواں نہیں
میں رازداں ہوں یہ کہ جہاں تھا وہاں نہ تھا
تو بدگماں ہے وہ کہ جہاں ہے وہاں نہیں

اپنا ہی یہ جگر ہے کہ تھامے ہوئے ہیں ہم
ان بے قراریوں پہ بھی بے تابیاں نہیں

کیوں کر کہوں کہ محفلِ اعدا سے وہ اُٹھے
قدموں پہ اب تلک تو گرا آسماں نہیں

مصروف میرے قتل کے ساماں میں وہ وہاں
اور یاں نویدِ قتلِ عدو کی بھی جاں نہیں

ہے یہ ستم سے گنبدِ گردوں بھرا ہوا
جائے صدائے الحذر و الاماں نہیں

ہر کوئی سرد ہے نفسِ سرد سے مرے
اُس کی نگاہِ قہر وہ آتش فشاں نہیں

ناکامیوں پہ تیری بھی اے خضر روئیے
واماندگی سے جنبشِ عمرِ رواں نہیں

ہے وصل میں خدنگِ جگر ہر ادائے ناز
آرامِ دل تلافیِ آزارِ جاں نہیں

وہ اُس کا ہے نشاں جو عزادارِ نام ہے
وہ اپنا نام ہے جو رہینِ نشاں نہیں

ہوتا نہیں نوازشِ ظالم سے ظلم کم
بلبل کا دوشِ برق پہ کب آشیاں نہیں

ہے جاں خراش پرسشِ غمخوار کس قدر
وہ مہرباں ہے مجھ پہ کہ جو مہرباں نہیں

بیداد کا رواج ہے انصاف کے سبب
جس جا وجود سر نہیں واں تیغ راں نہیں

میرٹھ میں ہے قلقؔ تو مگر بلبلِ غریب
افسوس ہے کہ تیرا کوئی ہم زباں نہیں

۱۱٦

جیتے بے جان ہیں اور مرنے کو جاں رکھتے ہیں
کیا ہی بے تاب و تواں تاب و تواں رکھتے ہیں
کیا خیالِ کمر و فکرِ دہاں رکھتے ہیں
اپنی محرومیِ قسمت کا نشاں رکھتے ہیں
لبِ اظہار کہاں گو کہ زباں رکھتے ہیں
شمع ساں سوزِ بیاں سازِ بیاں رکھتے ہیں
بارِ زنداں ہوئے ہر دم یہ فغاں رکھتے ہیں
طوق و زنجیر کو اے وائے گراں رکھتے ہیں
ہے محبت وہ بری شے کہ خدا سے نہ چھپے
یہ ہمارا ہی جگر ہے کہ نہاں رکھتے ہیں
وصل میں بھی تو کیا اُس سے جفا کا شکوہ
کیا ہی آزار طلب ہم دل و جاں رکھتے ہیں
بات تو کہیے یہ کیا بات ہے سارے معشوق
بے دہانی کا نشاں ہے کہ دہاں رکھتے ہیں
داورِ حشر کو دکھلائیں گے کیا حال اپنا
کہ غم پردہ نشیں دل میں نہاں رکھتے ہیں
تیز خنجر کو کرے تو کہ وضو ہم لیکن
اتنے وقفے کی بھی ہم جان کہاں رکھتے ہیں
ہے یقیں تجھ پہ جو مرتا ہے نہیں موت اُس کو
ہم شبِ ہجر میں جینے کا گماں رکھتے ہیں
کون اب اے ادبِ عشق سنبھالے ہم کو
ہاتھ میں ناقۂ لیلٰی کی عناں رکھتے ہیں

کیا بہار آئی که اک جنبشِ بے رنگی ہے
آخر اندیش وہی سوگ[1] خزاں رکھتے ہیں

حیلۂ سجدہ سے اک سر کو سہارا تو ملا
بارِ احسانِ کرم ہائے مغاں رکھتے ہیں

آستیں تیری بھی دکھلائیں گے تجھ کو رنگیں
دیکھ ہم دیدۂ خونابہ فشاں رکھتے ہیں

مجھ سے کیوں چھپتے ہیں جب آئنے سے وہ نہ چھپے
خود کو خود دیکھتے ہیں شرم کہاں رکھتے ہیں

ناتوانوں کو جتاتے ہیں نزاکت کیا کیا
رنگ اڑنے پہ بھی بہتانِ فغاں رکھتے ہیں

خار اغیار ہیں ہم پاؤں جدھر دھرتے ہیں
کوچۂ یار میں[2] ہم سر کو جہاں رکھتے ہیں

چارہ سازی سے مری ہاتھ ہے سب کا دل پر
چارہ گر فضلِ الٰہی خفقاں رکھتے ہیں

خاک ہو کر بھی ترا داغِ تمنا نہ گیا
دلِ ہر ذرہ میں خورشیدِ نہاں رکھتے ہیں

رخ پہ آچمکا جو پنہاں تھا ترے دل میں غبار
ہم سیہ بخت ترے خط کا گماں رکھتے ہیں

---

۱ - 'سوگ' اسم بہ ضم سین فارسی - بہ معنی ماتم، عزا، غم، اندوہ - (صفحہ ۷۴۲ فرہنگ عمید) (مرتب)

۲ - اصل متن (صفحہ ۱۰۴) میں 'ہی' یا 'ہے' درست نہیں - 'میں' تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

نہ گیا پر نہ گیا جوشِ دل آخر پسِ مرگ
عوضِ اشکِ رواں ریگِ رواں رکھتے ہیں
اے خودی کون سے سامان پہ اپنے بے خود
رنگِ بےرنگی تصویر کہاں رکھتے ہیں
غیر پر اس کی نظر اور وہ ہمارے بر میں
اس سے ہم رابطۂ تیر و کماں رکھتے ہیں
تجھ سے اے زندگی گھبرا ہی چلے تھے ہم تو
پر تشفی ہے کہ اک دشمنِ جاں رکھتے ہیں
اے قلق داد حسینوں نے کسی کو دی ہے
یہ وہ کافر ہیں زباں زیرِ زباں رکھتے ہیں

۱۱۷

نالہ کیا نہیں ہے کہ وہ بےقرار ہیں
بے اعتباریوں کے بڑے اعتبار ہیں
ناصح خفا، سپہر غضب، بخت بد سلوک
انجام دیکھیے جو یہی رازدار ہیں
اس سادگی پہ رحم کہ مرتے ہیں تجھ پہ ہم
ہے جائے التفات کہ تجھ پر نثار ہیں
گرتے ہیں اب تو اپنی نظر سے بھی بار بار
کیسے سبک ہوئے ہیں کہ ہر دل پہ بار ہیں
ہنگامے ہم تو لاکھ اٹھائیں گے حشر کیا
یہ ھی خرام ناز کے گر انتظار ہیں
واں وہ خیالِ غیر سے مضطر کہ ہائے ہائے
یاں پہ غرورِ ضبط کہ وہ بےقرار ہیں

چبھتی[1] ہوئی جگر ہی میں نکلی ہے منہ سے بات
دل میں ترے شکایتِ دشمن کے خار ہیں
آئینۂ ہزار فلک ہو گی مشتِ خاک
دل میں گھٹے ہوئے مرے کیا کیا بخار ہیں
کیوں کر نہ سانس سانس میں ہو دل شکن صدا
دل میں ہمارے عہد ترے دشنہ کار ہیں
اک تیرا کیا گلہ کہ سبھی[2] ہیں عدوے عشق
تجھ پر ہے کیا مدار کہ دشمن ہزار ہیں
کیوں خاک اڑاتے پھرتے ہو کوچے میں غیر کے
مانا کہ آپ رشکِ نسیمِ بہار ہیں
انداز حسن میں ہے نہ شوخی میں رنگ ہے
کس سادگی سے غیر کے امیدوار ہیں
میکش سبھی فرشتہ ہیں پر حضرتِ قلق
کیا دوستوں کے دوست ہیں یاروں کے یار ہیں

۱۱۸

دیکھ ہم تجھ سے اک امیدِ وفا رکھتے ہیں
سہو کو تیرے تجھے یاد دلا رکھتے ہیں
سر کو ٹھوکر سے تری ہم ہی لگا رکھتے ہیں
فتنہ ہاے دو جہاں روبہ قفا رکھتے ہیں

---

۱ - اصل متن (صفحہ ۱۰۵) 'چھپتی' بے معنی ہے ، اس لیے 'چبھتی' تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

۲ - اصل متن میں 'سب ہے' ہے - (مرتب)

تو نے دیکھا ہی نہیں تجھ میں جو دیکھا ہم نے
آج تک تجھ کو بھی ہم تجھ سے چھپا رکھتے ہیں
لے کے یہ جائے کہاں خاک گراں جانوں کی
دامنِ بادِ صبا کو بھی دبا رکھتے ہیں
اس کے خنجر کا کبھی خوں ہے ہمارے سر پر
ہم اسی وہم میں سر تن سے جدا رکھتے ہیں
خود بہ خود غیر سے اک ربط بڑھا جاتا ہے
یہ مقرر کہ وہ دل میں مرے جا رکھتے ہیں
دیر میں دیکھیے انجام ہمارا کیا ہو
کہ حریفِ دل و جاں خوفِ خدا رکھتے ہیں
ہو شبِ وصل اگر روزِ جزا تو بھی ہے کم
تیرے ناکام وہ امید بڑھا رکھتے ہیں
زندگی اپنی اک اندازِ غلط ٹھہری ہے
کہ نظر سے تری وابستہ قضا رکھتے ہیں
دل رمیدوں سے نہ کر ذکرِ قیامت واعظ
ایسے ہنگامے تو یہ گر کے اٹھا رکھتے ہیں
ایک ہم ہیں کہ ترے نام کا لینا آفت
ایک وہ ہیں کہ تجھے گھر میں بٹھا رکھتے ہیں
پردۂ چشم میں میرے انہیں رہنا تھا مدام
ہے عجب شرم وہ گوشے سے حیا رکھتے ہیں
کارواں اپنا ہے واماندگیوں میں چالاک
جستنِ رنگ سے آوازِ درا رکھتے ہیں
صدمۂ ہجر کسی سے نہیں ملنے دیتا
خاک میں کیوں کہ وہ عاشق کو ملا رکھتے ہے

اپنے انجام سے آغاز میں ہم در گزرے
نا رسائی میں وہ اندازِ رسا رکھتے ہیں
داغِ رفتار ہے پامال قدم کا ہونا
دارِ ہستی سے سفر مثلِ صدا رکھتے ہیں
تم قلق کو مری خاطر سے پڑا رہنے دو
ایک شاعر کو بھی محفل میں لگا رکھتے ہیں

١١٩

تیرے وعدے کا اختتام نہیں
کہ قیامت پہ بھی قیام نہیں
بے وفائی تمھاری عام ہوئی
اب کسی کو کسی سے کام نہیں
کس لیے دعوئِ زلیخائی
غیر یوسف نہیں ، غلام نہیں
وصل کے بعد ہجر کا کیا کام
دورِ گردوں کا انتظام نہیں
کون سنتا ہے نالہ و فریاد
چرخ کو خوفِ انتقام نہیں
خالِ لب دیکھ کر ہوا معلوم
کوئی دانہ بغیرِ دام نہیں
آپ میں کیوں کہ آؤں جب کہ تو آئے
خلوتِ خاص بزمِ عام نہیں
نالۂ کرتا ہوں لوگ سنتے ہیں
آپ سے میرا کچھ کلام نہیں

جس جگہ ہے وہاں بھی ہے بہتاں
کہ کسی جا ترا مقام نہیں

روزِ فرقت کو روزِ حشر نہ جان
شام پر بھی تو اختتام نہیں

ہے خدا ہی قلق جو آج بچے
صبح ہوتے نہیں کہ شام نہیں

۱۲۰

جانے جاتے ہیں کہاں عزم کدھر رکھتے ہیں
دورِ رفتار سے جوں شمع سفر رکھتے ہیں

کب مرے حال کی غم خوار خبر رکھتے ہیں
کہ نظر تجھ ہی پہ سب اہلِ نظر رکھتے ہیں

کل کی کیا فکر ہے رحمت پہ نظر رکھتے ہیں
دامنِ ابر تلک آج تو تر رکھتے ہیں

مہلتِ وصل تھی اک اس کی جبیں کا پر تو
کہ سرِ شام سے آغازِ سحر رکھتے ہین

تیغِ ابرو کے تصور میں کٹی ساری عمر
اب اس ارماں سے ہی ہم قطعِ نظر رکھتے ہیں

دیکھنا تجھ کو بھی دکھلائیں گے آخر آخر
غیر بھی تیری طرح تجھ سے حذر رکھتے ہیں

شمع بھی رشک میں کیوں کر نہ مرے ساتھ جلے[1]
پرِ پروانہ سے وہ بالشِ پر رکھتے ہیں

---

۱ - 'چلے' اصل متن (صفحہ ۱۰۸) غلط - (مرتب)

ماتم غیر میں ساتھ آپ کے جانا ہوگا
بختِ واژوں سے ہم اُمیدِ اثر رکھتے ہیں

وہ نہیں کہتے تو کب سنتے ہیں ہم غیروں کی
واں زباں گنگ ہے یاں گوش بھی کر رکھتے ہیں

آمد و رفت سے اعدا کی مٹے جاتے ہیں
جیسے نظروں میں تری راہ گزر رکھتے ہیں

جھوٹی قسموں سے کیا قتل عجب معرکہ ہے
مجھ سے لڑتے ہیں مرے سر کی سپر رکھتے ہیں

کس لیے قصۂ 'بلقیس' کیا تم نے شروع
اپنے انجام پہ ہم بھی تو نظر رکھتے ہیں

عہدِ فرقت میں ترے گردشِ دوراں سے چھٹے
شام رکھتے ہیں ہم اپنی نہ سحر رکھتے ہیں

ہو محبت کی خبر کچھ تو خبر پھر کیوں ہو
یہ بھی اک بے خبری ہے کہ خبر رکھتے ہیں

ناز ہی ہے کہ اُٹھاتا ہے ستم ہائے نیاز
دل کے لینے کا یہ دلبر ہی جگر رکھتے ہیں

اُف رے آتش زنیِ شعلۂ جاں سوز کہ ہم
اپنے بستر میں خسک مثلِ شرر رکھتے ہیں

اے **قلق** سادہ مزاجی کے تمھاری صدقے
بے ہنر وہ ہیں جو دعوائے ہنر رکھتے ہیں

۱۲۱

دل بری چیز ہے تو ہم بھی دیے بیٹھے ہیں
کون بے تاب پھرے دم کو لیے بیٹھے ہیں
میری ہر بات پہ ہوتے ہیں غضب ناک ایسے
گویا وہ خونِ عدو آج کیے بیٹھے ہیں
چاک دل ٹکڑے جگر جس پہ بھی سو طرح کی چھیڑ
تو سمجھتا ہے کہ ہم منہ کو سیے بیٹھے ہیں
ادبِ وعظ تو دیکھو کہ بکے جاتے ہیں
کیا مسلمان ہیں مسجد میں پیے بیٹھے ہیں
پوچھ مت حسرتِ ہجراں کو کہ ہر شب گویا
تجھ کو آغوش میں ہم اپنی لیے بیٹھے ہیں
عادتِ نالہ و فریاد کو کیا پوچھتے ہو
چرخ کی جان کو ہم صبر کیے بیٹھے ہیں
یہ نیا معرکہ دیکھو کہ گزاری شبِ ہجر
چل کے پوچھو تو قلق کیوں کہ جیے بیٹھے ہیں

۱۲۲

ہم تشنہ کام بادہ‌گساری اگر کریں
تو شعلہ و شرار کو دامانِ تر کریں
اب شرط ہے کہ ہم بھی پریشاں بسر کریں
کاکل کو تیرے اور بھی آشفتہ تر کریں
کھاتا ہے غم زمانہ کسی کا تو اس لیے
تا بے معاش آپ کے عاشق بسر کریں

اڑ جائے ہو کے صاعقه چہرے کا تیرے رنگ
بے تابیوں میں گر ترے رخ پر نظر کریں

ہو تلخ کاسیوں سے ہماری وہ آبِ شور
آبِ حیات تک بھی اگر ہم گزر کریں

مہر اس کے رخ کی شرم سے ہوتا نہیں بلند
کیوں کر شبِ فراق ہم اپنی سحر کریں

آخر تو ذبح ہووے گی اس کوچے میں کبھی
اے آرزوے وصل تجھے نامه بر کریں

مدت تلک رہا ہے دلِ مدعی میں یه
غمزے سے تیرے کیوں که نه ظالم حذر کریں

بڑھتا ہی جائے گا مرے سینے میں خونِ گرم
رگ رگ میں لاکھ لاکھ فرو نیشتر کریں

حیرت سے تجھ په بزم میں پڑتی نہیں نگاہ
غیروں کو تیرے شوق میں کب تک نظر کریں

فرقت میں سہو ہو گئے ارمان و آرزو
شکوه کریں وصال میں یا ناله سر کریں

آتا ہے کچھ یه ہم کو مزه چھیڑ چھاڑ میں
رحم آشنا ہو یار تو بیدادگر کریں

اب چرخ پاؤں پر ہے که ناله ہے چرخ پر
دل کی ہوس نکال لیں ہم بھی جگر کریں

شہر ان کے واسطے ہے جو رہتے ہیں تجھ سے دور
گھر ان کا پھر کہاں جو ترے دل میں گھر کریں

سر پھوڑنے کے واسطے پتھر ہزار ہیں
کیوں ناله ہاے دل ترے دل میں اثر کریں

سب دقتیں قلق نے سخن میں پسند کیں
بے فکر اپنی عمر کو حاسد بسر کریں

۱۲۳

آئے کیا تیرا تصور دھیان میں
کچھ سے کچھ ہے، آن ہی کی آن میں

یاں اشاراتِ غلط پر زندگی
واں ادا ہے اور ہی سامان میں

تیغِ قاتل ہے رگِ گردن مری
آبِ پیکاں دم تنِ بے جان میں

یا تو قاتل ہو گیا رحم آشنا
یا پڑے ہوں گے کہیں میدان میں

اشک اپنے پھر پھرا کر ہر طرف
آئے آخر تیرے ہی دامان میں

ہائے کیسے کیسے وارستہ مزاج
سر نگوں، دم بند ہیں زندان میں

کعبہ آنکھوں میں سماتا ہی نہیں
کیا بتوں نے کہہ دیا کچھ کان میں

آنکھ کے اٹھتے ہی اٹھتے کچھ نہ تھا
ہم چلے ارمان ہی ارمان میں

دیر و کعبے پر نہیں موقوف کچھ
اور ہی کچھ شان ہے ہر شان میں

گریۂ صد سری[1] اور ہم کم حوصلہ
کشتی اپنی آ گئی طوفان میں
جنت و دوزخ سے کیا اُمید و بیم
حسرتیں سی حسرتیں ہیں جان میں
خود پرستی اور اسلام آفریں
کعبۂ عاشق ہے کفرستان میں
اے قلق کل تک گدائے دیر تھے
آج دعوے ہو گئے ایمان میں

۱۲۴

اپنا گواہ کس کو میں تیرے سوا کروں
حرفِ ستم کو طرزِ نگہ سے ادا کروں
پھر امتحاں میں دیدہ و دل کا ذرا کروں
نا آشنائیوں کو تیری آشنا کروں
توڑیں گی قہر اور تری بد گمانیاں
کیوں کر غم رقیب کی سینے میں جا کروں
ہے اپنا اپنا حوصلہ اور اپنا اپنا ظرف
تو مستعد جفا پہ ہو اور میں وفا کروں
تم تاب کیوں کہ لاؤگے گرمیِ حسن کی
میں جنبشِ جگر ہی سے پنکھا جھلا کروں

---

۱ - متن میں 'سری' چھپائی میں اڑ گیا ہے ؛ بے معنی اور غیر موزوں ہے ۔ 'گریۂ صد سیل' بھی پڑھا جا سکتا ہے ؛ مصرع موزوں ہو جائے گا ، معنی پھر بھی واضح نہیں ہوتے ۔ (مرتب)

آتش کو بیختہ' پر پروانہ سے کروں
وہ شمع سے جلے تو میں اس سے جلا کروں
یہ آشیاں ہی خار دلِ باغباں میں ہے
جوں بوے گل میں دور چمن سے رہا کروں
دل ہی میں سوچ لے میں کہاں تک رہوں خموش
نظروں ہی میں سمجھ کہ میں کیا کیا کہا کروں
کیا جانے اگلے سال کو کیسی ہوا چلے
جی کھول کھول اب کے چمن میں نوا کروں
برہم کیے ہیں میری تمنا نے دو جہاں
کیوں مدعی بنوں تلفِ مدعا کروں
جوشِ جنوں میں خضر کو ڈھونڈھوں کہاں قلق
میں پارہ ہاے جیب ہی کو پیشوا کروں

۱۲۵

نالہ تو لب تک آ ہی گیا ، کہیے کیا کروں
اپنی حیا کروں کہ تمھاری حیا کروں
یوسف نہیں تو پھر ہے نکلنے کی قید کیوں
گر بس مرا چلے تو تجھے آپ سا کروں
فکرِ ستم میں آپ بھی پابند ہو گئے
تم مجھ کو چھوڑ دو تو میں تم کو رہا کروں
تم نے تو کھیل تیغ زنی کو سمجھ لیا
سر کٹ کے مثلِ تاک کہاں تک بڑھا کروں

---

۱ - اصل متن (صفحہ ۱۱۱) 'پیختہ' غلط ہے - (مرتب)

رنجِ فراقِ یار کی تدبیر ھائے ھائے
کیا بن گئی یہ جان پہ یارب میں کیا کروں

گر داغ ھو تو درد کو میں اُس کے جھیل لوں
گر درد ھو تو داغ سے اُس کی دوا کروں

صیاد ھی کے گھر میں بناؤں اب آشیاں
اُس کو بھی برق و باد کا برگ و نوا کروں

مقتول ھوں نگاہ کا ، شمشیر کا نہیں
روزِ جزا میں کیا طلبِ خوں بہا کروں

بے حس کیا خلیل کو آخر اُس آگ نے
جل کر جفا سے اُس کی کہاں تک وفا کروں

قطعِ نظر تلافیِ مافات سے ھے فرض
جی میں ھے تیری تیغ سے کسبِ صفا کروں

علم و ھنر میں مجھ کو نشانہ کیا قلق
بدلے فلک کے اھلِ زمیں سے لیا کروں

۱۲۶

تیرے در پر مقام رکھتے ھیں
قصدِ دارالسلام رکھتے ھیں

ابتدا اپنی انتہا سے پرے
نا تمامی ، تمام رکھتے ھیں

آسماں سے کسے اُمیدِ نجات
آشیاں زیرِ دام رکھتے ھیں

ایک یوسف کہ ساتھ غربت میں
ایسے لاکھوں غلام رکھتے ھیں

بے بہا شے ہوں میں کہ وہ مجھ کو
نا خریدہ غلام رکھتے ہیں

سب کی سنتے ہیں کرتے ہیں جی کی
کام سے اپنے کام رکھتے ہیں

وصلِ معشوق ہے سلیمانی
وہ ہی جم ہیں جو جام رکھتے ہیں

کچھ تری دوستی کی قدر نہیں
دشمنی خاص و عام رکھتے ہیں

قیس و فرہاد کہتے ہیں وہ مجھے
کیسے گن گن کے نام رکھتے ہیں

نالوں کو روک لیتے ہیں
دل کو ہم تھام رکھتے ہیں

کعبے میں ایک دم کی مہمانی
مے کدے میں مدام رکھتے ہیں

دلربا کہنے سے وہ چونک اٹھے
گویا ہم اتہام رکھتے ہیں

چشم بد دور عیشِ عہدِ شباب
صبح ہم رنگِ شام رکھتے ہیں

اے **قلق** بیٹھیے سرِ خمِ مے
آپ عالی مقام رکھتے ہیں

۱۲۷

کیا ہے برہم و درہم جہاں کو ایک ٹھوکر میں
ہزاروں بال آئے سیکڑوں کے کاسۂ سر میں

شبِ فرقت یہ کس کی شوخیاں ہیں جانِ مضطر میں
پلک کے مارتے آنکھوں میں ہے، ہونٹوں پہ دم بھر میں

یہ کیا پردہ پڑا ہم پر، یہ کیا ظاہر ہے صورت سے
یہ حالت دل کی کیسی ہے، یہ کیا ہے جانِ مضطر میں

سیہ مستی میں رازِ دل مغاں سے کہہ دیا شاید
کہ صہبا میں ہے تلخابی تو روتابی ہے ساغر میں

کلیجا ہاتھ سے پکڑوں تو دل کو کس طرح تھاموں
کہ خط کو باندھ کر پچھتایا ہوں بالِ کبوتر میں

دلِ بےتاب سے شاید بنا ہے جوہرِ آتش
وہی ہے رنگ شعلے میں، وہی ہے ڈھنگ اخگر میں

بہ رنگِ سایہ گر آمادۂ جنبش بھی ہوتا ہوں
تو ٹھوکر کھا کے گر پڑتا ہوں نقشِ پائے رہبر میں

مرا روزِ سیہ میری ہی نظروں میں سمایا ہے
وگرنہ دلکشی اور اس قدر زلفِ معنبر میں

جنوں الجھاؤ تھے تیرے، مگر تارِ گریباں تک
کہ مشتِ خاک میری اور گرہ دامانِ صرصر میں

تمھاری سرد مہری سے میں ہر محفل میں رسوا ہوں
نگاہِ گرم بن جاتی ہے آنسو دیدۂ تر میں

ہمارا قافلہ لٹ کر نہ ساماں میں کبھی آیا
رہا دل کوئے دشمن میں، رہی جاں کوئے دلبر میں

میں اُس کی خاطرِ نازک سے اپنا رنج اُٹھواتا
دمِ آخر بلاتا اُس کو کیوں کر حالِ ابتر میں

یہ کس فرصت میں تو نے انتخابِ دل کیا کافر
شکن پر ہیں شکن بل پر ہیں بل زلفِ معنبر میں

اٹھے کیوں آستیں مالیدہ و برچیدہ داماں تم
وصالِ ناگہاں لکھا ہے یہ کس کے مقدر میں

زمانہ کج روی بھولا ہے ورنہ کیوں نہ آ جاتی
وفا چرخِ غضب خو میں، حیا چشمِ ستم گر میں

دمِ آخر وہ جب آیا، تو مجھ سے کچھ نہ بن آیا
نہ آیا اشکِ شادی تک بھی میرے دیدۂ تر میں

رہے گا تا کجا پردہ، نہ ہوں گے تا بہ کے رسوا
نہ اب وہ آتے ہیں باہر، نہ ہم جاتے ہیں اب گھر میں

نقاب اُٹھتے ہی پردے پڑ گئے آنکھوں پر اے ظالم
یہ کس سے چشم پوشی تھی، تجھے میدانِ محشر میں

گدائی کے تجمل کی نہ پوچھو حیرت افزائی
کہ آہِ بے نیازی کا ہما کی سایہ ہے پر میں

عجب ساماں سے کچھ آتا ہے مرغِ نامہ بر اپنا
ہزاروں تیر ہر پر میں تو لاکھوں تیغ شہپر میں

قلق ہنگامۂ دہلی سے دادِ دل بھی کیا کم ہے
کہ مخبر بال بال اپنا ہے دورِ زلف کافر میں

۱۲۸

اُنھیں پھر امتحان یاد آ گیا میدانِ محشر میں
مگر دادِ ستم بیداد تھی میرے مقدر میں
نصیبہ بے نصیبی ہے مرا شاید مقدر میں
کہ واژونی لبالب ہے ازل سے کاسۂ سر میں
بغل میں ہاتھ دے کر لائے ہیں نالے ترے در تک
نکل اے فتنہ‌گر باہر قیامت آتی ہے گھر میں
اُڑے صبر و خرد ، یاں جنبشِ پرواز سے پہلے
یہ کیا پر لگ گیے خط باندھ کر بالِ کبوتر میں
شبِ ہجراں رہی مشقِ جنوں ، اندازِ شوخی پر
نہفتہ دشنے پر دشنہ کیا ہر چینِ بستر میں
مغاں کو ارمغاں کیا دیجیے میخانے میں جا کر
کہ دے بیٹھے ہیں ہم ایماں کو اُمیدِ ساغر میں
نہ کر تو بخل ساقی دیکھ تو دریا دلی میری
کہ جنت سا مکاں اور چھوڑتا ہوں ایک ساغر میں
نہ ہم میں چرخ کی سیرت ، نہ کچھ اغیار کی صورت
سمائیں کس طرح سے ہم تری چشم فسوں گر میں
قیامت پاؤں کے رکھتے ہی استقبال کو دوڑی
پۓ دیدار جا نکلے جو ہم کوے ستم گر میں
فلک نے آہ و نالہ خاک کر ڈالے ہیں کس کس کے
کہ ہے اک جوش سا صحرا میں اور طوفاں ہے صرصر میں
پڑی کیا کچھ نہ آفت لے ہی بیٹھی عاقبت جی کو
نہیں طاقت ذرا اُٹھنے کی اب فریادِ مضطر میں

وہ خودبیں ہے ازل سے آج آئینے کا کیا شکوہ
نہ ہوتا رخنہ‌گر اے چشم تر سدِ سکندر میں
عجب کیا ہے اگر ہمدم رہے تا زندگی میرا
کہ اک طرزِ وفا پاتا ہوں دردِ بندہ پرور میں
وفا سے سب کو بیزاری ہے اے مانی نہ وحشت سے
نہیں جمنے کا کوئی رنگ ، میرے نقشِ پیکر میں
ترے دیوانے کے انداز پر غش اک زمانہ ہے
زمیں حیرت میں رہتی ہے ، فلک رہتا ہے چکر میں
یہ رعنائی ، یہ خودرائی ، یہ چالاکی یہ بیباکی
خدا جانے کہ ہوگی صرف کس کے حالِ مضطر میں
وہ نور دیدۂ دل آنسوؤں میں مل کے آتا ہے
کہ شعلےؔ کو سرشتہ کر رکھا ہے آب گوہر میں
مری فریاد سے شاید کسی کا رنگ اُڑتا ہے
وگرنہ کیوں شبِ فرقت ترقی نورِ اختر میں
شبِ ہجراں **قلق** یہ بے کسی جھیلی کہ توبہ ہے
نہ وہ مہ تھا مقابل میں ، نہ خنجر تھا برابر میں

۱۲۹

غیر شایانِ رسم و راہ نہیں
کب وہ عاشق ہے جو تباہ نہیں
اے فلک دورِ حسن میں آس کے
تجھ کو کچھ فکرِ مہر و ماہ نہیں
ربطِ دشمن سے بھی وہ بد (کذا) بر ہے
اب کسی طرح سے نباہ نہیں

کم نگاھی کو اُن کی دیکھتے ھیں
اُن پہ بھی اب ھمیں نگاہ نہیں
پردہ کب تک رھے گا اے ظالم
اخترِ مدعی سیاہ نہیں
ظلم کی قدر کے لیے ھے رحم
داد کچھ بھرِ داد خواہ نہیں
حیف قزاقِ زمانہ حیف
رسم و رہ بھرِ رسم و راہ نہیں
ھے گدا شاہ ، بلکہ شاھنشاہ
سطوتِ قھرِ بادشاہ نہیں
اُلفت اور تم سے ھائے ھائے نہ ھو
لبِ دشمن پہ آہ آہ نہیں
پستیِ طالع بھرِ خوبیِ فن
کیا وہ یوسف جو غرقِ چاہ نہیں
عرصۂ نیستی و ھستی سے
بچ کے چلنے کی کوئی راہ نہیں
اے **قلق** کیا ھوا بڑھاپے میں
عشق کچھ سیرِ صبح گاہ نہیں

۱۳۰

ھم تو یاں مرتے ھیں واں اُس کو خبر کچھ بھی نہیں
اے وہ سب کچھ ھی سہی عشق مگر کچھ بھی نہیں
تم کو فریادِ ستم کش کا خطر کچھ بھی نہیں
کچھ تو اُلفت کا اثر ھے کہ اثر کچھ بھی نہیں

عافیت ایک اور آزار ہزاروں اُس میں
جس کو کچھ سود نہیں اُس کو ضرر کچھ بھی نہیں

خلوتِ راز میں کیا کام ہے ہنگامے کا
ہے خبردار وہی جس کو خبر کچھ بھی نہیں

تو اور اک شان کہ عالم کی نظر میں کیا کچھ
میں اور اک جان کہ پھرتے ہی نظر کچھ بھی نہیں

رحم ہے اُس کا ہی آشوبِ قیامت کی دلیل
جس سے بیزار ہے وہ اُس کو خطر کچھ بھی نہیں

ہم کو اس حوصلے پہ کیوں کہ فلک دے ساماں
شکوۂ بار ہے اور منت سر کچھ بھی نہیں

راہیِ ملکِ عدم ہیں نہیں فکرِ منزل
قصد رکھتے ہیں اُدھر کا کہ جدھر کچھ بھی نہیں

زیست افسونِ تماشا ہے توہم کے لیے
ہوتی ہے جلوہ نما مثل شرر، کچھ بھی نہیں

خود پرستی کے سبب شیخ و برہمن کو ہے خبط
سب ادھر ہی کی بناوٹ ہے اُدھر کچھ بھی نہیں

عاقبت بیں کو ہے ہر بزم کی شادی ماتم
شمع روتی ہے کہ ہوتے ہی سحر کچھ بھی نہیں

روزِ فرقت کی درازی سے نہ دیکھے شبِ ہجر
حسرت شام میں تشویشِ سحر کچھ بھی نہیں

جانتے ہیں کہ نہ بھٹکے گا جہاں کیا کیا کچھ
دیکھتے ہیں کہ اُنھیں مدِ نظر کچھ بھی نہیں

اے **قلق** پیتے ہی مسجد میں چلے آتے ہو
بے خبر کتنے ہو تم بھی کہ خبر کچھ بھی نہیں

۱۳۱

دوستیِ مدعی کس کس کے نقشِ دل نہیں
جس کو تم چاهو مٹے یه وه خطِ باطل نہیں

کب حصولِ آرزو ، اُمیدِ لا حاصل نہیں
خواب گاهِ سعی نا یابی مری منزل نہیں

جستجو درکار دلبر سے جدا کچھ دل نہیں
مستمندِ سعی جو مشکل هے وه مشکل نہیں

بلبله خونِ تمنا کا هے بر میں دل نہیں
داغ اشکِ گرم کا هے مردمک میں تل نہیں

روے لیلیٰ کے لیے پرده کوئی حائل نہیں
کون سے غنچے کی هے آغوش جو محمل نہیں

اقربا دیتے هیں طعنے ، گالیاں دیتا هے وه
یه نه کهه ناصح که دل دینے میں کچھ حاصل نہیں

حشر کا کیا ڈر هو قاتل کو که هے خوں ریز عام
کون جائے گا وهاں تک کون سا گهائل نہیں

سخت جانی کی پشیمانی نے مارا هے مجھے
خوں بہا گردن په هے میری سرِ قاتل نہیں

آسماں مصروفِ سامانِ وصالِ غیر هے
سر به جیب غور هے کچھ نیند میں غافل نہیں

زاهدا کب تک بتوں پر مکر سے هوگا فدا
کعبے کیوں جاتا هے تو بوسے کا گر سائل نہیں

بنے کدورت غیر سے نے گریه اپنے حال پر
تنگ اتنا زیست سے هوں دخلِ آب و گل نہیں

آنسوؤں میں کل تو دل آیا تھا آج آنکھیں گئیں
اس محیطِ بیکراں کا روز اک ساحل نہیں
ہر جگہ کعبہ ہے لیکن سجدے کی مہلت کہاں
ہر قدم منزل ہے لیکن فرصتِ منزل نہیں
حسرت و ارمان آؤ، آتے آتے کیوں رکے
یہ ہمارا غم کدہ ہے اس کی کچھ محفل نہیں
ہے دلیل انصاف کی ظاہر کیا دل کو دو نیم
اے ستم گر کس طرح کہیے کہ تو عادل نہیں
اب زمیں پر پاؤں کیوں رکھے گا وہ تیغ آزما
کون سی جا ہے جہاں بسمل سر بسمل نہیں
کیا مٹائے آپ کو کوئی کہ راہِ عشق میں
وہ رواجِ نقص ہے نقصان بھی کامل نہیں
یہ کسی کا بھی نہیں اور اس کا ہے سارا جہاں
دل ربا کو بھی تو ہے اختیارِ دل نہیں
خاک ہم سے آسماں سو سو طرح چھنوائے گا
اے ہجوم آرزو تو خاک میں بھی مل نہیں
کیا ہے وہ حرماں جو تیرے رحم میں داخل نہ ہو
کیا ہے وہ ارماں جو میری یاس میں شامل نہیں
خوف مجھ سے کہتا ہے محفل سے اس کی اٹھ کہیں
اور جرأت دل سے کہتی ہے تو ہرگز ہل نہیں
عاقبت آتا ہے دورِ وصل بھی اک روز پر
گردشِ ایام میں فرقت کے دن داخل نہیں
اک نظر دیکھا تو دیکھا اس میں کیا تو گھس گیا
اے فلک دشمن نہ ہو تجھ پر کوئی مائل نہیں

ایک دن تو بول اٹھتا تنگ ہو کر بے وفا
اے **قلق** ہم اس خموشی کے تری قائل نہیں

۱۳۲

کیوں کریں حقِ وفا سے پئے انکار نہیں
ہاں بھی اس طرح سے کرتے ہیں کہ اقرار نہیں
رحم کر رحم کہ تعزیر سزاوار نہیں
ہو سزا جس کی سزا میں وہ گنہگار نہیں
بارِ حسرت سے چراتی ہے اجل بھی کاندھا
ترے درماندہ کا کوئی بھی مددگار نہیں
آستاں اس کا کسی جائے نہیں ہے تو نہ ہو
چین لینے کہیں دیتا دلِ بیزار نہیں
ناروا دل سے کوئی چیز نہیں دنیا میں
کوئی دلبر کے سوا جس کا خریدار نہیں
اپنے ہی حال میں کچھ سر بہ گریباں ہے نگاہ
چشمِ بیمار کا گویا کوئی تیمار نہیں
ناز و انداز و ادا چشم و نگاہ و عشوہ
سبھی دلدار ہیں اور کوئی بھی دلدار نہیں
سازگاریِ مقدر مری سبحان اللہ
آپ جب قتل کے درپے ہیں تو تلوار نہیں
ربط پر غیر کے باندھے ہیں خیالات اپنے
کوئی بھی ہم سا محبت میں خود آزار نہیں
بیٹھے یہ دل کو پکڑ کر کہیں کس حیلے سے
ہم ہیں اس دشت میں برباد جہاں خار نہیں

غیر کے دھیان میں بے چین ہے کیا کچھ شب و روز
تم ہی ہو پہلو میں مرے دلِ افگار نہیں
کون سی رات نہ آنکھوں میں رہا روزِ سیاہ
کون سے روز نگاہوں میں شبِ تار نہیں
پاس بیٹھے ہیں تو اس طرح سے بیٹھے ہیں وہ
آن سے گویا کہ ہمیں کچھ بھی سروکار نہیں
وائے تقدیر کہ صیاد ملا بے پروا
وہ گرفتارِ زبوں ہوں کہ گرفتار نہیں
اے قلق پیرِ کہن سال ابھی سے تو ہوا
کسی نو عمر کو یہ شعر کا آزار نہیں

۱۳۳

نکالو ہم کو زنداں سے کہ آبادی ہو زنداں میں
ہم آئے کنجِ زنداں میں بہار آئی گلستاں میں
شبِ وصلِ عدو نے تفرقہ ڈالا دل و جاں میں
رہا دل گھر میں دشمن کے رہے ہم کوے جاناں میں
ہماری بے سر و سامانیاں آئی ہیں ساماں میں
ہوا انبوہِ ویرانی بیاباں ہے بیاباں میں
دکھاؤں دل کے زخموں کو بٹھا کر چشم حیراں میں
ذرا انگشتِ قاتل بھی رہے یک لحظہ دنداں میں
کہیں اک شب کی شب یوں ہی گذر جائے گی رہنے دو
فراہم خار و خس کرنے سے کیا حاصل بہاراں میں
دکھا کر زخم دل آیا ہے کیا کیا یاد کیا کہیے
رہا جو وصل میں صدمہ نہ تھا وہ دردِ ہجراں میں

بنایا مٹ مٹا کر نالہ و گریے کا وہ ساماں
غبار اپنا ہوا ہے سرمہ چشم باد و باراں میں
یہ سرمایہ دل و دیدہ گا اور پاؤں میں دشمن کے
آمیدِ خوں نشیں ہے مرغِ بسمل کوے جاناں میں
سمایا آخر آخر جاں میں شوقِ ہم کناری یہ
رہی پیچیدگی ہو کر تمہاری زلفِ پیچاں میں
وہ صیاد آیا ابر آیا وہ کوندی برقِ ناشدنی
بنایا آشیاں اور آفتیں ٹوٹیں گلستاں میں
دم آخر بھی جمعیت نہیں کیا لذتِ ایذا
ہمارا سر ہے زیرِ تیغ اور جاں ہے نمک داں میں
کریں کیا داد خواہی دامنِ قاتل کو کیا پکڑیں
کہ ہے فریاد اک موجِ تبسم زخمِ خنداں میں
ترا وحشی نہ ہوگا سیر ہے یہ بسملِ لذت
گر آبِ تیغ ہو لبریز ہر خارِ مغیلاں میں
طبیعت گرتے گرتے لے ہی بیٹھی عاقبت جی کو
مگر اک بے خودیِ رقصِ بسمل رنگِ پراں میں
سہارا چارہ گر مت دے تو سر زانو پہ رہنے دے
نہ لا بیٹھے بٹھائے زلزلہ دیوارِ زنداں میں
جو دیکھا زخمِ دل کو بخیہ گر کے ہل گئے ٹانکے
ندامت سے ہے سر اُس کا مرے چاکِ گریباں میں
لبوں پر آتے ہی کیوں تلخ کامی ہو گئی ایسی
بت نے ملایا زہر کیا شیرینیِ جاں میں
غبارِ کاروانِ عشق نے کیا رنگ بدلے ہیں
کہ یاں برقِ نگہ واں سرمہ ہے دامانِ مژگاں میں

اُمیدیں توڑنی دل خون کرنا بد گماں رہنا
ترے انداز سارے ہیں ہماری یاس و حرماں میں

صبا خاطر کو میری وا نہ کرنا بھول کر بھی تو
وگرنہ آ گئی ہوگی خزاں فصلِ بہاراں میں

قلق سے سیکھ جائے عشق اخفائے محبت کو
نہیں معلوم دل کو درد کیا ہے داغِ پنہاں میں

۱۳۴

اُڑاؤں نہ کیوں تار تارِ گریباں
کہ پردہ دری ہے شعارِ گریباں

ہر اک تار ہے دست گیرِ تماشا
کیا ضعف نے شرمسارِ گریباں

کتان و گل و سینۂ اہلِ حسرت
بہت[۱] چیز ہیں یادگارِ گریباں

اگر دشمنی بخیہ گر کو نہیں[۲]
تو کیوں اس قدر دوست دارِ گریباں

۱۔ ''بہت چیز'' اصل متن (صفحہ ۱۲۱) میں ''بہت چیزیں'' ہونا چاہیئے۔ (مرتب)

۲۔ بحر متقارب مثمن سالم میں کہی گئی ہے لیکن اس مصرع میں 'عروض' مقصور ہے۔ غزل (فعولن فعولن فعولن فعول)

نہیں قیدِ رسم خلائق پسند[1]
ہر اک سانس ہے خارِ خارِ گریباں

وفا ہے مری پیش دستِ سلاسل
ترا پردہ ہے پیش کارِ گریباں

یہ اڑنے میں چالاک ہر پارہ ہے[2]
رمِ دشتِ وحشت شکارِ گریباں

کبھی کوہ میں دشت میں ہے کبھی[3]
نہیں کچھ گلو پر مدارِ گریباں

قلق کیوں کے پردہ نہ اٹھتا ہمارا
کہ ہے بخیہ گر رازدارِ گریباں

۱- شعر : بحر متقارب مثمن عروض مقصور باقی سالم! ایضاً ایضاً دیکھیے قواعد العروض (صفحہ ۲۰۲) مولفۂ سید غلام حسین قدر بلگرامی تقویت الشعر (صفحہ ۲۲) مولفۂ امام الدین طالب بحر الفصاحت (صفحہ ۲۲۰) مولفۂ نجم الغنی خاں۔

۲ - عروض محذوف ہے ، باقی سات ارکان سالم ۔ (طالب کا بیان ہے کہ ؛

اس وزن میں عروض اور ضرب 'محذوف' یعنی 'فَعَل' ساکن اللام بھی آیا ہے۔ نجم الغنی خاں نے عروض محذوف اور ضرب مقصور کی مثال میں یہ شعر پیش کیا ہے :

'سعید' ان کے غم میں ہوا دن بسر
خدا جانے اب کیا دکھائے گی رات

قدر بلگرامی بھی ایک رکن کا محذوف اور باقی سات ارکان کا سالم ہونا تسلیم کرتے ہیں ۔ اس لیے یہ مصرع ساقط الوزن نہیں (مرتب)

۳ - عروض محذوف باقی ارکان سالم ۔ (مرتب)

۱۳۵

بیگانہ ادائی ہے ستم جور و ستم میں
ہم چھپنے نہ پائے کہ چھپا آپ وہ ہم میں

کچھ علم و خرد پر نہیں تقدیر کی مقدار
اندازۂ پیماں نہ زیادہ میں نہ کم میں

ہے طرزِ محبت ہی دل آشوب وگرنہ
کچھ بات عداوت کی نہ تم میں ہے نہ ہم میں

ہر قافلۂ درد رسیدہ کی ہے منزل
کیا جانیے آرام ہے کیا ملکِ عدم میں

یارب ہو برا اس ہوسِ دل کا نہیں چین
افلاس بھی کھویا طلبِ جاہ و حشم میں

بے حس ہوسِ وصل میں ایسے تو ہوئے ہیں
لذت ہے اذیت میں حلاوت ہے نہ سم میں

افسانۂ مے خانہ ہے واعظ کی زباں پر
اندازۂ پیمانہ ہے قندیلِ حرم میں

مجھ کو ہی نہیں بے خود و بے ہوش کیا کچھ
دیوانے بنے آپ بھی تشویشِ ستم میں

اس زہد لباسی کے **قلق** تیرے ہیں قائل
کس ڈھنگ سے لایا پسرِ شیخ کو دم میں

۱۳٦

دل اُس پہ ہے نثار میں دل پر نثار ہوں
حیرت کا اپنی آپ ہی آئینہ دار ہوں

میں کس حساب میں ہوں کہ داغِ شمار ہوں
اے سہوِ روزگار ترا یادگار ہوں

اُمید جتنی گھٹتی ہے بڑھتی ہے آرزو
کس درد مند کا دلِ امیدوار ہوں

ہے دوست بد دماغ تو دشمن ہے دل شکن
اب ہر طرح سے چشمِ تمنا میں خار ہوں

میں غیر تو نہیں کہ نہ دوں جان ہجر میں
اے مرگ آ ترا ہدفِ انتظار ہوں

محشر کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑے ایک آہ میں
کیا پائمالِ فتنۂ رفتارِ یار ہوں

کیوں دل مجھے دیا اُسے کیوں دلربا کیا
کیا جبر ہے کہ متہم اختیار ہوں

ہاں چرخ بھی گرے گا اور اُٹھے گا حشر بھی
تیری گلی میں بیٹھ کے ہر دل پہ بار ہوں

آساں ہے پس کے سرمۂ مکی بنوں ابھی
مشکل کہ آستان بتاں کا غبار ہوں

میرے ہی عجز سے ہے ترے ظلم کا نباہ
جب تک تو ہے عزیز میں جب تک ہی خوار ہوں

باہم رکھو سلوک قلق دو بتوں کو چھوڑ
تم مجھ پہ ہو نثار میں تم پر نثار ہوں

۱۳۷

مرنے والوں سے فرشتے بھی دبا کرتے ھیں
عمر بڑھتی ھے جو مرنے کی دعا کرتے ھیں

ھائے اُلفت کے دل آویز اشارات کہ ھم
سرفروشی کے لیے جان فدا کرتے ھیں

وقتِ غم صبر و خرد تاب و تواں کا کیا کام
یہ وہ احباب ھیں جو سل کے دغا کرتے ھیں

اب نہ وہ ھم نہ وہ تم اور نہ وہ حالت اپنی
ھے تقاضاے مروت جو گلا کرتے ھیں

ایک محشر کہ لگاوٹ کے ھیں ساماں لاکھوں
اُن کا پردہ نہیں اُٹھتا جو ملا کرتے ھیں

اللہ اللہ جوانی میں لگانا جی کا
مرگ کو جاں کے عوض مول لیا کرتے ھیں

قتلِ عاشق کی ذرا گھات کسی سے سیکھو
سیکڑوں تیغ بکف ورنہ پھرا کرتے ھیں

اھلِ اُلفت کا ھے ابرام عقوبت کا سبب
یہ وہ کم بخت ھیں مر مر کے جیا کرتے ھیں

کیوں کہ غیروں کی نہ ھو قدر کہ بےوجہ نہیں
اپنے کے نام تو سایے سے بچا کرتے ھیں

مہر و مہ کیوں کہ نہ ھجراں میں چھپائیں منہ کو
رخِ روشن سے ترے کسبِ صفا کرتے ھیں

اے **قلق** رسم محبت میں شکایت ھے کفر
بےوفائی کے لیے ھم تو وفا کرتے ھیں

۱۳۸

اس شرم پر تو خیرہ کشی کچھ ستم نہیں
اُس کی جبیں پہ ہے مری آنکھوں میں نم نہیں

عمرِ درازِ خضر سے معلوم ہو گیا
کوتاہیِ وصال کسی طرح کم نہیں

سب سر نگوں ہوئے مری تعزیر دیکھ کر
وقتِ قتال تیغِ ستم تک علم نہیں

معذور ہیں وہ آپ کہ فرصت ہی اب نہیں
یہ لطف غیر پر ہے کہ مجھ پر ستم نہیں

منہ پھیرتی ہے کس لیے تلوار دم بہ دم
ظاہر تو التفاتِ ستم گار کم نہیں

یاں اک قدم اٹھے تو جھکے سر ہزار بار
کچھ سیرِ دیر دورۂ طوفِ حرم نہیں

کب کی فقیرِ دیر نے توقیرِ سلطنت
کم ساغرِ سفال سے کیوں جامِ جم نہیں

ہے وعدۂ وصال مسلّم بے وفا
پیکِ اجل کو حاجتِ قول و قسم نہیں

صبحِ وصالِ غیر نہیں آج ہے، تو کیوں
تم میں وہ شرم اور وہ نگاہوں میں رم نہیں

اللہ رے طلسم محبت کی دلبری
رنج و الم میں کاہشِ رنج و الم نہیں

کیا پوچھتے ہو وصل کی بے التفاتیاں
اتنا ہوا ہوں خوش کہ جدائی کا غم نہیں

جیتے ہیں اس سزا میں کہ مرتے ہیں تجھ پہ ہائے
مرتے ہیں اس عزا میں کہ مرنے کے ہم نہیں

وان خلد دی تو یاں سے و معشوق دے ہمیں
بے لذتِ گناہ نشاطِ کرم نہیں

کیا اس کا پائمال کہیں داد خواہ ہو
جو ناز سے زمین پہ رکھتا قدم نہیں

شرمندہ ہے مسیح ترے ناتوان سے
ہرگز تحملِ نفسِ قم کا دم نہیں

اُمیدِ زیست قطع کچھ ایسی ہوئی ہے اب
وہ سانس کون سی ہے جو شمشیر دم نہیں

اُس کی نگاہ میں ہے رقیبوں کے دل میں ہے
تجھ سا **قلق** زیادہ کوئی محترم نہیں

۱۳۹

نامۂ شوق اُسے غصے میں رقم کرتے ہیں
گویا ہم شاخِ کتابت کو قلم کرتے ہیں

اے[1] زمیں ہٹ کہ غمیں چشم کو نم کرتے ہیں
اے فلک بچ کہ فغاں جوش میں ہم کرتے ہیں

لطف میں لطف نہیں کچھ کہ ہے بہرِ اغیار
ظلم بھی ظلم نہیں ہے وہ کرم کرتے ہیں

فارغ البال ستم گر ہے تو ہم شکر گزار
اُن کے الطاف ہیں ہم پر جو ستم کرتے ہیں

۱- یہ مطلع مقطع سے پہلے درج تھا ؛ ترتیباً مطلع اول کے نیچے درج کیا گیا ۔ (مرتب)

۱۸۸

بلبلوں کو ہے نظر آب و ہوائے گل پر
آشیانے کے لیے خار بہم کرتے ہیں

مدد اے گردشِ برگشتگیِ چرخ کہ ہم
اس کے آنے کی تمنا شبِ غم کرتے ہیں

اور کیا جرم کیا ہے کہ اٹھے گا محشر
ایک امید ہے تیری جسے ہم کرتے ہیں

اوجِ اقبال ہے حصے میں اسی کشتہ کے
سرِ میداں جسے نیزے پہ علم کرتے ہیں

حشر تک پھر نظر آتے نہیں وہ لوگ کبھی
حالتِ وصل میں جو قول و قسم کرتے ہیں

اے قلق کیوں کہ پسند آئیں گے حور و غلماں
نہ عداوت ، نہ شرارت ، نہ ستم کرتے ہیں

۱۹۰

خوشی میں بھی نواسنجِ فغاں ہوں
زمین و آسماں کا طرز داں ہوں

میں اپنی بے نشانی کا نشاں ہوں
ہجومِ ماتمِ عمرِ رواں ہوں

ترے جاتے ہی میری زیست تہمت
نہیں ملتا پتا اپنا کہاں ہوں

غبارِ کاروانِ مور ہے زیست
یہ خطِ یار سے آشفتہ جاں ہوں

نہیں کچھ کام بخت و آسماں سے
میں ناکامی میں اپنی کامراں ہوں

نہیں دم مارنے کا دم اور اس پر
مرا پا شمع ساں شکلِ زباں ہوں
خدا ہی گر نہ دے معشوق و مے کو
تو کیوں پھر محتسب سے سرگراں ہوں
وہاں کا رنگِ پران آسماں ہے
میں جس عالم کی تصویرِ گماں ہوں
کوئی آوارہ مل جائے تو پوچھوں
کدھر سے آیا ہوں جاتا کہاں ہوں
نکل جاتا ہے جی ہر آرزو پر
بے خونِ جوانی میں جواں ہوں
مرا غم عشرتِ رفتہ کا نغمہ
کہ مثلِ گردِ بوئے کارواں ہوں
کواکب ہائے قسمت آسماں پر
نہ ہوں کیوں نکتہ‌چیں میں نکتہ داں ہوں
قلق بے رونقی رونق ہے میری
بہارِ عمرِ ہستی کی خزاں ہوں

۱۴۱

اٹھنے میں دردِ متصل ہوں میں
گردباد ، غبارِ دل ہوں میں
کعبے تک ساتھ آیا شوقِ صنم
ہائے بت خانہ کیا خجل ہوں میں
حیف کس مدعی کی جاں ہے تو
ہائے کس آشنا کا دل ہوں میں

تجھ کو دوں کیا جواب اے داور
اپنے ہی آپ منفعل ہوں میں

تیری نازک تنی پہ غور نہ کی
اپنی اُمید سے خجل ہوں میں

نہ ہلا اُس کے در سے تا محشر
مرقدِ آرزو کی سل ہوں میں

خاکِ ہستی کی گردباد ہے تو
آتشِ دل کی آب و گل ہوں میں

حد نہیں کوئی اپنی حالت کی
کہ نگاہوں میں منتقل ہوں میں

چھا گیا یہ تصور اُس بت کا
نقشِ چیں اور بتِ چگل ہوں میں

ذرہ[۱] سی زندگی پہاڑ ہوئی
آنکھ کا اپنی آپ تل ہوں میں

---

۱ - بقول مؤلف نوراللغات 'ذرّہ' عربی، فارسی میں ذرّہ ہوا اور اردو میں 'ذرا' بروزن 'کہا' استعمال ہونے لگا۔ اس مصرع میں اگر 'ذرا' بر وزن کہا جانا چاہیے تو مصرع کی صورت یہ ہوگی کہ 'صدر' کو مجنون تسلیم کیا جائے۔ پوری غزل میں ''صدر اور ''ابتدا'' سالم ہیں اسی لیے ذرّہ مطابق متن برقرار رکھا گیا ہے وزن اس غزل کا یہ ہے۔ مشعّث مقصور

خفیف مسدس، مخبون، مقصور، مشعث [صدر و ابتدا سالم، حشو مخبون، عروض و ضرب اس وزن میں مخبون، محذوف، یعنی 'فِعْلُنْ' بھی آتا ہے۔ مرتب

[قواعدالعروض۔ ص ۲۹۳، ۲۹۴
تقویت الشعرا۔ ص ۲۱]

اے قلق کیوں کہ چھوڑ دوں وحشت
وضع میں اپنی مستقل ہوں میں

۱۴۲

پھرے ہے دیکھیے دنیا کدھر کو دیکھتے ہیں
کہ بات بات میں ترچھی نظر کو دیکھتے ہیں
جگر کے زخم کو اور چارہ گر کو دیکھتے ہیں
جو دیکھتے ہیں ہم اُن کے جگر کو دیکھتے ہیں
جنوں ہمیں ہی سہی پر کسی کے گھر تو نہیں
تمھاری شان کو اور اس گزر کو دیکھتے ہیں
چراغ دور سے خورشید کو دکھاتے ہیں
ہم اپنی شب کا تماشا سحر کو دیکھتے ہیں
ہوئی محال اُنھیں اور مجھے سبک دوشی
میں اُن کی تیغ کو وہ میرے سر کو دیکھتے ہیں
الٰہی ٹوٹ پڑے برق ابر و باراں پر
یہ کون ہیں جو مری چشمِ تر کو دیکھتے ہیں
حجاب ہی میں گئی اپنی جاں ہزار دریغ
ہم اُن کو دیکھتے ہیں جو اُدھر کو دیکھتے ہیں
دریغ و داغ ہے میرا بھی دیدنی ہے ہے
ہزار حیف، وہ مجھ بے خبر کو دیکھتے ہیں
جہاں میں رحم کی اُمید ہے تو بس اتنی
کہ ذبح کر کے پڑے بال و پر کو دیکھتے ہیں
تری نوید میں ہر داستاں کو سنتے ہیں
تری اُمید میں ہر رہ‌گزر کو دیکھتے ہیں

خوشا وہ لوگ کہ دیر و حرم میں جا بیٹھے
نہ ایک ہم کہ کھڑے تیرے در کو دیکھتے ہیں
ذرا تو نعش کو بالینِ گور رہنے دو
یہاں تلک بھی رہِ نامہ بر کو دیکھتے ہیں
پسندِ اہلِ نظر ہو گئی وبالِ حسن
کہ تیری زلف سے پر خم کمر کو دیکھتے ہیں
یہ کس غضب کی ہے بے اعتباریِ اُلفت
ہم اُن کو اور وہ ہماری نظر کو دیکھتے ہیں
اس اتفاق کو ، اس اتحاد کو دیکھو
تلاشِ غیر میں وہ میرے گھر کو دیکھتے ہیں
نہ رہنے دے گا ہمیں شہر میں بھی اب کوئی
کہ تیرے شوق میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
شراب پی کے **قلق** ناچتے ہیں کیا کیا لوگ
ہم اُن کی شکل کو اور اس ہنر کو دیکھتے ہیں

ردیف الواؤ

۱۴۳

ہے برق دیدِ چشمِ تماشا جو تو نہ ہو
سب سامنے ہوں اور کوئی رو بہ رو نہ ہو
غوغاے حسن و ناز کا کیوں کر غلو نہ ہو
غماز اک جہان ہو اور جس میں تو نہ ہو

ہے کس جگہ رقیبِ پریشاں کہ تو نہ ہو
یہ شامتِ وفا کہیں مرگِ عدو نہ ہو
شوخی کے لاکھ شیوے ہیں ، پر یہ ادا ہی کیا
جس میں کہ تو ہی تو ہو ، وہی آرزو نہ ہو
ہر شکل میں ظریف و تنک ظرف کا ہے فرق
جو شکل رہنِ جام ہے ہرگز سبو نہ ہو
ہے ہے خیالِ یار دلِ تنگ میں بندھا
گھٹ گھٹ کے دوسرا یہ دلِ تند خو نہ ہو
دیوانگی و رشک ہے دیوانگیِ رشک
دامن کو پھاڑیے تو گریباں رفو نہ ہو
ضبطِ نیاز ہی سے ہے مختل دماغِ ناز
بلبل جو رنگ فہم ہو تو گل میں بو نہ ہو
یہ جامِ جم ہی تھا کہ بھرا اور چھلک گیا
ہرگز فقیرِ دیر کا سر کش کدو نہ ہو
وہ کیا کرے گا کوثر و حورانِ خلد کو
جس کو کہ ذوقِ بادہ و روے نکو نہ ہو
بے عقل ہے جو داد نہ دے تیرے جور کی
بیہودہ ہے جسے ادبِ گفتگو نہ ہو
محتاج کش سپہر و جہاں بے غرض تلاش
وہ کامیاب ہے جو کبھی کامجو نہ ہو
آتے اگر وہ طور پہ بہتی ہی نہرِ خوں
اتنی کہاں ہے تاب کہ پتھر لہو نہ ہو
کیوں کر قلق فلک سے نبھے گا یہ اتفاق
بس میں جو یار آئے تو قابو میں تو نہ ہو

١٤٤

مشتِ غبار اپنا اگر کو بہ کو نہ ہو
طوفانِ برق و بادِ شکار نمو نہ ہو
ممکن کہ حرفِ رازِ فشارِ گلو نہ ہو
اور طرزِ خامشی ہدفِ گفتگو نہ ہو
اُمید کچھ گھٹے تو بڑھادوں ترا خیال
آغوشِ تنگِ غیر میں جا ہی کبھو نہ ہو
کس طرح بزمِ وعظ میں مستوں کا جی لگے
خم تو بھرا ہوا ہو جو سیلابِ جو نہ ہو
کیا جانیے غبار ہوں کس دل کا میں کہ سر
گرجائے دوش سے بھی تو ہرگز فرو نہ ہو
کیا شانہ گرد گرد جو تکیہ نہ سر کا ہو
کیا زلف پیچ پیچ جو بندِ گلو نہ ہو
دل ہو ہزار پارہ و ہر پارہ لاکھ شان
کیا خاک ہم مٹے جو تمھاری نمو نہ ہو
کس کس کو میں بتاؤں کہ تو نے چھڑا دیا
شامت بھی میری آئے تو ہمدم کبھو نہ ہو
محفل میں اس کی ہوں پسِ دیوار ہائے ہائے
کچھ شرمِ عشق ہو تو خیالِ عدو نہ ہو
تو دیکھ تو ادھر کہ جو دیکھا نہ جائے پھر
تو گفتگو کرے تو کبھی گفتگو نہ ہو
اٹھ جائے رسمِ رنجشِ باہم جہان سے
ہر گھر میں ذکر تیرا اِدر کو بہ کو نہ ہو

ہر رنگ میں نیا ہے تماشائیوں کا جوش
گل کیوں کہ پائمال تہِ رنگ و بو نہ ہو
حیران ہے وہ آپ ہی، اپنی تلاش میں
کیوں کر نگاہِ ناز، غلط سو بہ سو نہ ہو
مے سے عروجِ نشہ ہے اور نشے سے عروج
تحت الثریٰ وہ خاک کہ جس سے سبو نہ ہو
کم بینیِ زمانہ ہے، سنگِ ہر آئنہ
ہے حفظِ آبرو، جو سرِ آبرو نہ ہو
بڑھتی ہے یاد خندۂ زخمِ دلِ **قلق**
اتنی بھی اے نسیمِ سحر، مشک بو نہ ہو

۱۴۵

ہم کو اگر خیالِ خمِ مو بہ مو نہ ہو
نالہ لبوں تک آتے ہی، طوقِ گلو نہ ہو
بدخو کبھو نہ ہو، جو کوئی خوب رو نہ ہو
یکتائی کا خیال نہ ہو، دو بدو نہ ہو
نے تختہ بند در ہو، نہ دیوار ہو بلند
شوخی سے تو ہر اک کے اگر رو برو نہ ہو
دل کا اگر سراغ نہ ہو زلفِ یار میں
اتنی شکستگی و شکن مو بہ مو نہ ہو
اپنا صفاے دل، رخِ مہ پارہ بن گیا
یک دل کوئی رقیب نہیں، جو دو رو نہ ہو
اندازہ آدمی کا کہاں، گر نہ ہو شراب
پیمانہ زندگی کا نہیں، گر سبو نہ ہو

افسردہ طبع دور ہے ، گرمیِ سعی سے
تارِ شعاعِ مہر سے ، دامن رفو نہ ہو
کتنا غلط ہے ، نامۂ اعمال کا سواد
ثابت اگر نماز ہو ، قائم وضو نہ ہو
اشکِ تپِ فراق ، جو دریا میں جا پڑے
تا حشر ، بہرہ یاب کبھی نم سے جو نہ ہو
کیوں ہر ستارہ ، چرخ کا اخگر بنے اگر
منظورِ چشم ، مہرِ رخِ ماہ رو نہ ہو
جو زخم بے نمک ہے ، وہ کیا زخم اے **قلق**
کیا لطف دوستی میں ، جو وہ ہی عدو نہ ہو

۱۴٦

فرطِ گریہ نے کیا قطرۂ سرگم مجھ کو
ڈھونڈھتا پھرتا ہے ، اب جوشِ تلاطم مجھ کو
یاد آ جاتا ہے اس کا ہی تکلم مجھ کو
مار ڈالے گی ، مسیحا کی کبھی قم مجھ کو
رنجِ اغیار نے ہمدرد بنایا تجھ کو
تیری صورت سے ہوا اپنا توہم مجھ کو
ہائے کس خاطرِ نازک کو غضب میں ڈالا
قہر پر آپ کے آتا ہے ترحم مجھ کو
شیونِ بت نہیں کعبے میں تو کیا رسم ہے یہ
چٹکیوں میں نہ اڑا گردِ تیمم مجھ کو
خلد میں بھی تو ٹھکانے نہ لگی خاک اپنی
مے کدے میں نہ کیا خشتِ سرِ خم مجھ کو

شعلۂ نارِ غضب ہے نمِ مژگاں تم کو
جوشِ طوفانِ قضا، موجِ تبسم مجھ کو
بعدِ مردن بھی گذارہ نہیں اُس کوچے میں
یعنی کہتا ہے مسیحا بھی تو قم قم مجھ کو
رحمتِ جنتِ ساقی کے کرم کی کیا حد
قطرے قطرے میں ملا نشۂ قلزم مجھ کو
بزم کو آپ کی جنت نہ کہیں گے کیوں کر
غمِ اغیار ہوا دانۂ گندم مجھ کو
رنجِ اعدا نے کیا مجھ کو بھی گستاخ و دلیر
ذلتِ عجز ہے اب تیرا تحکم مجھ کو
مردمی کا ہے ازل ہی سے یہاں پر ماتم
کالی آتی ہے نظر صورتِ مردم مجھ کو
آپ سے دور برا حال ہے اب تو اپنا
غیر سے مل کے سمجھتا ہوں ملے تم مجھ کو
بادہ کش ہو نہ جوانی میں تہی دست قلق
جامِ جم سے نہیں کم خاکِ تہِ خم مجھ کو

۱۴۷

نہ پوچھو ناتوانیِ فغاں کو
گرایا سر پہ میرے آسماں کو
چھڑایا ہم سے اُس آشوبِ جاں کو
نہ جانا پھر بھی قدرِ آسماں کو
ہوئی ہے خاک کس کی حسرتِ وصل
کہ اُڑ کر لپٹے ہے ہر کارواں کو

هر اک سودا ہے ساماں سے ہمارے
کہ سر سے جا ملے بارِ گراں کو

نہ بڑھ جاوے کہیں آگے وفا سے
روانی روک لے عمرِ رواں کو

ہجوم شوق کی کیا حد معین
کہ منزل سے ہے ضد اس کارواں کو

وہ کافر خو ہے میلانِ طبیعت
کیا پامال جس نے آسماں کو

توانائی فزا ہے ناتوانی
کہ فرصت تو ملے تاب و تواں کو

لگائے اُن کے پر ، اُس نے ہی مجھ تک[1]
لپٹ جا مدعی تیغِ رواں کو

مروت آسماں کی دیدنی ہے
کہ باراں میں جلایا آشیاں کو

نزاکت ہے **قلق** اُس کے ستم میں
کیا پامال مجھ سے نیم جاں کو

۱- شعر کا مفہوم واضح نہیں -

۱۴۸

تھک تھک گئے ہیں عاشق درماندۂ فغاں ہو
یا رب کہیں وہ غفلت فریادِ بے کساں ہو
یا قہر ہے وہ شوخی یا پردہ ہے نظر کا
دل میں تو اُس کا گھر ہو اور[1] آنکھ سے نہاں ہو
یہ شور بھر رہا ہے فریاد کا جہاں میں
جو بات لب پہ آئی اُلٹی پھری فغاں ہو
کس کس دعا کو مانگیں، کیا کیا ہوس نکالیں
اک جاں کدھر کدھر ہو، اک دل کہاں کہاں ہو
برگشتگیِ قسمت، یہ چھیڑ کیا نکالی
جو مدعائے دل ہو، وہ مدعیِ جاں ہو
مقدور تک تو اپنے، تجھ سے نبھائیں گے ہم
بے جان و دل ہیں حاضر گر قصدِ امتحاں ہو
صیاد میں نہیں ہوں، گم کردہ آشیاں ہوں
اے ہم صفیرو بولو، کس جا ہو اور کہاں ہو
اے آہ! دل سے اُٹھ کر لب پر ہے کیا تامل
جا شورشِ زمیں ہو، آشوبِ آسماں ہو
مٹ مٹ کے بھی ہمارا اک بن رہے گا ساماں
اُجڑے اگر بہاراں، آبادیِ خزاں ہو
جب بیٹھنے پہ آئے، اے ضعف بیٹھ رہیے
پھر کیا ہے یہ تکلف، اُس کا ہی آستاں ہو

۱- قلق نے معاصرین کی طرح ’ اور ‘ کو بر وزن ’ فع ‘ اکثر استعمال کیا ہے ؛ ہر جگہ نشان دہی طوالت کی وجہ سے نہیں کی گئی ہے - (مرتب)

تو ہی رہے گی بلبل یا میں ہی اس چمن میں
یا تیرا ہی ہو قصہ یا میری داستاں ہو
میرے سخن میں کیا ہے کچھ خال و خط بیاں ہے
پر دل سے اُس کے پوچھے جو کوئی نکتہ داں ہو
میرا سلام کہنا جھک[۱] کر **قلق** وہی ہے
اُس کی گلی میں بیٹھا ، موزوں سا جو جواں ہو

۱۴۹

دل کو نظروں میں لے گیا دیکھو
اس کو کہتے ہیں دل ربا دیکھو
میری اُلفت کو ، آزما دیکھو
تم بھی دل کو کہیں لگا دیکھو
خندہ ہائے نمک فشاں سمجھو
لطف ہائے ستم فزا دیکھو
موت میری اُنھیں ہے اب منظور
مجھ کو کہتے ہیں بے وفا ، دیکھو
اُن کے منھ پھیرنے کو کیجے غور
میرا حسرت سے دیکھنا دیکھو
تم پہ مرتے ہیں ، تم پہ مرتے ہیں
آزماؤ ، تو آزما دیکھو
اُن کے زانو پہ اور سرِ بے مغز
مرگِ دشمن کا حوصلا دیکھو

۱- اصل متن (ص ۱۳۲) میں ' جھلگر ' ہے - (مرتب)

نہ کرو قطع دستِ حیرت کو
نہ کرو پردہ رخ سے وا ، دیکھو
قدرِ ذکرِ جفا تمھیں بھی نہیں
شکوہ وہ لب پہ آ گیا ، دیکھو
قتلِ عالم اگر نہیں دیکھا
برقع رخ سے ذرا اٹھا دیکھو
دل لگانے کا امتحان کرلو
آگ گھر میں ذرا لگا دیکھو
قلق اس زندگی سے میٹھا ہے
زہر ساغر میں تم ملا دیکھو

۱۵۰

اچھی[۱] سی مری جان چلی ، دل کا برا ہو
دے دوں ابھی صدقے میں جو مٹھی میں دھرا ہو
بالیں پہ قضا سر بہ گریبان کھڑی ہے
حیرت سے وہ منہ دیکھتا ہے ، دیکھیے کیا ہو
ہیہات وہ نالہ جو سرِ عرش رسے تھا
پھوڑے کی طرح سینۂ بسمل میں اڑا ہو
دردا نفسِ سحر ادا ، معجزہ انداز
آغشتۂ خونابہ ہو اور صرفِ بکا ہو
افسوس وہ ایجادِ بیان ، جانِ مسیحا
ایہاے فغانِ ستمِ مرگ صدا ہو

۱- اس غزل کا عنوان اصل متن میں 'قطعہ بند' ہے - (مرتب)

ھے ہے وہ اشارہ جو لگا لائے تھا اُس کو
یوں درد فزا ، حادثہ زا ، مرگ نما ھو
وہ آنکھ جو مستی میں نہ کھلتی تھی سرِ بزم
جوں دیدۂ بسمل الم نزع سے وا ھو
وہ حرفِ تمنا کہ دمِ روحِ[۱] رواں تھا
کج مج ھو کچھ اس طرح کہ پیغامِ قضا ھو

۱- ' روح رواں ' کی صفتی ترکیب پر مولانا تاجور مرحوم نے رسالہ ادبی دنیا (۱۹۳۱ع؟) میں اعتراض کیا تھا اور صحیح ' روح و رواں ' مرکب عطفی کو قرار دیا تھا ۔ ' رواں ' کے بارے میں مؤلف غیاث اللغات تحریر کرتے ھیں :
'رواں' بہ فتح بہ معنی فی الحال و زود و بہ معنی ھر چیزے کہ بالغ و جاری باشد و بہ معنی روندہ و بہ معنی روح و جان و نفس ناطقہ ۔ و بعضے گویند کہ 'رواں' نفس ناطقہ را گویند و جان روح حیوانی را گویند و نفس ناطقہ را رواں ازاں گویند کہ همیشہ در حرکت فکری ست ۔ و کسانے کہ لفظ رواں را بہ معنی روح بہ ضم خوانند خطاست ۔ از رشدی و کشف و مدار و سروری و لطائف و مؤید و برھان و جہانگیری و در سراج اللغات و لطائف از رسالہ معراجیہ شیخ ابوعلی‌سینا منقول است کہ مراد از ' رواں ' نفس ناطقہ است و از جان روح حیوانی ۔ (غیاث اللغات مع چراغ ھدایت ص ۲۰۰ ، ۲۰۱ مطبع نول کشور ۱۸۹۵ع) - فرھنگ عمید (ص ٦٣٠) میں ' رواں بہ فتح را بہ معنی جان ، روح ، اسم اور بہ معنی روندہ ، گذراں صفت ھے ۔ مؤلف ھفت قلزم (ج ۳ ص ۲۳)

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

افسوس ہے ، افسوس ہے ، افسوس ہے ، افسوس
کہتے تھے **قلق** تم کو حسینوں کو نہ چاہو

۱۵۱

دیکھوں تجھے مگر تری جانب نظر نہ ہو
کیا خوف مدعی کا مجھے رشک اگر نہ ہو
صحرا نوردِ عشق کو کیوں کر خطر نہ ہو
ہوتی ہے شام واں کہ جہاں پر سحر نہ ہو
بیداد کی بھی چشمِ مروت اگر نہ ہو
اتنا رہے نگاہ[1] کہ ہم پر نظر نہ ہو
سر اُس کے دوش پر جو حریفِ خطر نہ ہو
دل اُس کے بر میں ، پہلو میں جس کے جگر نہ ہو

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)
لکھتے ہیں : 'رواں' بہ فتح اول و واو بہ الف کشیدہ و سکون نون بہ معنی جان و نفس ناطقہ و روح آمدہ و معنی محل جان کہ بدن باشد ۔ نیز گفتہ اند بعضے برآنند کہ مراد از رواں نفس ناطقہ است و از جان روح حیوانی و معنی فی الحال و زود ہم از نظرگزشتہ ، و معنی راہ رفتن معروف است و در لسان الشعرا بجاے فتح راے مہملہ ضم ہم نوشتہ ، اعتماد را نشاید ۔'' **قلق** نے مرکب توصیفی استعمال کیا ہے اور اسے غلط نہیں کہہ سکتے ۔ اسی طرح ' رواں ' کو بہ ضم را صحیح کہنا بھی درست نہیں ۔ (مرتب)

۱۔ ' نگاہ رہنا ' بہ معنی نگاہ رکھنا (خیال رکھنا) **قلق** نے استعمال کیا ہے ۔ (مرتب)

کیوں کر جنوں علاج سے اے چارہ گر نہ ہو
کب تک خیالِ رخنۂ ہر نیشتر نہ ہو

نازل ہو آسماں سے بلا ، یاس اگر نہ ہو
یہ وہ دعا نہیں ہے کہ کچھ بھی اثر نہ ہو

بسمل کبھی نظر نہ ہو ، ٹکڑے جگر نہ ہو
تیری نگاہِ مہر اُدھر ہے ، جدھر نہ ہو

کیوں آفتیں اٹھیں کہ چلے اس گلی سے ہم
کیا کیجے در پہ بیٹھ کے جب وہ ہی گھر نہ ہو

دل سے ترے اٹھے تو کرے عرش پائمال
اپنا ہے یہ غبار تری خاکِ در نہ ہو

وعدے نہ یاد آئیں نہ بےتاب ہوں اگر
روز و شبِ فراق میں ، شام و سحر نہ ہو

آ جائے اپنے ظرف پہ گر تیرا دردمند
دریا میں بھی ڈبوئیے تو چشم تر نہ ہو

ایسی ہے نرم نرم یہ نوکِ مژہ تری
سخت اس قدر کبھی جگرِ نیشتر نہ ہو

طولِ شبِ فراق کا شکوہ نہ کیوں کریں!
زلفِ دراز اور بھی آشفتہ تر نہ ہو

ناصح ہی کو بلاؤ ، بڑے دردِ دل تو کچھ
'دل کوب' کوئی بات ہو ، پتھر اگر نہ ہو

مرنے سے پہلے وصل ہو اے شوق جب ہے لطف
وہ بات ہے خیال میں جو عمر بھر نہ ہو

رحمت کا جوش ، العطشِ بادہ خوار ہے
نہرِ جناں ہو خشک جو دامانِ تر نہ ہو

عیسیٰ کا خون اُس لبِ جاں بخش نے کیا
کیوں کر سیاہ دامنِ آبِ خضر[1] نہ ہو

منظور قدسیوں نے بنایا نہیں رقیب
ورنہ ہمارا نالۂ دل کارگر نہ ہو

میں اجنبی نہیں کہ رہوں کوے یار میں
قدرِ وطن نہیں، جسے رنجِ سفر نہ ہو

قاتل بھی گر کہے کہ ہوا قتل مفت میں
تو بھی تو کچھ صفائیِ پیغام بر نہ ہو

جنبش محال ہے تری رفتارِ ناز سے
یہ دل ہے مدعی کا ترا سنگِ در نہ ہو

تو غیر سے وبال میں، میں تجھ سے نالہ کش
دونوں کا ایک حال ہے الفت اگر نہ ہو

وہ ہی عدو کی چاہ ہے، وہ ہی ہے چہرہ فق
سو رنگ سے ملوں جو وہ اک وضع پر نہ ہو

کیوں دیر میں بتوں سے ملے کعبہ چھوڑ کر
گھر میں خدا کے خوف بھی ہو تو خطر نہ ہو

وامانده سب کو قیدِ تعلق نے کر دیا
کیوں غرق ہو خدنگ جو پامالِ پر نہ ہو

۱- اصل متن (ص ۱۳۵) میں 'آب حضر' غلط ہے۔ 'آب خضر' کے معنی شمس اللغات جلد اول (ص ۳) میں حسب ذیل ہیں:
آب حیات و حیات ابدی، و علم لدنی و در 'مؤید' بہ معنی اول است۔ این بیت کمال سپاہانی:
در کلک تو سر غیب مضمر   در لفظ تو آب خضر مدغم

چپ رہنے کا مقام ہے خاموش اے **قلق**
اُس کو ہی کچھ خبر ہے جسے کچھ خبر نہ ہو

۱۵۲

کھلا ہے پھر کے درِ مے کدہ مبارک ہو
معاشروں کو نویدِ صلا مبارک ہو
سنا ہے روزِ خوشی شامِ غم کے بعد میں ہے
دلِ غمیں کو نزولِ بلا مبارک ہو
اسی شعار سے بدنام ہو گئے ہم تو
تمھیں عدو سے سلوکِ وفا مبارک ہو
عناں گسستہ ہیں یاں بوے گل سے پہلے ہم
چمن کی سیر تجھی کو صبا مبارک ہو
نظر لگی ہوئی ہے اُس پہ سرفروشوں کی
کہیں یہ زیبِ کمر 'نیمچا'[1] مبارک ہو
تمام عمر پیا ہے یہاں فشردۂ دل
خضر! تجھی کو یہ آبِ بقا مبارک ہو
نکال دے مرے جو جو کہ دل میں ارماں ہیں
یہ تیرا تجھ کو ہی خلوت کدہ مبارک ہو
وہ بدگمان سا ہے بدگمان اے ارماں
خدا کرے کہیں آنا ترا مبارک ہو
قلق نحوستِ اُلفت سے میں نہیں خائف
تری بلا سے مبارک کہ نامبارک ہو

۱- نیمچہ : ص ـ لباس کوتاہ ، شمشیر یا تفنگ کوتاہ ، ہر چیز کوتاہ و ناقص ـ (فرہنگ عمید ، ص ۱۲۱۳)

۱۵۳

تقدیر کا معارضہ تدبیر سے نہ ہو
جو خاک سے ہو وہ کبھی اکسیر سے نہ ہو

اے صبر دل! جدا دلِ دلگیر سے نہ ہو
وہ کام آ پڑا ہے جو تقدیر سے نہ ہو

شان و شکوہ کی نہیں پرسش گدا کے ہاں
ذلت کا میری سامنا توقیر سے نہ ہو

کیا داغِ دل بجھے گا تجلیِ طور سے
خورشید خیرہ ماہ کی تنویر سے نہ ہو

غفلت کا میری حال انہیں سے نہ پوچھ لو
یوسف کو عذر خواب کی تعبیر سے نہ ہو

صیادِ سنگ دل کو اسیرون پہ رحم کیا
فولاد نرم نالۂ زنجیر سے نہ ہو

دشمن سے جو لگی ہے اُچٹ جائے گی وہ آنکھ
بے چین میرے نالۂ شب‌گیر سے نہ ہو

جس جا ہے حسن رنج کا واں کام ہی نہیں
تصویر نالہ کش کبھی تصویر سے نہ ہو

وہ دردِ زَرد فزِد جو بڑھے جاں کے ساتھ ساتھ
بڑھیو وہ زخم دل کہ جدا تیر سے نہ ہو

گر دو جہاں ہوں خاک تو دامن سے دے جھٹک
پر نرم دل وہ آہ کی تاثیر سے نہ ہو

چل اے قلق منا کے اُسے ہم ہی لائیں گے
وہ کام آ پڑا ہے جو تقدیر سے نہ ہو

۱۵۴

پھرے ہے ساتھ میرے جورِ گردوں داد خواہی کو
تباہی سی تباہی ہے مری شامل تباہی کو
نہ کیوں کر لطف الفت کا سمجھیے کینہ خواہی کو
نگاہِ بے محابا کر دیا ہے کم نگاہی کو
ہماری پرسشِ اعمال اور بے حس فرشتوں سے
ملے ہیں کیا ہی اہلِ دل محبت کی گواہی کو
کنویں میں ایک کیا یوسف کا گرنا مصر میں پھرنا
لگا لاتے ہیں لاکھوں راہ پر گم گشتہ راہی کو
مغاں کا شعبدہ دیکھو اٹھا کر پردۂ وحدت
کیا دربانِ بت خانہ حریمِ قبلہ گاہی کو
ادھر ہے دیرِ تیرہ دل ادھر اسود ہے تیرہ رو
کروں کس جا پشیماں یارب اپنی روسیاہی کو
نہ پوچھو عمرِ فرقت کی حقیقت ہر نفس ہر دم
قضا سو بار آئی زندگی کی عذرخواہی کو
نہ کرنا رحم بھی کتنا برا ہے کوئی ہو اس میں
کیا ہے عصمتِ یوسف نے رسوا بے گناہی کو
ہجومِ چشمِ حیراں ذرے ذرے سے صف آرا ہے
دکھایا آسماں نے کس تجمل سے تباہی کو
کہاں کو جائیے بے دست و پائی کے سہارے پر
کدھر لے جائیے کوچے سے تیرے بے پناہی کو
خلش جائے تو کیا جائے کہ خلجاں اور باقی ہے
بچایا آبلہ پائی سے میری خارِ ماہی کو

وہ مارا حسن نے ہم کو طرف داری کے دھوکے میں
وہ روکا تیغِ ابرو پر خدنگِ کج کلاہی کو
قلق کیوں چھوڑتا دھلی کو کیوں میرٹھ میں آ رھتا
گدائی کے بھروسے پر لٹایا بادشاھی کو

۱۵۵

گر شرم چشمِ یار میں دامن کشاں نہ ھو
خیرہ کشیِ ناز کسی پر عیاں نہ ھو
کچھ بھی نہ ھو تلاش اگر آسماں نہ ھو
کیا سعی سے حصول جہاں رائگاں نہ ھو
دل میں کچھ آرزو ھو تو منہ میں زباں نہ ھو
کیا شرح سے حصول جو ھرگز بیاں نہ ھو
تسکیں کسی طرح نہیں ھوتی کہے بغیر
غماز جب تلک کہ مرا رازداں نہ ھو
اب کیا اٹھا رکھیں گے جو مرنے پہ جی دھرا
ھو امتحاں، جو قاعدۂ امتحاں نہ ھو
اے چرخ گر ھمیں کو کیا تو نے انتخاب
کر وہ ستم پسند کہ پھر جاوداں نہ ھو
ھر ایک خبط رکھتا ھے سو شکلِ دل فریب
کیا شے ھے دل ربا جو دلِ بد گماں نہ ھو
طرزِ فروتنی ھے بد آموزِ سرکشی
کیوں تیز برق ھو جو مرا آشیاں نہ ھو
کافی ھے ھم کو ایک ھی جھونکا نسیم کا
اے رنگ و بوے گل ستمِ باغباں نہ ھو

اے ذوق قدرِ لذتِ آزار چاہیئے
دل ہو جگر ہو زخم ہو اور جسم و جاں نہ ہو

کیا سرگذشتِ راہ بتائے کوئی یہاں
منزل جہاں ہو حیف وہیں کارواں نہ ہو

کیا تاب ہے عدو کی جو بے ساختہ کہے
احوال میرا آپ کا رازِ نہاں نہ ہو

اپنا بھی سنگِ کعبہ سے ٹکرایا ہی تھا سر
گر پائے نازنینِ صنم درمیاں نہ ہو

جنت میں ہجرِ یار نہیں ہے تو اے **قلق**
تیرہ وہی زمیں ہے جہاں آسماں نہ ہو

ردیف الہائے ہوز

۱۵۶

طوفاں کشا ہے گریہ دمِ آتشیں کے ساتھ
خیر آسماں کی بھی نہیں اب زمیں کے ساتھ

کیوں کر نبھے گی یوں دلِ رشک آفریں کے ساتھ
یاد اس کی لب گزا ہے دمِ واپسیں کے ساتھ

آساں انھیں شکایتِ اخلاصِ مدعی
مشکل ہمیں نباہ دلِ خشم‌گیں کے ساتھ

اے چرخ تو نے کیا نہ کیا پر نہیں کیا
رسوائے بزمِ ناز کسی نازنیں کے ساتھ

واں ساحری ہے عشوۂ پرکار کی شریک
یاں سادگی ہے شوقِ فریب آفریں کے ساتھ

ارماں یہاں اخیر وہاں ابتدائے حشر
اے حرص کیوں خراب ہے دنیاو دیں کے ساتھ
ناصح کے منہ کو سیتا ہوں جوشِ جنوں میں میں
دامن کو اپنے ٹانکتا ہوں آستیں کے ساتھ
شیوہ ہے بےوفائی کا تم کو اگر پسند
ہرگز نہ ہوں گے ہم بھی تمہاری نہیں کے ساتھ
پامال تیرا شومیِ اختر سے کیا لڑے
کیا خاک کا معارضہ چرخِ بریں کے ساتھ
کس کو پڑی ہے نعش اٹھانے کی میری پھر
جب تو روانہ ہوگا دم واپسیں کے ساتھ
کیا کیا ہے نامرادیِ عاشق سے شاد شاد
ظاہر ہے رنج عشوۂ جادو کمیں کے ساتھ
غم خوار ہے تو یاں غم ہجراں میں ساتھ دے
اے پندگو وہاں کی رفاقت وہیں کے ساتھ
اس ضعف میں قلق یہ تعدیِ انتظار
دم جائے گا نکل نگہِ دوربیں کے ساتھ

۱۵۷

قاتل نے میرے دل کو جو دیکھا لگا کے ہاتھ
آخر کو تیغ چھوٹ گئی تھر تھرا کے ہاتھ
صانع نہ کیوں کہ چومتا اس پر جفا کے ہاتھ
قدرت کو اپنے ہاتھ سے کھویا بنا کے ہاتھ
ثابت قدم نہ یہ ہے نہ وہ قول کا درست
اغیار کے نہ پاؤں نہ اس بےوفا کے ہاتھ

ہم دوش تجھ سے رہتے ہیں اغیارِ بوالہوس
رکھ دور زخمِ دل سے مرے جا بجا کے ہاتھ

آخر تو بردباریِ خون تیرے سر پہ ہے
ہلکا نہ ہو تو تیغ کا اوچھا لگا کے ہاتھ

مرنا پڑا نہ ہجر میں آخر کہ وقتِ وصل
ہر بار روکتے تھے وہ مجھ کو چھڑا کے ہاتھ

خود رفتہ مجھ کو کہتے ہیں وہ بار بار کیوں
اپنی خبر منگائیں کسی آشنا کے ہاتھ

یہ تیز ہے جنوں کہ رکھوں ہوں ہٹا کے پاؤں
کرتا ہوں چاک جیب کو لیکن بچا کے ہاتھ

میں اور بزمِ غیر میں آنا ترے لیے
اندھا ہوا ہوں شوق میں لینا بڑھا کے ہاتھ

آخر وبالِ زیست ہوئی تہمتِ وصال
لو دشنۂ فراق نے کاٹے قضا کے ہاتھ

اس کی گلی میں بیٹھ کے کیا کم ہے یہ عروج
ایسی تو خاک اڑی کہ نہ آئی صبا کے ہاتھ

آخر کو مٹ مٹا کے ہوئے صاف اس قدر
آئینۂ غرور لگا خود نما کے ہاتھ

ناصح نہ اتنا کھلیے تکلف اسی میں ہے
بستہ ہی رہنے دیجے مری التجا کے ہاتھ

سودائے مفت فرطِ مروت سے ہو گیا
اس دل کو اب تو ڈال قلق بے وفا کے ہاتھ

ردیف الیا

۱۵۸

نہ انتظارِ مسافت نہ فکرِ یار مجھے
جہاں قدم نہ اٹھا وہ ہے کوے یار مجھے

ادا ادا سے جو کرتے ھیں بےقرار مجھے
وہ جانتے نہیں شاید وفا شعار مجھے

یہ مٹتے مٹتے ملی شکلِ اعتبار مجھے
کہ اس کے دل کا فلک نے کیا غبار مجھے

جیوں گا خاک حد وعدہ تک کہ کھینچتا ھوں
میں انتظار کو اور تابِ انتظار مجھے

سڑے گی خوب شرابِ طہور جنت میں
ملا نہ کوئی بھی کعبے میں بادہ خوار مجھے

هزار شان سے وہ کیوں نہ جلوہ فرما ھو
کہ ایک شکل سے رھتا نہیں قرار مجھے

نگاہِ مہر کا حائل نہ کس طرح سے رھوں
کہ پائمالِ فلک نے کیا غبار مجھے

یہی ادا ملک الموت یہ ھی عیسیٰ ہے
وہ بات بات پہ کہتے ھیں جاں نثار مجھے

بتوں کے پاؤں سے اب سر اٹھے گا کیا میرا
کیا ہے ناصحِ ناداں نے شرمسار مجھے

عدو سے آج بگڑ کر وہ سرنگوں کیوں ھیں
حیا و شرم سے ایسی ہے ننگ و عار مجھے

اڑے گی خاک جہنم کی بھی برا کیا ہے
اگر سمجھتا ہے زاہد تباہ کار مجھے

بجا بجا نہ کہوں بات بات پر کیوں کر
کہ کچھ نہیں ہے محبت کا اعتبار مجھے

تمام عمر یہ گزری ہے کاوشوں میں کہ بس
ہر ایک نقشِ قدم تھا مرا مزار مجھے

نہ اتحاد اسے اور نہ اعتماد آسے
اک اپنے دل ہی پہ ہے جبرِ اختیار مجھے

پسِ فنا بھی تو خمیازہ کش ہے میرا غبار
مےِ وصال کا یاں تک رہا خمار مجھے

ہزار زلزلۂ حشر و یک نقاہتِ دل
اٹھانے آتے ہیں اس در سے بار بار مجھے

خودی سے تابہ خدائی سبھی تو بھول گئے
بنایا کس کے تغافل کا یادگار مجھے

خزاں میں برق نہ کس طرح دم بہ دم گرتی
کہ خوب یاد ہے رعنائیِ بہار مجھے

قدم قدم پہ لرزتا ہے میرا تو ایماں
کیا ہے توبہ نے کیسا گناہ گار مجھے

یہ پردہ داریِ حیرت دمِ وصال ہوئی
میں اس کو دیکھتا تھا اور وہ بار بار مجھے

یہ دردمند رہا سحرِ نرگسِ فتاں
ہزار یاس میں رکھا امیدوار مجھے

چھٹے سے چھٹ نہیں سکتا جو قیدِ دل میں پھنسا
نہ اختیار تمھیں ہو نہ اختیار مجھے

قلق کہاں سے میں لاؤں ترے لیے آرام
ابھی تو خلد کو لے لوں جو دیں ادھار مجھے

۱۵۹

کیا سرکشی پسند ہمارا نیاز ہے
لو شرمسار سب کی نگاہوں میں ناز ہے

شوخیِ ناز دیکھیے کیا حیلہ ساز ہے
آنکھوں میں اشک لب پہ فغاں دل میں راز ہے

دیکھا جو مجھ کو بزم میں کٹ کٹ گئے رقیب
میری نگاہِ شوق بھی کیا دشنہ باز ہے

بے دل ہوئے وہ اور بھی افسانے سے مرے
جو حرف درد خیز ہے سو دل گداز ہے

دامن ہمارے ہاتھ میں اور اس کا حشر کو
کوتاہیِ خیال ہے دستِ دراز ہے

سر لے کے بھی تو دیر میں کرتے نہیں قبول
سجدے سے جو ادا ہو وہ کیسی نماز ہے

سرکش کا ہے سدا ادب آموز ، خاکسار
خورشید اس جلال پہ ذرہ نواز ہے

اس کی جفا و مہر سے پر بیم رحم و قہر
دشوار وصل و ہجر میں اب امتیاز ہے

مجنون و کوہ کن ہی نو آموزِ راہ تھے
ہموار اک قدم میں نشیب و فراز ہے

بے چین اس کا دل ہے نہ دشمن کا گھر ہے خاک
کیا نا رسا ہے آہ سدا چرخ تاز ہے

جھکتی ہوئی نظر ہے تو دبتی[1] ہوئی حیا
کیا ناز کا گلہ کہ سراپا نیاز ہے
امید کی ہے منزلِ مقصود واں قلق
بے چارگیِ یاس جہاں چارہ ساز ہے

۱۶۰

پڑا ہے دیر و کعبے میں یہ کیسا غل خدا جانے
کہ وہ پردہ نشیں باہر نہ آ جانے نہ جا جانے
وہی ہے رازدانِ دل جفا کو جو وفا جانے
اسے ہی قدرِ یوسف ہے جو تہمت کو لگا جانے
وفا پر میری غش رہوے جو وہ طرزِ جفا جانے
گرے ٹھوکر کے ساتھ اپنی جو کچھ دل سے لگا جانے
نہ کیوں کر دیدۂ غم شو ڈبوئے گا مجھے آخر
ہوا جو رازداں اس کو نہ ہرگز آشنا جانے
اٹھے امید جو دل سے وہی ہے ناز اگر سمجھے
جو اچھی شکل موت آئے اشاراتِ ادا جانے
پےِ ذکرِ عدو موجِ تبسم لب میں پھرتی ہے
دمِ عیسیٰ کو کیوں کر ہوگیا رعشہ خدا جانے
نہیں کچھ مستیِ بزمِ عدو کی جب خبر تجھ کو
یہ بکھری زلف کیا شے ہے ہماری بھی بلا جانے
کہاں یہ خضر میں جرأت کہ در تک اس کے جا پہنچے
جو پہلے جاں کو دے بیٹھے وہی دل کو چلا جانے

---

۱ - 'دیتے' اصل متن (ص ۱۴۲) میں غلط، 'دبتی' تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

۶۱۷

تکلف آدمی کا عاشقی میں بھی نہیں جاتا
وگرنہ جس جگہ مر جائے کوے دل ربا جانے

چھڑا دے گی یہ صحبت غیر کی سب سے تجھے آخر
ترے ہاتھوں سے چھٹنا ورنہ کیا رنگِ حنا جانے

اسیری حیف اُس نخچیر کی جس کی یہ بے قدری
اسیرِ دام ہو اور آپ کو ہر دم رہا جانے

تکلف کیا ہے مرجانے میں ایسے بے تکلف پر
نہ رسمِ پردہ کو سمجھے نہ آئینِ حیا جانے

بنے گا آدمی کس دن الٰہی وہ بتِ سرکش
جو خود کو کبریائی سے معاذاللہ خدا جانے

نہیں برگشتہ قسمت کا مری چارہ کہ بے چارہ
سفارش جو کرے میری اُسی کو وہ گِلا جانے

اگر سمجھے کوئی اہلِ زمانہ کی صفائی کو
کدورت جس جگہ دیکھے اُسے بزمِ صفا جانے

نہ جانے حجِ کعبہ کو جو رمزِ دیر کو سمجھے
نہ چومے سنگِ اسود کو جو طرزِ نقشِ پا جانے

قلق دل اور افسردہ ہوا قصہ ترا سن کر
رلائے وہ ہمیں جو آگ پانی میں لگا جانے

۱۶۱

کوئی کیسا ہی ثابت ہو طبیعت آ ہی جاتی ہے
خدا جانے یہ کیا آفت ہے آفت آ ہی جاتی ہے

وہ کیسے ہی چلیں تھم تھم قیامت آ ہی جاتی ہے
بچے کوئی کسی ڈھب سے پہ شامت آ ہی جاتی ہے

ستم کر کے ستم گر کی نظر نیچی ھی رھتی ھے
برائی پھر برائی ھے ندامت آ ھی جاتی ھے
زلیخا بےخرد ، آوارہ لیلیٰ ، بدمزہ شیریں
سبھی مجبور ھیں دل سے محبت آ ھی جاتی ھے
چراغ و شمع بزمِ یار کر کر (کذا) غیر کو پھونکا
دلِ افسردہ میں آخر حرارت آ ھی جاتی ھے
ھوا نظروں ھی نظروں میں وہ محشر برقِ صد خرمن
محبت کی نگاھوں سے شرارت آ ھی جاتی ھے
پسینہ آ گیا اُن کو کیا وعدہ جو آنے کا
بری ھے ناز برداری نزاکت آ ھی جاتی ھے
ھر اک سے اب وہ کہتے ھیں کہ لو ھم پر یہ مرتے ھیں
جییں گے اس طرح کب تک کہ غیرت آھی جاتی ھے
نہیں کچھ دل کا پھرنا عہدِ دشمن سے ترا پھرنا
مگر کچھ سوچ کر آخر مروت آ ھی جاتی ھے
نہ ھوتی گر نویدِ مرگ کیوں کر ھجر میں جیتے
محبت میں بھی آسائش پہ نیت آ ھی جاتی ھے
وصالِ غیر کے قصے کو سن کر کیا تڑپتا ھوں
یہ ارماں کوئی جا سکتا ھے حسرت آ ھی جاتی ھے
اگر صد سال کیجے شکرِ اُلفت کیجیے لیکن
یہ وہ شیوہ ھے بد ظن پھر شکایت آ ھی جاتی ھے
قلق خط غیر کا کیوں کر نہ آتا کیوں نہ تم پڑھتے
قضا لکھی ھوئی حضرت سلامت آ ھی جاتی ھے

۱٦۲

دل کے ہر جزو میں جدائی ہے
کیا بلا وصل کی سمائی ہے

نارسائی ، سرِ رسائی ہے
ضعف کی طاقت آزمائی ہے

جام و مینا پہ نور برسے ہے
کیا گھٹا مے کدے پہ چھائی ہے

یوں تو وہ عالم آشنا ہے مگر
اک مجھی سے ذرا لڑائی ہے

تو ملا غیر سے کہ خاک میں ہم
عاقبت ہر طرح صفائی ہے

تم جدا غیر سے ہوئے تھے کب
واجبی طعنِ بےوفائی ہے

اے **قلق** ہم سے تو ملا کر یار
خالص الفت میں کیا برائی ہے

۱٦۳

وہی وعدہ ہے ، وہی آرزو وہی اپنی عمرِ تمام ہے
وہی چشم ہے ، وہی راہ ہے ، وہی صبح ہے ، وہی شام ہے
وہی خستہ حال، خراب ہے ، وہی خواب کشتۂ خواب ہے
وہی زندگی کو جواب ہے ، نہ سلام ہے، نہ پیام ہے
وہی جوش نالہ و آہ میں ، وہی شعلہ جانِ تباہ میں
وہی برقِ یاس نگاہ میں جو خیال ہے ، سو وہ خام ہے

وهی خواب و خور کی تلاش ہے وهی جان‌ودل میں خراش ہے
وهی رنجِ غیرِ معاش ہے ، مجھے زندگی بھی حرام ہے
وهی هجر دشمنِ وصل ہے ، وهی مرگ‌وزیست‌میں فصل ہے
وهی اپنے شغل سے شغل ہے ، وهی اپنے کام سے کام ہے
وهی شق جگر، نہ سیو، سیو، وهی زیست ہے، نہ جیو، جیو
وهی خونِ دل نہ پیو ، پیو ، وهی بادہ ہے ، وهی جام ہے
وهی شوقِ راہ ہے رهنما ، وهی جلوہ‌گاہ ہے رخ کشا
وهی بزم ناز ہے جا بہ جا وهی هر قدم پہ مقام ہے
وهی نیم جان دَمِ واپسیں ، وهی نالہ کش ، سخنِ حزیں
وهی یاسِ زیست ہے دل نشیں کہ زباں پہ آپ کا نام ہے
وهی رنج ہے تو یوں هی سہی ، وہ **قلق** هی تھا کہ یوں هی نبھی
مری آپ کو بھی ہے بندگی ، مرا عشق کو بھی سلام ہے

۱٦۴

مجھ کو مارا ہے مروت نے وفا سے پہلے
صدمہ انگیز ہے جان طرزِ جفا سے پہلے
فیصلہ اپنا هوا روزِ جزا سے پہلے
بے خطائی نے کیا قتل ، خطا سے پہلے
میری تعزیر مسلم ہے خطا سے پہلے
هوش جاتے هیں مرے هوش ربا سے پہلے
تلفِ حق کی سزا ہے کہ پھرے ہے مارا
تجھ سے تھے اور بھی اے خضر پیاسے پہلے
هائے ایذائے محبت کہ ترا کوئی نہیں
عشقِ و آرام چھٹے ، رنج و بلا سے پہلے

مجھ کو اس جرم پہ مارا کہ گنہ گار نہ تھا
اس نے یہ لطف کیا مجھ پہ جفا سے پہلے
ہائے بے قدریِ انداز ، پسِ خلق کشی
وائے آوارگیِ ناز ، ادا سے پہلے
رحم ، بے رحمیِ معشوق پہ کس کس کو نہیں
کہ قضا آتی ہے بیکس کی قضا سے پہلے
قید آدم کی ہمیں یاد ہے حوا کے لیے
سلسلہ کوئی نہیں ، زلفِ رسا سے پہلے
اتنا ہے ہوش کہ تھا ہوش بھی ، ہمدم کوئی
ناز سے ، عشوے سے ، ایما سے ، ادا سے پہلے
پرسشِ حشر ہے ، بیدردیِ داور کی دلیل
ہوں وہ فریاد ، جو اٹھی تھی صدا سے پہلے
تیرے مایوس کی تشویش مٹانے کے لیے
فتنۂ حشر اٹھا ، دستِ دعا سے پہلے
خلق ہوتی نہ اکٹھی ، نہ قیامت ہوتی
پہنچتا حسرتِ ہنگامہ فزا[1] سے پہلے
تابِ نظارہ ہو کیا ، غیر ہو جب آئینہ
کہ نظر خیرہ ہے یاں رخ کی صفا سے پہلے
اے قلق تیری طبیعت پہ تو ایماں آیا
صدقے ہو جاتے ہیں ہم صلِ علیٰ سے پہلے

۱- اصل متن (ص ۱۳۶) 'فزا' - مرتب

۱۶۵

در سے ترے گزر کر ، گزرے ہم اپنی جاں سے
کیا جانیے کدھر کو ، اب قصد ہو یہاں سے
کیا آپ کو علاقہ اس نالہ و فغاں سے
قصہ ہے اپنے دل سے ، جھگڑا ہے اپنی جاں سے
تڑپے گی تا قیامت ، اے برق تیری شامت
کیوں دل جلوں کی الجھی ، خاشاک آشیاں سے
اک شب کی شب کا رہنا ہے اس چمن کے اندر
گل چیں سے کیا عداوت ، کیا صلح باغباں سے
دل کی ہر ایک حسرت ، ہے لاکھ لاکھ ساماں
صد سال و نیم لحظہ ، کیا شکوہ آسماں سے
جو آہ دل سے اٹھی ، خوں ناب ہو کے اٹھی
صد ابر غرقِ آتش اک چشمِ خوں فشاں سے
تصویر اس کی کیوں کر کھچوائیں بہرِ تسکیں
شاید کچھ اور کھنچ جاے[1] ، کیا دور بدگماں سے
کیا تفرقہ پڑا ہے ، فرقت میں ہائے اس کی
کہتا ہوں جو زباں سے ، باہر ہے وہ بیاں سے
اٹھکھیلیاں تمھاری لائیں گی حشر آخر
عشاق بن کے فتنے ، اٹھنے لگے جہاں سے
کعبے میں جو ہیں بیٹھے ، وہ دیر کے ہیں مہماں
دل میں مکیں پھرے ہے آرائشِ مکاں سے

۱- اصل متن (ص ۱۴۷) میں ' جا ' - (مرتب)

مانندِ گردِ جستہ، بیٹھے ہیں پا شکستہ
منزل کے پاس ہیں ہم، پر دور کارواں سے
پھر پھر بہار آئی اور آشیاں کو توڑا
یاں بیٹھنے کی فرصت لائیں گے ہم کہاں سے
مِل بیٹھنا ہمارا مستوں میں زندگی ہے
کعبے میں جا مریں گے بچھڑے اگر مغاں سے
وہ شوخیوں میں اپنی گنتے نہیں کسی کو
کیوں کر نبھے گی آن کی میرے دلِ تپاں سے
اک وقت تھا قفس میں مرنے پہ مر رہے تھے
اب اُنس وہ کہاں ہے گل زار و بوستاں سے
فرہاد و قیس ٹھہرے مجنوں و کوہ کن یاں
کیا کیا لرز رہے ہیں ہم اپنے امتحاں سے
گر ریختے کو سنیے چل کر **قلق** سے سنیے
تیغِ کشیدہ ہے وہ نکلی ہے جو زباں سے

۱٦٦

جو دلبر کی محبت دل سے بدلے[۲]
تو لوں اُمیدِ لا حاصل سے بدلے
محالِ عقل کوئی شے نہیں ہے
جو آسانی مری مشکل سے بدلے

---

۲ - اصل متن (ص ۱۴۷) میں 'نکلے' ہے - اس غزل کا قافیہ دل، محفل وغیرہ اور 'سے بدلے' ردیف ہے؛ 'دل سے نکلے' صحیح نہیں بلکہ 'دل سے بدلے' درست ہے اور اس طرح یہ مطلع کا مصرع اول ہے - (مرتب)

جہاں ہے کور اور خورشید محجوب
کہاں تک شمع ہر محفل سے بدلے

تہی دستِ محبت تو بھی سمجھو
جو جم ساغر کو جامِ گل سے بدلے

ہر اک کو جان دینے کی خوشی ہو
اجل گر ناوکِ قاتل سے بدلے

اگر ہو چیں جبیں قاتل دمِ قتل
قیامت، قامتِ قاتل سے بدلے

ابھی ہم تو عدو سے بھی بدل لیں
جو غم کو غم سے دل کو دل سے بدلے

کھلے احوالِ دل جب ناصحوں پر
تہِ دریا اگر ساحل سے بدلے

شبستاں چھوڑ کر لیلیٰ ہو مجنوں
مری آغوش گر محمل سے بدلے

نہ جنبش اک قدم ہو آسماں سے
مری منزل اگر منزل سے بدلے

بتوں کا جلوہ کعبے میں دکھا دیں
ذرا تقویٰ دلِ مائل سے بدلے

قلق اس ظلم کا پھر کیا ٹھکانا
اگر مقتول لے قاتل سے بدلے

۱٦٧

سامانِ عیش و ناز ہے آزارِ جاں مجھے
لایا ہے تیرا شوق کہاں سے کہاں مجھے

دل میں ہے درد ، درد میں آرام کیا مجھے
کیا جانے کس ادا کے لیے دی ہے جاں مجھے

کیوں کر نہ جائے چھوڑ کے عمرِ رواں مجھے
دشوار جب کہ آپ ہو اپنا نشاں مجھے

چھپتے ہی تیرے ذوقِ نظر کا اٹھا حجاب
تڑپا رہی ہے میری نگاہِ تپاں مجھے

صرفہ نہ کچھ اسے نہ تجھے ظلم میں دریغ
اغیار کا نہ رنج دے ، اے آسماں مجھے

کیوں حرص دی کہ سارے عطا بخل ہو گئے
کچھ بھی نہیں دیا جو دیے دو جہاں مجھے

دشنام ہے گداختۂ لذتِ غضب
بہرِ فریب ذوق ہوا رنگِ پاں مجھے

دل تک وجودِ درد ہے اور درد تک دوا
سودا ہے سود بھی ہے سراپا زیاں مجھے

حاشا کہ بت پرست ہے خود صورت آفریں
آخر کو حسنِ ظن نے کیا بد گماں مجھے

کر فکرِ انتقام اب اے غیرتِ وفا
دلبر خود آئے یادِ دل آئے جہاں مجھے

شاہد تراش ہو گئی آخر نگاہِ شوق
ملتا ہے بے تلاش وہ اب ناگہاں مجھے

منہ دیکھتے ہیں دور سے ڈر ڈر کے مہر و کین
کیا فتنہ ہے نہاں کہ نہ ہوگا عیاں مجھے
لطف و غضب کے واسطے ہے مشورت ضرور
گر غیر ہے ندیم تو کر رازداں مجھے
گلشن میں کیوں نہ چشمکِ گل برق کار ہو
میں باغباں کو خار ہوں اور باغباں مجھے
یہ بھی نکالا جائے گا اس جرم پر ضرور
رکھتا ہے اب نظر میں ترا پاسباں مجھے
الفت کو آفریں کہ پشیماں کروں تجھے
کیوں ہو خدا نہ کردہ سرِ امتحاں مجھے
مہر و وفا و آرزو و شوق حیف حیف
پامال کر رہا ہے مرا کارواں مجھے
آخر معاشِ عشق کہاں تک وفا کرے
اک لمحے کا ہے عیش غمِ جاوداں مجھے
ہر شکل میں ہے جلوہ نما پیکرِ تلاش
تسکیں فزا ہے جنبشِ ریگِ رواں مجھے
ہے انبساطِ خلد سے بہتر فشارِ گور
آتی ہے یاد خواب گہ دل ستاں مجھے
ہے ہے کہ ہوگا داورِ محشر بھی غرقِ خواب
کہنی پڑے گی ساری تری داستاں مجھے
ایسا وہ منہ کو موڑ کے سب سے گیا **قلق**
میں آسماں کو دیکھتا ہوں آسماں مجھے

۱٦۸

کیوں سر بہ گریباں ستم آرا مرے آگے
تھا قول جو ناصح کا سو آیا مرے آگے
جب غیر ہو غمزے کا نشانا مرے آگے
ہو ذبح نہ کیوں میری تمنا مرے آگے
گر داغِ دلِ مردہ ہے مجنوں ترے نزدیک
تو خالِ رخِ سوگ ہے لیلٰی مرے آگے
ہاں پردہ نشینی کا مجھے دھیان ہے اس کی
پردہ ہے مرا شوقِ تماشا مرے آگے
کس طرح خیالاتِ محبت کو چھپاؤں
پھرتا ہے بت آئنہ سیما مرے آگے
آب آب ہو پی کر اسے جتنا کہ تنک ظرف
ہے غرقِ عرق اتنی ہی صہبا مرے آگے
اک سنگِ سیہ سو بھی وہ بوسیدہ و کہنہ
کعبے سے مقدس ہے کلیسا مرے آگے
سنتے ہیں کہ محشر میں نقاب اس کا اٹھے گا
ہوگا سحرِ حشر کا تڑکا مرے آگے
اس تشنہ لبی پر مری رحمت کو ہو کیا رحم
اور ہووے تو پھر خشک ہے دریا مرے آگے
واعظ مجھے رسوائیِ توبہ کی ضرورت
مصحف ہے بغل میں مری مینا مرے آگے
سر دے کے بھی ہرگز میں فدا ہو نہیں سکتا
یعنی کہ دمِ قتل تو آیا مرے آگے

آهستہ روِ کوچۂ جاناں ہوں میں ایسا
تھک جاتا ہے ہر بادیہ پیما مرے آگے

فریاد کی اپنی مجھے فریاد ہے کیا کیا
غیروں کا بڑا بول اور آیا مرے آگے

تھا ہوش دمِ جلوہ گری کس کو، پر اتنا
خورشید، لبِ بام گرا تھا مرے آگے

کیا داورِ محشر سے چکے دیکھیے چل کر
محشر میرے پیچھے ہے وہ فتنا مرے آگے

آنی ہے قیامت بھی پسِ مرگ، مقرر
سوتا ہے وہ فتنہ جو نہ اٹھا مرے آگے

وحشت سے مری پشتِ ازل روے ابد ہے
جو قافلہ پیچھے تھا وہ آیا مرے آگے

کوچے سے ترے بچ کے کوئی جائے کدھر کو
چل پھر کے وہی آتا ہے رستا مرے آگے

یوں حادثے لاکھوں ہی مرے سامنے آئے
تو ہی کبھی بے پردہ نہ آیا مرے آگے

شرمائے **قلق** کو کوئی کس طرح سے کہیے
کم بخت نے سر ہی نہ اٹھایا مرے آگے

۱٦۹

وہ بعدِ مرگ دے دشمن کو یہ توقیر مٹی کی
نوید، اے خاکساراں، کھل گئی تقدیر مٹی کی

یہ جوشِ گریہ ہم کو تہ پہ لے بیٹھے گا آخر کو
کہ موجِ سیل سے بچتی نہیں تعمیر مٹی کی

کدورت اُس کی اُلفت کی ، دلِ روشن میں یوں ظاہر
پسِ آئینہ ہے رکھی ہوئی تصویر مٹی کی

کوئی رکھا نہیں ذلت کا باقی مرتبہ اُس نے
بنانے سے غرض انساں کے تھی تشہیر مٹی کی

یہ کس کا خوں ہوا زیرِ زمیں گلشن کی آرائش
سرِ ہر فصل ہے قائم وہی تاثیر مٹی کی

غبارِ ناتواں گر پڑ[1] کے اُس کے در پہ جا پہنچا
الٰہی مجھ سے بہتر تھی مگر تقدیر مٹی کی

تغافل واں کھچا اتنا کہ بھولے خاکساروں کو
کدورت یاں بڑھی ایسی کہ سب تدبیر مٹی کی

اگر مقتول کا تیرے ، ذرا خوں جوش میں آئے
برنگِ خون رنگت ہو ہزاروں تیر مٹی کی

کہاں بسمل تمنائے نمک میں ہم ہوئے آ کر
کہ قدرِ کیمیا ہے اے دلِ دلگیر مٹی کی

رہے گر خاکساری میں بھی ، حرصِ دو جہاں باقی
تو اے ناقدر داں خاصیت اکسیر ، مٹی کی

کہیں شیشہ، کہیں ساغر، کہیں ساقی ، کہیں ہم ہیں
بجھا کر شمع ، ساری بزم اے گل گیر مٹی کی

کیا پامال مرقد کو اُڑائی خاکِ آسودہ
قلق سے بیر تھا تم کو تو کیا تقصیر مٹی کی

---

۱ ۔ اصل متن (ص ۱۵۱) میں 'پڑ کر' ہے ۔ (مرتب)

۱۷۰

بندِ نقاب اُس کا ہر دم کھلا رہا ہے
پر عقل پہ ہماری پردہ پڑا رہا ہے

رازِ نہفتہ اپنا اب کیا چھپا رہا ہے
سرمایہ سارا دل کا دامن پہ آ رہا ہے

ان بے نیازیوں پر دامن کشی یہ کب تک
دل بھی ہمارا مدت بے مدعا رہا ہے

ہے مشتِ خاک اپنی رنجش دل و جگر کی
کچھ یہ جلا رہا ہے کچھ وہ بہا رہا ہے

اتنی بڑھی کدورت ، تنگ آ گئی خرابی
کیا کیا غبار اپنا خارِ صبا رہا ہے

کیا آرزو نکالیں جی سے نہیں نکلتے
باقی سوا تمہارے اب دل میں کیا رہا ہے

گر دام سے چھٹے تو آئے قفس کے اندر
کیا آب و دانہ ہم سے گردش میں آ رہا ہے

وہ پنجۂ نگاریں یاد آ گیا ہے جس رات
ماہِ منیر دزدِ رنگِ حنا رہا ہے

الزام ڈھونڈھتے ہیں دامن کشی کو واں وہ
اور یاں دراز شب بھر دستِ دعا رہا ہے

تیزابِ آبلہ نے دریا بہائے کیا کیا
خاروں کی بر زباں کچھ یہ ماجرا رہا ہے

شوقِ گریزپا نے کیا کیا نہ رہزنی کی
واپس ہمیشہ ہم سے شورِ درا رہا ہے

بیٹھوں تو داغ منزل اٹھوں تو درد رہبر
سر پر اٹھانے والا اک آبلہ رہا ہے

فرصت نہیں دمادم مےنوشیوں سے اس کو
اے ابر تو بھی شاید واں پر گھرا رہا ہے

خود کو کبھی نہ دیکھا آئینے ہی کو دیکھا
ہم سے تو کیا کہ خود سے نا آشنا رہا ہے

ہے سرنگوں جو اتنا اب تک سپہرِ بے مہر
کیا جانیے کہ کس کا پاسِ حیا رہا ہے

جی کی کہانیاں کچھ جی میں ہی ہو رہی ہیں
دل میں مرے مقرر کوئی تو آ رہا ہے

۹ کیوں کر نہ ابر روئے بجلی نہ کیسے تڑپے
کوئی کہیں بھی باقی خونیں لوا رہا ہے

فکرِ کشود جب کی شرمندگی اٹھائی
عقدہ ہمارے دل کا بندِ قبا رہا ہے

پھرتے ہیں ہم نوا سب جنگل میں بھٹکے بھٹکے
صیاد کے سوا اب گلشن میں کیا رہا ہے

وہ دل کہ تھا ہمیشہ تاراج گاہِ ترکاں
جس پر بھی بے ابا دل ہی میں آ رہا ہے

یہ ناتواں ہوئے ہیں ہے ضعف عینِ جاں اب
پر رنگِ چہرہ ہم کو کوسوں اڑا رہا ہے

کیا کیا نہیں ہوا ہے وحشت کا اپنی چارہ
صحرا ہر ایک جانب زنجیرِ پا رہا ہے

فرقت کی شب کو ظالم کیا کم سمجھ رکھا ہے
اے دل جو حسرتیں تو اتنی بڑھا رہا ہے

۱۷۰

بندِ نقاب اُس کا ہر دم کھلا رہا ہے
پر عقل پہ ہماری پردہ پڑا رہا ہے
راز نہفتہ اپنا اب کیا چھپا رہا ہے
سرمایہ سارا دل کا دامن پہ آ رہا ہے
ان بے نیازیوں پر دامن کشی یہ کب تک
دل بھی ہمارا مدت بے مدعا رہا ہے
ہے مشتِ خاک اپنی رنجش دل و جگر کی
کچھ یہ جلا رہا ہے کچھ وہ بہا رہا ہے
اتنی بڑھی کدورت ، تنگ آ گئی خرابی
کیا کیا غبار اپنا خارِ صبا رہا ہے
کیا آرزو نکالیں جی سے نہیں نکلتے
باقی سوا تمہارے اب دل میں کیا رہا ہے
گر دام سے چھٹے تو آئے قفس کے اندر
کیا آب و دانہ ہم سے گردش میں آ رہا ہے
وہ پنجۂ نگاریں یاد آ گیا ہے جس رات
ماہِ منیر دزدِ رنگِ حنا رہا ہے
الزام ڈھونڈھتے ہیں دامن کشی کو واں وہ
اور یاں دراز شب بھر دستِ دعا رہا ہے
تیزابِ آبلہ نے دریا بہائے کیا کیا
خاروں کی بر زباں کچھ یہ ماجرا رہا ہے
شوقِ گریزپا نے کیا کیا نہ رہزنی کی
واپس ہمیشہ ہم سے شورِ درا رہا ہے

بیٹھوں تو داغ منزل اٹھوں تو درد رہبر
سر پر اٹھانے والا اک آبلہ رہا ہے

فرصت نہیں دمادم مے نوشیوں سے اس کو
اے ابر تو بھی شاید واں پر گھرا رہا ہے

خود کو کبھی نہ دیکھا آئینے ہی کو دیکھا
ہم سے تو کیا کہ خود سے نا آشنا رہا ہے

ہے سرنگوں جو اتنا اب تک سپہر بے مہر
کیا جانیے کہ کس کا پاسِ حیا رہا ہے

جی کی کہانیاں کچھ جی میں ہی ہو رہی ہیں
دل میں مرے مقرر کوئی تو آ رہا ہے

۹ کیوں کر نہ ابر روئے بجلی نہ کیسے تڑپے
کوئی کہیں بھی باقی خونیں لوا رہا ہے

فکرِ کشود جب کی شرمندگی اٹھائی
عقدہ ہمارے دل کا بندِ قبا رہا ہے

پھرتے ہیں ہم نوا سب جنگل میں بھٹکے بھٹکے
صیاد کے سوا اب گلشن میں کیا رہا ہے

وہ دل کہ تھا ہمیشہ تاراج گاہِ ترکاں
جس پر بھی بے ابا دل ہی میں آ رہا ہے

یہ ناتواں ہوئے ہیں ہے ضعف عینِ جاں اب
پر رنگِ چہرہ ہم کو کوسوں اڑا رہا ہے

کیا کیا نہیں ہوا ہے وحشت کا اپنی چارہ
صحرا ہر ایک جانب زنجیرِ پا رہا ہے

فرقت کی شب کو ظالم کیا کم سمجھ رکھا ہے
اے دل جو حسرتیں تو اتنی بڑھا رہا ہے

دلبر نے اس کو حاشا ایسا نہیں ستایا
ہم کو دلِ جفا جو جیسا ستا رہا ہے
جب سے سنا کہ پردہ ہے جلوہ گاہ تیری
دم تیرے عاشقوں کا آنکھوں میں آ رہا ہے
اللہ رے جوشِ اشک و بے تابیِ جدائی
بجلی سی کوندتی ہے بادل سا چھا رہا ہے
کہتے ہیں اس **قلق** کو ہے اب شریفِ مکہ
مے خانے کے جو در پر مدت پڑا رہا ہے

۱۷۱

مٹ مٹ کے خاک طالبِ دیدار ہو گئے
گردِ شعاعِ روزنِ دیوار ہو گئے
پروانے شمع رو کے خریدار ہو دئیے
ہم جل کے داغِ گرمیِ بازار ہو گئے
بے نور خط کے آتے ہی رخسار ہو گئے
آتش کے ٹکڑے رزقِ خس و خار ہو گئے
کس کس کو دوں جواب کہ کیوں مر رہا ہوں میں
ہے ہے فرشتے قبر کے غم خوار ہو گئے
مجبور بے وفا تمہیں سنتے ہیں کیا کریں
سب اختیارِ غیر سے ناچار ہو گئے
پامال کا خیال حنا بند ہے وہاں
اس گل کی ہم نگاہ میں کیا خار ہو گئے
اے ماہ رو کہیں نہیں جاتا ہے تو مگر
نقشِ قدم کواکبِ سیار ہو گئے

وہ بے وفا نہیں ہیں کہ ہے غیر تک گواہ
کیوں اُن کو جاں کہا تھا جو بیزار ہو گئے
مرنے سے اپنے خوش ہے نہ جینے سے اپنے شاد
دل دے کے ہم تو سخت گنہگار ہو گئے
ساقی نے کس ادا سے بھرا جامِ مدعی
پیمانہ ہائے دوستی سرشار ہو گئے
سر پھوڑنے کو خاک اُٹھائیں وہ ضعف سے
جو سنگ سارِ سایۂ دیوار ہو گئے
مرتے نہیں ہیں قتل سے بے جان آپ کے
کھا کھا کے زخم اور بھی جاں دار ہو گئے
کیا پائے بوس شکلِ زلیخا تھے خواب میں
کیوں سوتے سوتے چونک کے بیدار ہو گئے
ساقی تری نگہ میں ہے مرد آزما شراب
آخر کو مست جتنے تھے ہشیار ہو گئے
رہتا ہے ایک شکل میں کوئی بھی اے **قلق**
وہ بھی مجھی سے عاقبتِ کار ہو گئے

۱۷۲

غضب تھی آنکھ لگنی اک نظر کی
کہ جس نے نیند کھوئی عمر بھر کی
نہ پوچھو سجدۂ وحشت اثر کی
عدو تک کی گلی پامالِ سر کی
اُٹھا کر لاش لائے نامہ بر کی
ہوئی تسکین جانِ پُر خطر کی

غضب تھا خندۂ چاکِ کفن بھی
کہ قاتل نے بہت نیچی نظر کی

دمِ آخر اثر نے آس توڑی
کہ اس نے آہ مجھ کو دیکھ کر کی

گلی سے اس کی تو نے اے قیامت
ہماری گور تک کیوں کر گذر کی

مرے کیا خاک کوئی یاں کہ اغیار
لیے جاتے ہیں مٹی تیرے در کی

بغل میں اس کی دشمن ہے مقرر
نہیں چلون میں گنجائش نظر کی

نہیں دل ہے کہ مرے دل رُبا پر
نہیں سر ہے کہ خو ہو دردِ سر کی

اسی نے آپ کو حیرت سے دیکھا
کہ جس نے حال پر میرے نظر کی

محبت میں کہاں شرکت گوارا
اٹھائے نالہ کیوں تہمت اثر کی

سبھی پر کھل گئی بے دست و پائی
کہ سر سے راہ تیری ہم نے سر کی

قیامت لائے گی آخر کسی دن
خموشوں پر یہ تہمت شور و شر کی

غبار آخر کو چھایا دل پر اس کے
اڑائی خاک اتنی در بہ در کی

کفن کو پھاڑ کر دامن پکڑنا
ادا ادنیٰ ہے شوقِ پردہ در کی

تمھارا امتحاں کس نے کیا تھا
جفا ناحق وفا سے بیش تر کی

نہیں دل سا کوئی ھنگامہ پرور
لگائی واں ادھر کی یاں ادھر کی

ضعیفوں کی اگر اٹھے بھی فریاد
تو تاب اور کہاں بارِ اثر کی

فلک تھم تھم گیا پھر پھر شبِ ھجر
صدا رک رک گئی مرغِ سحر کی

ملیں گے تجھ سے ھے ھے صلح فرما
صفائی ھے ، صفائی بھی اگر کی

حکایت کیا ھے جاں سے بے وفا کی
شکایت کیا ھے دل سے بے خبر کی

ھمیں تو لطف ھی نے اس کے مارا
جفا اوروں پہ ھم سے بیش تر کی

کلیجہ چھانتا ھے اے قلق تو
کہ ھیں آھیں بری آٹھوں پہر کی

۱۷۳

سدا الفت میں مر مر کر بسر کی
کہ تھی کوشش ھمیں تم سے حذر کی

خرابی نے مری تعمیر پھر[1] کی
اٹھائی سیل نے دیوار گھر کی

۱- ’ پھر ‘ میں ’اقواء‘ پایا جاتا ھے (حرف روی کے ماقبل

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

کہاں اب آرزو میں عرضِ مطلب
نہیں امید کو وحشت خطر کی

ستم گر شامِ وعدہ تو تو بھولا
رقیبوں نے مرے در پر سحر کی

نہیں اب آئنے کو دیکھتے تم
نظر تم نے مری جانب مگر کی

ہمیشہ دامِ تازہ ہے نشیمن
کہوں کیا کیا سلوکِ بال و پر کی

اُڑیں کس کس طرف کو دل کے ٹکڑے
کہاں ڈالی نظر تم نے کدھر کی

عداوت کا گماں کب تک نہ ہوگا
ہوئی ہے غیر صورت چارہ‌گر کی

ستم تو دیکھ لطف آمیز اُس کے
کہ قسمیں غیر سے ہیں میرے سر کی

غبارِ صبح دھو ڈالے گی بے شک
شبِ فرقت میں سیل اس چشمِ تر کی

قلق ہنس کر رلاتا ہے وہ مجھ کو
جفا ہے ہر ادا میں فتنہ‌گر کی

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)

کی حرکت کا مختلف ہونا عیوب قافیہ میں داخل ہے اور اسے اقواء کہتے ہیں ۔ 'گھر' اور 'پھر' میں اختلاف حرکت ہے ۔ بحرالفصاحت ص ۳۲۸ ملاحظہ ہو ۔ (مرتب)

۱۷۴

کیا کہیں تجھ سے ہم وفا کیا ہے
سوچ کچھ دل میں پوچھتا کیا ہے

دل ہے یہ یا کہ آبلہ ، کیا ہے
کیوں ہے اتنا بھرا ہوا ، کیا ہے

کیسے کیسے جواں کیے برباد
عشق کیا شے ہے ، یہ بلا کیا ہے

دل کو دینا تھا دے دیا ظالم
اور ہم نے ترا لیا کیا ہے

گر رقابت تمھیں نہیں مجھ سے
پھر یہ آئینہ دیکھنا کیا ہے

پہلے رکھ لے تو اپنے دل پر ہاتھ
پھر مرے خط کو پڑھ ، لکھا کیا ہے

اب وہ آنکھیں نہیں ہیں پہلی سی
سچ کہو تم کو ہو گیا کیا ہے

شوقِ عاشق کشی[1] بھلا ہی سہی
رحم کرنا بھی پر برا کیا ہے

کیا کہیں ہم برا کہ خو ہی نہیں
پر کہو تم ہی یہ جفا کیا ہے

جب کہ گردن پہ خون رہا اُس کی
نام مت لو کہ خوں بہا کیا ہے

۱۔ اصل متن (ص ۱۵۷) میں 'کسی' غلط ہے ؛ 'کشی'
تصحیح قیاسی ہے ۔ (مرتب)

میری اور آرزو کو تو پوچھے
سوچتا ہوں کہ مدّعا کیا ہے

جانے کیا کیا ہوا ہے رزقِ خاک
گل و لالہ کو دیکھتا کیا ہے

دل عجب چیز ہے تو[۲] تم سے عزیز
رہنے بھی دو معاملا کیا ہے

آگے آگے ہیں پارہ ہائے جیب
مجھ کو درکار رہنما کیا ہے

کم نگاہی بھی شرطِ حسن ہے ، پر
دیکھ تو ، ہم میں اب رہا کیا ہے

قتل ہوتے رہے ہیں ہم سے پوچھ
لے کے شمشیر سوچتا کیا ہے

پی گئی خون زمیں ہزاروں کی
مفت پھر شوخیِ حنا کیا ہے

دونوں عالم کو کیوں کیا پامال
نقشِ پا پر یہ نقشِ پا کیا ہے

اے قلق کیوں قلندری چھوڑی
یہ عبا کیا ہے یہ قبا کیا ہے

۲- مفہوم واضح نہیں - (مرتب)

۱۷۵

جس جگہ لے کے چشمِ تر بیٹھے
اٹھتے ہی اٹھتے گھر کے گھر بیٹھے

کس کو پامال آج کر بیٹھے
ہو جو تھامے ہوئے جگر بیٹھے

دیکھیے کیا بنے گی اب جاں پر
دل کے دینے میں جی تو کر بیٹھے

کچھ تماشا ہے کھیل ہے کیا ہے
اک زمانے کو قتل کر بیٹھے

امن اور تیرے عہد میں ظالم
کس طرح خاکِ رہگزر بیٹھے

بچتے بچتے ہر اک سے اتنے ہٹے
دین و دنیا سے اب گزر بیٹھے

نہ کھنچی منتِ مسیحائی
ہم تو مرنے سے پہلے مر بیٹھے

دل کے ہر جزو میں جدائی ہے
درد اٹھے ، آبلہ اگر بیٹھے

چاہِ یوسف ہوئی وفائے غیر
تم بھی اپنے کیے کو بھر بیٹھے

چارہ گر مجھ سے سب کو نفرت ہے
کس طرح رگ میں نیشتر بیٹھے

میری باتیں جو یاد آتی ہیں
کیسے ہنستے ہیں نوحہ گر بیٹھے

بدگمانی کے ساتھ ساتھ پھرے
کتو بہ کتو آئے در بہ در بیٹھے
اور بھی اب مزاجِ دل بگڑا
وہ جو پہلو میں آن کر بیٹھے
اس نے دیکھا ہے بھول کر اور ہم
کرتے ہیں خود ہی کو نظر بیٹھے
اے **قلق** یار چل دیے سارے
رہ گئے ہم ہی بے خبر بیٹھے

۱۷۶

نہ[1] ہو آرزو کچھ یہی آرزو ہے
فقط میں ہی میں ہوں تو پھر تو ہی تو ہے
نہ یہ ہے نہ وہ ہے نہ میں ہوں نہ تو ہے
ہزاروں تصور اور اک آرزو ہے
نہ امید جھوٹی نہ کچھ یاس سچی
نہیں جو کہیں بھی وہی چار سو ہے
کسے ڈھونڈھتے ہیں یہی ڈھونڈھتے ہیں
یہی جستجو ہے اگر جستجو ہے
جگائے گا کس طرح شورِ قیامت
خموشی سے ناچار ہر گفتگو ہے
خودی بھی ہماری خدائی سہی[2]
وہی ہم نشیں ہے وہی دو بدو ہے

---

۱ - اس غزل کا مقطع کلیات مطبوعہ میں نہیں ہے (مرتب)
۲ - 'عروض' محذوف باقی ارکان سالم ہیں - (مرتب)

مگر دشنہ تھا سایۂ زلفِ ساقی
کہ جو زخم ہے ساغرِ مشک بو ہے

۱۷۷

رازِ دل دوست کو سنا بیٹھے
مفت میں مدّعی بنا بیٹھے

انجمن ہے تری طلسمِ رشک
آشنا ہیں جدا جدا بیٹھے

کثرتِ سجدہ سے پشیماں ہیں
کہ ترا نقشِ پا مٹا بیٹھے

کل جو تاج و حشم کو چھوڑ اٹھے
آج وہ تیرے در پہ آ بیٹھے

کی ہے آخر کو ناشتا[1] شکنی
داغ پر داغ ہم تو کھا بیٹھے

طرزِ ساقی سے دیر کے سب لوگ
کر رہے ہیں خدا خدا بیٹھے

---

۱ - 'ناشتا' کے معنی فرہنگ عمید (ص ۱۱۶۹) اور شمس اللغات (جلد دوم ص ۲۸۴) میں یہ لکھے ہیں کہ وہ شخص جس نے صبح سے کچھ نہ کھایا ہو ؛ لیکن اردو میں یہ معنی مستعمل نہیں ۔ عزیز لکھنوی لکھتے ہیں :

ناشتا : وہ کھانا جو صبح کو تھوڑا سا کھایا جاتا ہے ۔ صبح کا کھانا جو سہارے کے واسطے کھا لیتے ہیں ۔ (عزیزاللغات مؤلفہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی ، ص ۶۹۰)

شاخِ گل کی نزاکتوں سے ڈرے
بار تھے مشتِ پر اڑا بیٹھے

شکوہ عاشق کشی کا فرض نہ تھا
یاد یہ کیا انھیں دلا بیٹھے

دردِ سر تھی دعا محبت میں
ہاتھ ہم جان سے اٹھا بیٹھے

اے قیامت تو اٹھ کے پوچھ مزاج
ہیں وہ کچھ آپ ہی خفا بیٹھے

روئے اتنے کہ خوں ہوئی امید
خود جہاز اپنا ہم بہا بیٹھے

بے تکلف مقامِ الفت ہے
داغ اٹھے کہ آبلا بیٹھے

آسماں ڈھے پڑا اٹھے فتنے
جس جگہ لے کے مدّعا بیٹھے

رسمِ تعظیمِ عشق تو دیکھو
درد اٹھا کہ جی مرا بیٹھے

اے قلق تم سا بد دماغ ہے کون
چرخ کی ضد پہ گھر لٹا بیٹھے

۱۷۸

زندگی مرگ کی مہلت ہی سہی
بہر واماندہ اقامت ہی سہی

دوستی وجہِ عداوت ہی سہی
دشمنی بہرِ رفاقت ہی سہی

طول دیتے ہو عداوت کو کیوں
مختصر قصۂ الفت ہی سہی
رکھ کسی وضع سے احسان کی خو
مجھ کو آزار سے راحت ہی سہی
آپ کا بھی نہیں چھٹتا دامن
میرے در پے مری شامت ہی سہی
عاقبت حشر کو آنا اک دن
روٹھ جانا تری عادت ہی سہی
کچھ بھی اے بخت میسر ہے تجھے
یا تجسس سے فراغت ہی سہی
کوچۂ غیر میں چل کر رہیے
گر نہیں عیش تو حسرت ہی سہی
یہی تقریبِ ستم ہو اے کاش
ہر طرح غیر سے نفرت ہی سہی
اب تو اٹھ آئے لحد سے بے تاب
نہ سہی چال، قیامت ہی سہی
یادگاری کی[1] کوئی بات تو ہو
موت اپنی تری رخصت ہی سہی
عدل و انصافِ قیامت معلوم
آہ و فریاد کی فرصت ہی سہی

۱۔ 'یادگاری' اصل متن (ص ۱۶۰) میں بے معنی ہے، اس لیے 'یادگاری کی' تصحیح قیاسی ہے۔ (مرتب)

اے **قلق** شکرِ ستم بے جا کیوں
آہ[1] و فریاد کی فرصت ہی سہی

۱۷۹

گریے میں نورِ نظر روز بہا کرتا ہے
شوقِ نظارہ یہ آنکھوں کی جلا کرتا ہے

سخت حیران ہو تشویشِ ستم میں ہے ہے
جو وفا کرتا ہے وہ تم پہ جفا کرتا ہے

گھر میں دشمن کے چھپا ہے کہ نہ دیکھے کوئی منہ
کتنا بدنام ہے اور کتنی حیا کرتا ہے

جیب کیا چاک ہے سر ٹکڑے ہے کیوں یہ عاجز
جان کو حضرتِ ناصح کی دعا کرتا ہے

قافلہ بیٹھتا ہے جب ترے درماندوں کا
اک قیامت کا سا ھنگامہ اٹھا کرتا ہے

ھائے وہ وقت کہ جب غیر سے ھنستا ہے وہ
ھائے وہ لمحہ کہ جب قتل مرا کرتا ہے

کیا عنایت ہے کہ ھم سے ہی خفا رہتا ہے
کیا محبت ہے کہ ھم پر ہی جفا کرتا ہے

الفتِ غیر سہی پوچھتے ھیں پر مجھ سے
چین سے بھی کوئی بے تاب رہا کرتا ہے

---

۱ - مقطع سے پہلے شعر کا بھی مصرع ثانی یہی مصرع ہے ؛ مقطع میں مصرع ثانی بے معنی ہے - معلوم ھوتا ہے کہ کاتب کے سہو سے دوبارہ مصرع لکھ دیا گیا ہے - (مرتب)

آج ہی حشر نہیں تازہ کہ اٹھے گا سحر
روز وہ بزم میں اعدا کی رہا کرتا ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر بس نہ بناؤ باتیں
چاکِ دل ایسے ہی بخیے سے سلا کرتا ہے
اللہ اللہ ادائے بتِ ایماں دشمن
دل میں تاثیر مرے خوفِ خدا کرتا ہے
نہ ترے دام کا دشمن نہ تمنائے بہار
مجھ کو صیاد تو کاہے کو رِہا کرتا ہے
کس لیے تو نے کمر قتلِ **قلق** پر باندھی
دیکھ تو آپ کو اور اس کو یہ کیا کرتا ہے

۱۸۰

جاں لب پہ یہ کب تک نہ ادھر ہے نہ اُدھر ہے
ہے ہے شبِ ہجراں میں بھی اُمیدِ سحر ہے
دل کو مرے برباد کیا ایک نظر میں
کس طرح سے باور ہو کہ اغیار کے گھر ہے
وہ پردہ‌نشیں اور ہمیں ناموس سے پرہیز
کچھ پاسِ محبت نہ ادھر ہے نہ اُدھر ہے
بت خانے کی الفت ہے نہ کعبے کی محبت
جویائیِ نیرنگ ہے جب تک کہ نظر ہے
یہ بے خبری اور مری فریاد سے اب تک
یہ بے اثری طالعِ خفتہ کا اثر ہے
ہو زندگیِ خضر مری موت پہ قرباں
معلوم گر اتنا ہو کہ معدوم کمر ہے

دعویٰ نہیں کچھ تجھ سے اگر داد ملے تو
فریاد کا خون داورِ محشر ہی کے سر ہے

کوثر جسے کہتے ہیں جو لذت ہے کچھ اس میں
افشردۂ آلودگیِ دامنِ تر ہے

اک بوسے کے دینے پہ یہ برپا ہے قیامت
دل دے کے نہیں دھیان یہ اپنا ہی جگر ہے

ہر سایۂ دیوار سے گرتا ہے نمایاں
ویران جو نہ ہووے گا وہ یاں کون سا گھر ہے

کس طرح نہ ہم حشر میں مر مر کے جییں گے
وہ بھی تو اسی شوخ کی ٹھوکر کا اثر ہے

مانا کہ **قلق** ہوش ٹھکانے نہیں لیکن
اس بے خبری کی تری ہم کو بھی خبر ہے

۱۸۱

جدھر کو وہ ستم آرا لگام لیتا ہے
سپہر دوڑ کے فتراک تھام لیتا ہے

جو کوئی حشر خرام اس کا نام لیتا ہے
تو حشر ہول سے دل اپنا تھام لیتا ہے

چمن چمن میں نہ کیوں کر پھروں بھٹکتا میں
کہ آسماں عوضِ قید دام لیتا ہے

خدا کو بھی نہیں الزامِ خلق سے چارہ
جو کوئی مرتا ہے اس کا ہی نام لیتا ہے

فلک کو عشوہ ترا سخت تنگ رکھتا ہے
کفارۂ ستمِ ناتمام لیتا ہے

یہ سیرِ زیست ہے سن کر مرارتِ[1] سکرات
مزے شکر کے ترا تلخ کام لیتا ہے
زباں نہ منہ میں ہو ، وہ جب پیام سنتا ہے
نہ سر ہو دوش پہ ، وہ جب سلام لیتا ہے
عدو جب آتے ہوئے تجھ کو روک دیتا ہے
خدا ہی جانے مجھے کون تھام لیتا ہے
یہ دل بھی وہ ہے کہ لاتا ہے دل ربا کو لگا
یہ شیشہ وہ ہے کہ پتھر سے کام لیتا ہے
لحاظِ رند کو واعظ تو میکدے میں دیکھ
خصوص جب کفِ ساقی سے جام لیتا ہے
تو اعتمادِ تو بازارِ میکدہ کا دیکھ
کہ جم بھی تاجِ شہی رکھ کے جام لیتا ہے
چراغِ پا ہی[2] ہمیشہ ہلال رہتا ہے
سمندِ چرخ جو ناخن[3] مدام لیتا ہے
حریفِ عیش و حریصِ نشاط کون نہیں
کہ وصلِ بت کا خدا انتقام لیتا ہے
جبیں میں اس کی نہیں سر فرو حیا و شرم
نیاز ناز سے جھک جھک سلام لیتا ہے

۱- مرارت : ع (بہ فتح میم و را) تلخی - (فرہنگ عمید ص ۱۰۷۱)

۲- چراغ پا ہونا یا رہنا : ناراض ہونا خفا ہونا - (مرتب)

۳- ناخن لینا : ناخن تراشنا - ناخن کاٹنا - گھوڑے کا چلتے میں ٹھوکر لینا - گھوڑے کا لڑکھڑانا - (عزیزاللغات ص ٦٨٩) -

نہ کیسے جوش میں صہبا ہو شیشے سے باھر
کہ غیر ھاتھ سے ساقی کے جام لیتا ھے

نہ کیوں کہ پھوٹتے ھی سر کے بہتی جوے شیر
کہ عشق کرتے ھی ناکام ، کام لیتا ھے

قلق تو مجھ سے تنک مائگیِ چرخ نہ پوچھ
ھزار زخمِ جگر دل سے وام[1] لیتا ھے

۱۸۲

دوستی اُس کی دشمنی ھی سہی
دوست تو ھو وہ مدعی ھی سہی

مستی و بحثِ عذرِ کفارہ
توبہ سے توبہ ھم نے کی ھی سہی

ھے اگر کچھ وفا تو کیا کہنے
کچھ نہیں ھے تو دل لگی ھی سہی

جی ھے یہ ، بن لگے نہیں رھتا
کچھ تو ھو شغل عاشقی ھی سہی

محتسب ختم کیجیے حجت
پی ھے تو خیر ھم نے پی ھی سہی

حیف ، خمیاز ھائے حسرت و شوق
زندگانی کشاکشی ھی سہی

۱- وام : قرض ، دین ، فام و افام و اوام ھم گفتہ شدہ (فرھنگ عمید ص ۱۲۲۱) -

جان دے کر لیا ہے نامِ وفا
موت بھی ہم نے مول لی ہی سہی

ملتے ہیں مدعی سے ملنے دو
کہ مری ناخوشی، خوشی ہی سہی

بوسہ دینے کی چیز ہے آخر
نہ سہی ہر گھڑی، کبھی ہی سہی

قتل ہوتے ہیں قتل ہوتے ہیں
عہدِ دل دورِ نادری ہی سہی

اے **قلق** ناصحوں سے کیا تکرار
مان اک بات، مان لی ہی سہی

۱۸۳

دوری میں کیوں کہ ہو نہ تمنا حضور کی
منزل کو میری قرب سے نسبت ہے دور کی

فرقت نے اس کی، وصل کی تشویش دور کی
تسکیں نہیں ہے یوں بھی دلِ ناصبور کی

موسیٰ کے سر پہ پاؤں ہے اہلِ نگاہ کا
اس کی گلی میں خاک اڑی کوہِ طور کی

کہتا ہے انجمن کو تری خلد مدّعی
اس بوالہوس کے دل میں تمنا ہے حور کی

واعظ نے میکدے کو جو دیکھا تو جل گیا
پھیلا گیا چراند شرابِ طہور کی

موسیٰ کو کیوں نہ موجِ تجلی دھکیل دے
جلوے سے اس کے گل ہوئی مشعل شعور کی

اربابِ وقت جانتے ہیں ، روزگار نے
کی سہو سے وفا تو تلافی ضرور کی

رسوائیوں کا حوصلہ گھٹ گھٹ کے بڑھ گیا
ساماں ہے خامشی مری شورِ نشور کی

میل آسماں کا سوے زمیں ، بے سبب نہیں
زیرِ قدم جگہ ہے سرِ پر غرور کی

اس سے نہ ملیے جس سے ملے دل تمام عمر
سوجھی ہمیں بھی ہجر میں آخر کو دور کی

پامال کر رہا ہے سیہ روزیوں کا جوش
مٹی خراب ہے مرے کلبے[1] میں نور کی

کیا ایک قربِ غیر کا صدمہ ، نہ پوچھیے
ہیں دل کے آس پاس بلا دور دور کی

مضموں مرے اڑائے قلق سب نے اس قدر
سنتا ہوں میں ترانہ زبانی طیور کی

۱۸۴

چشم کو دل سے چار ہونے دے
نیم کش تیر پار ہونے دے

آئنے میں کہاں ہے اتنی تاب
کہ تجھے شرمسار ہونے دے

۱- کلبہ : (بہ ضم کاف و فتح با) دکان ـ خانۂ کوچک ، خانۂ روستائی ـ (فرہنگ عمیہ ص ۹۵۰) (مرتب)

اک ذرا میری آرزو ، اے چرخ
صرفِ اندازِ یار ہونے دے
اتنا بھی رشک پر نہیں قابو
کہ اُسے راز دار ہونے دے
انتقام اُس سے آسماں کیوں لے
کیوں مجھے سوگوار ہونے دے
اے فلک! اُس کو دل میں رہنے دے
آفتِ روز گار ہونے دے
غش کو آنے دے اے تلاش ذرا
طاقتِ انتظار ہونے دے
دمِ آخر تو پردہ رخ سے اُٹھا
حالِ دل آشکار ہونے دے
اتنی رنجِ خزاں سے کب مہلت
کہ رجوعِ بہار ہونے دے
غیرتِ بے کسی سے یہ کب ہو
غیر کو غم گسار ہونے دے
کیوں **قلق** سے معارضہ تجھ کو
خوار ہونے دے ، خوار ہونے دے

۱۸۵

لبِ جاں بخش و جاں گزا ہے ہے
گرگ و یوسف اور ایک جا ہے ہے
سرخیِ رنگِ پاں میں پنہاں ہے
قتلِ عیسیٰ کا خوں بہا ہے ہے

برگ گل کو کیا ہے خوں در خوں
نازکی سخت آزما ہے ہے

جاں فزائی و جاں ستانی حیف
زیست سے مرگ مدعا ہے ہے

خندۂ لب ہے موجِ بادِ تیغ
نیم جنبش ہے نیمچا ہے ہے

پشتِ لب ہے نسب مسیحا کا
پردۂ مریمی اٹھا ہے ہے

ہے شہادت کا خضر کی ساماں
سرخ آبِ بقا ہوا ہے ہے

خوں کا دریا بہائے گا آخر
حسرتِ لب کا ماجرا ہے ہے

لب گل گوں پہ جان دے بیٹھے
خون بہا کا بھی خوں بہا ہے ہے

مدّ شنجرف ہے غلط تشبیہ
خونِ بوسہ ہے بر قفا ہے ہے

لب پہ صدیق کی یہ مدح درست
ہے قلق کی مگر قضا ہے ہے

مثلث

دل ٹھہرنے پہ ٹھہرے ، نہ چلنے کو جی چلے
لائی حیات ، آئے ، قضا لے ، چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ہے **قلق** پہ صدمہ سخت ، کیا جیے گا بے چارہ
در فراق او مہری فرض کن کہ شب ہارا
می تواں بروز آورد ، روز را کسی چہ کند

حصهٔ رباعیات

رباعیات

ردیف الف

۱

بندہ پرور تو خود قدیمی ہے خدا
اور لطف سے دشمن لئیمی ہے خدا
پر کافر ذات ہے زمانہ سارا
امید رحیمی و کریمی ہے خدا

۲

یہ وہم دوئی دل سے جدا کرنا تھا
اس قطرے کو دریا میں فنا کرنا تھا
اللہ رے رقابت کہ رقابت سب سے
اے جوش خودی، خوفِ خدا کرنا تھا

۳

وہ وقت شباب ، وہ زمانہ نہ رہا
وہ نشۂ مستی ، وہ ترانہ نہ رہا
آتا ہے کہانی کا مزہ باتوں میں
اب اپنے سوا کوئی فسانہ نہ رہا

۴

عمداً مجھے ناراض رضا نے چاہا
ہر قضیے کو برعکس قضا نے چاہا
اس بت کے سبب سب ہی کو ضد ہے مجھ سے
جو میں نے نہ چاہا وہ خدا نے چاہا

۵

ہر چاکِ دل ارمان زدہ سینے کا رہا
ہر داغِ جگر تشنہ دفینے کا رہا
کیا زندگی گزری ہے کہ ما شاء اللہ
ہر وقت ہمیں پیٹنا جینے کا رہا

٦

بے روے نبی عرضِ صفا کیوں ہوتا
اور آئنہ وحدت کا جلا کیوں ہوتا
معشوق کے جلوے سے ہے پیدا عاشق
ہوتا نہ محمدؐ تو خدا کیوں ہوتا

۷

اس عہد میں احتسابِ ایمانی کیا
ابرامِ معاصی کی پشیمانی کیا
ہر دعویِ دیں حکم ایکٹ سے ڈسمس
ڈگری ہے کہ بے سود مسلمانی کیا

۸

یاں نفس کی شوخی سے ہے مجنوں لیلا
قانع ہے تو مت بھر نفی کہنا لا
کر شرم ذرا قلق دعا سے پہلے
ہاتھوں کا اٹھانا بھی تو ہے صورتِ لا

۹

فانی کے ہے نزدیک بقا کو بھی فنا
ظلمت کو اور نور و صفا کو بھی فنا
کیا خوف قلق موت کا میّت کے لیے
ہستی سے ہماری ہے فنا کو بھی فنا

۱۰

یہ شہر بلند عالمِ بالا سے تھا
ہم شکل غرض جنت ماویٰ سے تھا
اب کیا ہے اک آبادیِ ریگستاں ہے
دہلی کو شرف قلعۂ معلّٰی سے تھا

۱۱

اس بزم سے میدان میں جانا ہوگا
ایواں سے بیاباں میں جانا ہوگا
ہشیار ہو ، تیار ہو ، زنہار نہ سو
کیا جانیے کس آن میں جانا ہوگا

مرثیہ یار دل پزیر تصویر

۱۲

اے آہ ، نہیں کوئی ہم آہنگ اپنا
اے سختیِ جاں کون کرے سنگ اپنا
دل توڑ گیا[۲] مرگِ غلامِ احمد
تصویر کے صدمے سے اُڑا رنگ اپنا

ردیف الباء

۱۳

دروازے پہ تیرے ہی مروں گا یارب
کیا بیمِ جہنم ، نہ ڈروں گا یارب
گستاخیِ عذر ، بعدِ عصیاں معیوب
توبہ ہے کہ توبہ نہ کروں گا یارب

---

۲ - اصل متن (ص ۱۶۸) میں اسی طرح ہے - مرگ مؤنث ہے ، فعل مذکر 'توڑ گیا' درست نہیں ؛ 'توڑ گئی' ہونا چاہیے تھا- قلق نے مرگ کو مذکر استعمال کیا ہو تب مصرعِ اول درست ٹھہرے گا - (مرتب)

۱۴

ہر رنگ سے اب مرتے ہیں توبہ کے سبب
ہم سیکڑوں دکھ بھرتے ہیں توبہ کے سبب
مے سے ہوئی توبہ تو ہوئی بنگ روا
لاکھوں ہی بدل کرتے ہیں توبہ کے سبب

ردیف بائے فارسی

۱۵

گاہے تو کرم ہم پہ بھی فرمائیں آپ
آ جائیں یہاں بھی، جو کہیں جائیں آپ
دکھلائیے تو چاہنے والوں کی شکل
غیروں ہی کے ہمراہ کبھی آئیں آپ

ردیف التاء

۱٦

پر لگ گئے ایسے کہ اڑائی غیرت
اٹھتے ہی نقاب کے اٹھائی غیرت
اب کیوں کس و ناکس سے چھپاؤ منہ کو
سچ ہے تمھیں غیرت سے بھی آئی غیرت

۱۷

هر طرح سے ضائع ہے یہاں پر اوقات
مافات تلافی ہے تلافِ مافات
معدوم ہے موجود تو موجود عدم
اثباتِ نفی میں بھی ہے نفیِ اثبات

۱۸

کیوں کر نہ ہنسے غیر کہ روتا ہے بخت
گریے سے مرے مجھ کو ڈبوتا ہے بخت
کیوں کر شب ہجراں میں کہوں قصۂ وصل
سن سن مرے افسانے کو سوتا ہے بخت

۱۹

تا کے طلبِ یار میں بے حد منّت
کس واسطے بے مطلب و مقصد منّت
آئے گا وہ یاں تک جو نزاکت سے **قلق**
آتا ہے سرِ عذر پسِ صد منّت

۲۰

اک دم جو میسر ہو نظارا ، ہے مفت
بے دام و درم یاں کا تماشا ہے مفت
جب تک کہ **قلق** ہاتھ میں نقدِ جاں ہے
دل دینا ہے وہ نفع کہ سودا ہے مفت

تاریخ صحت آشوب چشم

۲۱

جب تک رمد آلود تھی چشمِ حضرت
تھا خار دل و دیدہ میں خوابِ راحت
خامہ ہے پئے سالِ منادی کہ **قلق**
لکھ صحتِ عین ہی ہے عین صحت

۱۲۸۶ھ

۲۲

عاقل کا نصیبا ہے ازل سے حسرت
ہے مال کو عقل سے ہمیشہ نفرت
لازم تھی **قلق** مجھ ہی کو شاہنشاہی
افسوس ہوئی نہ جمع عقل و دولت

ردیف تاے ہندی

۲۳

دل سے مجھے آنے کی ہے آن کے آہٹ
کیا طالعِ خفتہ کی گئی نیند اُچٹ
وہ پردہ نشیں گو کہ نہ آئے لیکن
اے چرخ ذرا سامنے سے تو تو ہٹ

ردیف الثاء مثلثه

۲۴

دنیا کا تمام کارخانہ ہے عبث
اس کشتِ عبث کا دانہ دانہ ہے عبث
اک حرفِ غلط ہے بلکہ یہ بھی ہے غلط
ہر ذکرِ عبث ہے ہر فسانہ ہے عبث

ردیف الجیم

۲۵

جاہل کی ہے میراث قلق تخت و تاج
کامل ہے سدا بے ہنروں کا محتاج
ابلیس کا عصیاں نہیں جز کبرِ کمال
بے قدریِ فن کا ہے ازل ہی سے رواج

۲۶

تیرا ہے جہاں خالقِ یزداں محتاج
دانا محتاج اور ناداں محتاج
حاجت ہے اگر کسی کی تو تجھ سے ہو
لیکن نہ ہو انسان کا انساں محتاج

۲۷

خود رفتہ ہو بدمست ہو کیسا ہے مزاج
کل آپ کی کیا وضع تھی کیا رنگ ہے آج
دیکھا ہے اگر خواب زلیخا سنبھلو
رعنائیِ یوسف کی کنواں ہے معراج

ردیف جیم فارسی

۲۸

ژولیدہ معما ہے جہانِ [1]پُر پیچ
اے دل نہ ستم' اس کے کشائش میں کھینچ
اچھا ہے خیالِ دھن و فکرِ کمر
دنیا ہیچ است و کارِ دنیا ہمہ ہیچ

ردیف الحاء حطی

۲۹

معیوب ہے ہر سحر کا آنا اے صبح
اچھا نہیں فتنے کا جگانا اے صبح
ہو جائے گا حشر دیکھ کہتے ہیں ہم
پردہ نہ کسی کا تو اٹھانا اے صبح -

---

۱ - اصل متن (ص ۱۷۱) میں 'سم' ہے - (مرتب)

ردیف الخاء المعجمه

۳۰

ره ره نه ستا هم هی کو هر آن اے چرخ
ہے جنبشِ دل سے عرش لرزاں اے چرخ
اس کو بھی تو مانندِ قلق رکھ بےتاب
ظالم ہے تو کر ظلم ہی یکساں اے چرخ

ردیف الدال المهمله

شکایتِ امساکِ باراں

۳۱

اے چرخ تجھے کہتے ہیں سب پیر نہاد
ہے سارے جہاں سے تیری اول بنیاد
مانا کہ ہیں ازبر تجھے جھگڑے سارے
پر ابر کا آنا نہیں تجھ کو بھی یاد

۳۲

زہّاد کا غفلت سے ہے اوراد و سجود
ہے عید کی تصویر میں رنگِ معبود
فانی بحت[۱] میں ہے تو ہی 'یا باقی'
نسیان میں بھی ہے یاد تری 'یا موجود'

۱- بحت: ع، (به فتحِ با و سکونِ حا) ساده، خالص، محض، صاف، بےدرد، بےغش۔ (فرهنگ عمید، ص ۲۴۰)

در تہنیت عید

۳۳

تا ماہِ صیام ہوئے بابِ اُمید
اور واسطۂ جشن ہو یہ یومِ سعید
ہر روز سے ہو تیرے شبِ قدر عیاں
ہر شب سے نمایاں ہو تری روزِ عید

ردیف الذال

۳۴

افسانۂ یار بہرِ وصلت ہے لذیذ
پیمانۂ مے پئے فراغت ہے لذیذ
اے شیخ ہے ہر وقت تو روکھا پھیکا
یہ طرفہ مذاق ہے کہ طاعت ہے لذیذ

ردیف الراء

۳۵

فلک میں ضبط کو سمجھا تھا جوہرِ الفت[1]
مرا قصور ہے مجھ سے ہی ہو گئی تقصیر
بجا ہے صرفِ دمِ نزع گر رہوں شب و روز
سزا ہے جاں کی ہو گر جزو جزو میں تکبیر

۱۔ قافیہ غلط ہے ۔ اصل کلیات (مطبوعہ انصاری پریس دھلی ص ۱۷۳) میں ''الفت'' ہی ہے ۔ (ادارہ)

مستزاد

۳٦

کیا خستگیِ بخت ستاتی ہے مجھے —— پیماں ہو کر
اور رنجشِ تقدیر کڑھاتی ہے مجھے —— درماں ہو کر
تو پردہ نشیں ہے اور میں ہوں رسوا —— بس صبر کیا
کیوں یاد تری شکل دکھاتی ہے مجھے —— ارماں ہو کر

۳۷

انسان ہے کس بات پہ اتنا مغرور
اپنی تو نظر میں نہیں، جز گردِ فتور
بھولا ہے یہ کس هستیِ موهوم پہ آہ
ہے محشرِ وعدہ سو تعیّن سے دور

۳۸

ویراں کدۂ دھر میں تعمیر نہ کر
داغِ صد سنگ و خشت سینے پہ نہ دھر
اس نکتۂ معمار سے کر فکرِ مآل
رکھتا ہے نکلنے کے لیے پہلے در

۳۹

اے صدق کیا ضعفِ بصر نے معذور
ہر چارہ و درماں سے ہوئے تم مجبور
اے کاش نہ ہوں آپ کی چندھی آنکھیں
کرتے ہیں دعا ہم بھی کہ چشمِ بد دور

۴۰

تھا آدمِ خاکی غضبِ بے زنہار
پر موت کے ہاتھوں سے ہوا ہے ناچار
سچ ہے قلق انسان ہے کیا کچھ سرکش
مر کر بھی تو ہوتا ہے یہ کاندھوں پہ سوار

۴۱

ہر فصل میں ہوتے ہیں جواں سارے شجر
ہر سال نئے پھولتے پھلتے ہیں ثمر
انساں کی کوئی فصل نہ پھر کر آئے
اول ہی کا جھوکا ہے بہارِ آخر

۴۲

ہرگز مرے عصیاں کا نہ اٹھے گا بار
پلّے کی نہیں اس کے ترازو زنہار
کر بازوے عباس کے صدقے میں فضل
دے شانۂ رحمت کو نہ زحمت غفّار

۴۳

یارب نہ طلب گارِ کس و ناکس کر
تنگیِ جہاں کو نہ مرا محبس کر
کر رحم بھی آخر کہ کہاں تک فریاد
جو چاہے[1] سو تو نے کیا ہے بس کر

۱- 'چاہے' اصل متن (ص ۱۷۳) میں ، 'چاہیے؟' - (مرتب)

۴۴

هر روز مرا تار ہے هر شب دیجور
اندھیر سے ہے ساری خدائی معمور
هر ذرہ ہے دوزخ ، شررِ گرمیِ آہ
اک شمع تو گھر میں مرے ٹھنڈی ہے ضرور

۴۵

مسجد کو دیا چھوڑ ریا کی خاطر
کعبے نہیں جاتا تو حیا کی خاطر
مے خانے میں جاتا ہوں تو رحمت کے لیے
مے پیتا ہوں احسانِ خدا کی خاطر

۴۶

هر داغِ رواں ہے موجِ کوثر
هر اشکِ برشتہ جامِ آبِ کوثر
جو پھوٹ کے روتی هیں قلق یاں آنکھیں
باللہ کہ واں ہوں گی حبابِ کوثر

۴۷

خواهش نہیں طاعت کی تجھے ربِ قدیر
پر عفو کو درکار ہے جرمِ دل گیر
هم جانتے هیں جوش ہے رحمت کو مگر
تقصیر میں کرتے نہیں هم تو تقصیر

۴۸

بزم اُس کی ہے فردوس و ارم سے بہتر
واں جم کے قلق بیٹھے ہیں جم سے بہتر
حضرت کے کنایات سنو کہتے ہیں
دیکھیں تو کہ نکلے کوئی ہم سے بہتر

۴۹

اے پردہ شگاف آ نگاہوں کے حضور
برقع سے سرِ بام یہ کیا چشمکِ دور
میداں میں نکل تعزیہ دار آ پہنچے
ہے قتل غریبوں کا محرّم میں ضرور

۵۰

کس طرح کہوں آ بھی کہیں عذر نہ کر
رسوائیِ ناموس کا ہے کس کو ڈر
وہ پردہ نشیں خلوتِ دل میں کیا آئے
اُمید تو جاتی نہیں دل سے باہر

۵۱

کیا نامۂ نامی ہے کہ ہے مایۂ نور
ہے چشمکِ ہر نقطہ کہ چشمِ بد دور
کیا صاف ہے کیفیتِ لفظ و معنی
وہ آنکھ میں ہے نور تو یہ دل میں سرور

۵۲

ہر زخمِ جگر کھایا ہے دل پر تن کر
چھلنی کی ہوا شکل کلیجا چھن کر
پھر دیدۂ وحشی سے نظر ملتی ہے
اب خاک مری اُڑتی ہے ہرنی بن کر

ردیف رائے ہندی

۵۳

مجھ کو شبِ غم اے دلِ غم خوار نہ چھیڑ
رہنے دے بس اب قصۂ اغیار نہ چھیڑ
داغوں سے ہے سینہ رشکِ بالِ طاؤس
اے رشک نہ لے چٹکیاں ہر بار نہ چھیڑ

ردیف زائے معجمہ

۵۴

اس بزم مین ہر شمع کو ہے سوز سے ساز
ہر سنگ ہے طوفانیِ دریائے گداز
القصہ ہے طالب کے حوالے مطلوب
رہتا ہے سدا ناز گرفتارِ نیاز

۵۵

کیا جانیے اُلفت کا ہے کس سے آغاز
جاں بر نہیں ہوتا کوئی اس کا جاں باز
حاصل نہیں کچھ دوست کی کوشش سے قلق
دشمن کے سوا کوئی نہیں محرمِ راز

۵٦

دنیا کا عجب زنگ سے دیکھا انگیز
ہر پاے حنا بستہ سوارِ شبدیز
ہر ذرّہ ہے خورشیدِ قیامت افروز
ہر قطرہ ہے طوفانِ خودی سے لبریز

۵۷

دنیا ہے عجب بوقلموں ضد آموز
ہر شکلِ موافق ہے مخالف اندوز
یاں دست و گریباں ہیں درد و درماں
ہر سوز میں ہے ساز تو ہر ساز میں سوز

ردیف السین المہملہ

۵۸

کہتے ہیں کہ مایوس کو آساں ہے یاس
ہر سینۂ ناکام میں مہماں ہے یاس
کیا جانیے کیا یاس کی صورت ہوگی
امید وہ رکھتے ہیں کہ لرزاں ہے یاس

ردیف الشین معجمه

در مرثیۂ ترخیص حافظ مولوی عبدالرحمان صاحب المتخلص به سوزش

۵۹

تودیع سے **سوزش** کی ہوے مجنوں ہوش
ہیں دیدہ و دل اب تو یکسر خوں ہوش
کیوں کر کہوں کعبے سے پھرو تم لیکن
جاتے ہو قرار ساں تو آؤ جوں ہوش

۶۰

دیں ہی بے ہوش ہے نہ دنیا بے ہوش
ہر **شکل** سے ہے صورت عقبیٰ بے ہوش
کس جاے پہ آیا ہوں **قلق** مے پینے
بے ہوش بھی کہتا ہے کہ اتنا بے ہوش

۶۱

ہے نوک مژہ سے جس کی میرا دل ریش
اس کے بھی چبھا دل میں محبت کا نیش
آگے مرے جاتا ہے عدو کے پیچھے
رہتا نہیں دل دے کے کسی کا پس و پیش

ردیف الصاد مہملہ

٦٢

اب اہلِ وفا کو ہے ستاتا اخلاص
اے کاش قلق مجھ کو نہ آتا اخلاص
کیوں کر نہ وفا ہو بے وفائیِ رقیب
کہتے ہیں وہ مجھ کو نہیں بھاتا اخلاص

٦٣

ہوتا ہی نہیں والۂ صادق کا قصاص
عذرا نہیں دے سکتی ہے وامق کا قصاص
گردن نہ جھکاؤ غم سے چھلکے گا خون
اغیار کا قتل اور عاشق کا قصاص

ردیف الضاد معجمہ

٦٤

غیروں کو شبِ وصل بلانے سے غرض
مشتاق زمانے کو دکھانے سے غرض
ارماں ، حسرت ، دریغ باہر باہر
اک تجھ سے غرض ہے یا زمانے سے غرض

ردیف الطاء مہملہ

٦۵

افسوس کہ ہے اُلفتِ دل خواہ غلط
ہر جستجو و کوششِ جاں کاہ غلط
گر وعدۂ وصل بھی ہو صادق تیرا
کوچے کی خوشی سے ہو ترے راہ غلط

ردیف الظاء معجمہ

٦٦

لو جائیے بس خدا ہمارا حافظ
بے یار کا ہے وہی پیارا[۱] حافظ
کیا رشک مرے دل سے گیا گزرا ہے
کس منہ سے کہوں خدا تمہارا حافظ

---

۱ - 'پیارا' بر وزن 'فعولن' اساتذۂ متاخرین کے خلاف (فعلن کے وزن پر ہے) استعمال کیا ہے - (مرتب)

ردیف العین مہملہ

٦٧

کب سوزِ جگر کو مرے پاتی ہے شمع
کیوں روتی ہے کیوں اشک بہاتی ہے شمع
خوبوں کو بھی کیا رشکِ وفاداری ہے
پروانوں کو جل جل کے جلاتی ہے شمع

ردیف الغین معجمہ

٦٨

دو روزہ حیات میں آٹھائے سو داغ
نایابیِ سم کے بھی تو کھائے سو داغ
ہے ایک مروت میں قلق لاکھ آزار
پھرتا ہوں کلیجے سے لگائے سو داغ

ردیف الفاء

٦٩

کہتا ہوں خدا لگتی عقیدے کے خلاف
ہے تیرا خطاوارِ سزاوارِ معاف
ہے رحم ہی شایانِ خدائی تجھ کو
انصاف یہی ہے کہ نہ کرنا انصاف

ردیف القاف

۷۰

افسوس تری وضع پہ آتا ہے قلق
انداز ترا جی کو کڑھاتا ہے قلق
تو دولتِ حسن ہے کہ نقدِ نا اہل
کیوں ہاتھ سے اپنے آپ جاتا ہے قلق

۷۱

دنیا ہے خیالات سے سرشار قلق
باندھو نہ تصوراتِ دشوار قلق
معشوقِ فرنگ و بادہ تحفہ موجود
تقدیر سے سب ہیں تری ناچار قلق

ردیف الکاف

۷۲

دنیا میں قلق کیا ہے سرا سر ہے خاک
درویش ہے خاک اور تونگر ہے خاک
مٹنے کے لیے شکل بنی ہے سب کی
جو خاک کی سوغات ہے آخر ہے خاک

۷۳

اے[1] قادرِ مطلق بہ طفیلِ لولاک
دے مجھ کو شفا مرض سے کر واپس باک
ناچیز ہے کس چیز سے شایانِ عذاب
جاں تیری ہے اور جسم ہے سرمایۂ خاک[1]

۷۴

دل دیر گزاری سے ہے آوندِ نمک
ہر زخمِ جگر رهتا ہے دل بندِ نمک
یک رو ہے **قلق** جانتا ہے عادت کو
ہر ایک سے یکساں ہوں میں مانندِ نمک

۷۵

منہ گیسوۓ پُر خم سے نہ موڑوں کب تک
اس سلسلۂ پا کو نہ توڑوں کب تک
تو مجھ سے عدو تجھ سے غرض سب ہی چھٹے
آخر تری اُمید نہ چھوڑوں کب تک

---

۱ - اصل کلیات قلق مطبوعہ میں صفحہ ۱۸۰ پر یہ رباعی مکرر درج ہے - (مرتب)

ردیف کاف فارسی

۷٦

دشمن سے ہوئی صلح تو ہے یار سے جنگ
دل کھلنے نہ پایا ہے کہ جاں ہو گئی تنگ
سارے ہی **قلق** کام ترے اُلٹے ہیں
ننگِ دو جہاں ہوا ہے ہو کر بے ننگ

ردیف اللام

۷۷

ہر روزِ خوشی ہے شبِ غم سے پامال
خالی[۱] کا ہے چاند بعد شہرِ شوال
کس طرح **قلق** عمر نہ روتے گزرے
ہوتا ہے محرم سے شروعِ ہر سال

---

۱ - 'خالی' 'ذی تعد'، چاند کا گیارھواں مہینا - یہ نام نورجہاں بیگم نے رکھا تھا - عورتیں اس مہینے کو منحوس سمجھتی ہیں : ناسخ

کیا اگلا مہینہ اجی ہو جائے ابھی وصل
شوال سے خالی کا مہینا نہیں اچھا

(نوراللغات جلد دوم ص ٦١٩
مطبوعہ کراچی ۱۹۵۹ ع)

۷۸

اے پردہ نشیں سہل ہوا یہ اشکال
درپردہ نہیں وصل سے کم تیرا خیال
آئینۂ دیدہ کے اُدھر پھرتے ہو
اُس طرف نظر کے ہے طلسماتِ وصال

۷۹

اے صلِّ علا، سوز[1] ترا حسن و جمال
نہ مہر میں خوبی ہے نہ یہ مہ میں کمال
کاہش کے سوا کچھ نہیں افزائش میں
تو بارہ برس کا رہے یا رب صد سال

۸۰

نوچندی[2] کے میلے کا نہ پوچھو کچھ حال
ہوں دیکھ کے حیران کہ دوں کس سے مثال
یا روضۂ رضوان ہے سادہ سا مکاں
یا سیر سے میرا ہی منقش ہے خیال

---

۱ - سوز تخلص عمری بارہ سالہ سے مراد عبدالکریم سوز خلف صہبائی ہیں ؛ ان کی جدائی سے متعلق بھی ایک رباعی ہے -

۲ - میرٹھ میں نوچندی کا میلہ مشہور ہے - اکبر میرٹھی کا مطلع ہے :

ہے بہار باغ دنیا چند، روز جیسے نوچندی کا میلہ چند روز

۸۱

کیا بیٹھنے دے حلقۂ یاراں میں کلال[1]
مے خانے کی خدمت بھی ہوئی تجھ کو وبال
افسوس **قلق** تیری تن آسانی پر
اک دن نہ پیا ساغرِ مے کر کے حلال

۸۲

مشرک ہیں بڑے کافرِ اکفر، دجال
یہ چاہتے ہیں دل سے خدائی کا زوال
کر رحم، مسلماں ہوں، مسلماں ہوں میں
یا رب مجھے اس کافرہ[2] کو دے بھی ڈال

ردیف المیم

۸۳

ہے بس کہ جوانی میں بڑھاپے کا غم
ہر سانس سے آتی ہے صدائے ماتم
ہم رنگ عجب کاہش و افزائش ہے
بڑھتی ہے اگر عمر تو گھٹتے ہیں ہم

---

۱ ۔ کلال (ہ بہ فتح اول) مذکر، ہندوؤں کا ایک فرقہ جس کا پیشہ شراب فروشی ہے ۔ شراب کھینچنے والا ، اور بیچنے والا ۔ نوراللغات جلد سوم (ص ۲۰۹ء)

۲ ۔ '**قلق**' کسی غیر مذہب حسینہ پر مائل نظر آتے ہیں جسے کافرہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں ۔ (مرتب)

۸۴

زاہد رہے ہشیار کہ بدمست ہیں ہم
غافل نہ ہو زنہار کہ بد مست ہیں ہم
کیا جانیے کیا ہو جو نہ ہووے غفلت
ہاں خوب[1] ہی بیدار کہ بد مست ہیں ہم

۸۵

آلودہ خیالات میں تیرے ہوں مدام
طاعت سے غرض نہ کچھ عبادت سے کام
ہر لحظہ ہوس بوسے کی ہر دم بس بس
اُلفت کے تقاضے کو نہ کچھ صبح نہ شام

۸۶

نا حق تھا قلق مجھے غرورِ اسلام
مردود ہوا کرتی ہے نذرِ اصنام
محراب ہے ، مسجد میں مرا افسانہ
توبہ ہے ، ہوا ہوں میں بھی کیا ہی بدنام

۸۷

ہم اور ہمارا آہ اچھا وہ کام
تو اور ترا وہ ظلمِ بے حد و مقام
جی کر دنیا میں اور مر کر دیں میں
ہر وجہ سے منہ دیکھنا تیرا ہے حرام

---

۱ - اصل متن (ص ۱۸۱) میں 'خواب ہی' ہے - معنی نہیں کھلتے اس لیے 'خوب ہی' تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

۸۸

بے برگ و نوا کی شعرخوانی معلوم
بے دانہ و دام نکتہ دانی معلوم
جس کی غمِ ناں ہی غذا ہو ، اُس کی
میدانِ سخن میں پہلوانی معلوم

۸۹

کیفیتِ دل خوب ہی ہیں جانتے ہم
ہوتا کوئی ناصح بھی تو کب مانتے ہم
دیکھے ہیں قلق روز نئے ہی انداز
افسوس نہیں یار کو پہچانتے ہم

ردیف النون

۹۰

اے چشمِ غمیں ، تیرے عوض روئے کون
جی اپنا بھلا میرے لیے کھوئے کون
افسانۂ وصل کس سے پوچھوں شبِ ہجر
آپ ہی میں کہوں آپ سنوں ، سوئے کون

۹۱

یہ حالِ بتر رحم فزا ہے کہ نہیں
اس زیست سے مرنا ہی بھلا ہے کہ نہیں
منتا ہی نہیں کہیے کسی صورت سے
یا رب تو ہمارا بھی خدا ہے کہ نہیں

۹۲

اس وقت زمانے میں بہم ایسے ہیں
ہر بزم میں کہتے ہیں کہ ہم ایسے ہیں
ہے رندِ ہزار شیوہ ہر چند **قلق**
ایماں سے اگر پوچھیے کم ایسے ہیں

۹۳

مر مر کے بے رنج و بلا جیتے ہیں
ناراض ہیں راضی بہ رضا جیتے ہیں
ارمان مجسم ہے سراپا اپنا
جی مار کے جیتے ہیں تو کیا جیتے ہیں

۹۴

حسرت ہے نشانی کہ دیے جاتے ہیں
حرماں کو فقط ساتھ لیے جاتے ہیں
ہیہات **قلق** موت کا رستہ ہیہات
منزل کی طرف پشت کیے جاتے ہیں

۹۵

لازم ہے کہ فکرِ رخِ دلبر چھوڑوں
واجب ہے یہی اب کہ مقرر چھوڑوں
ناصح نے کیا مجھ کو بھی آخر مجنوں
ہوں قید میں جس کی اسے کیونکر چھوڑوں

۹۶

کس واسطے دی تھیں ہمیں یارب آنکھیں
واللہ کہ بے دید ہیں ، بے ڈھب آنکھیں
دانائی ہے نادان ، تو بینائی کور
کب آپ کو دیکھا کہ مندیں جب آنکھیں

۹۷

اصحابِ محمد جو اشارا کر دیں
دریاے کرم کو بے کنارا کر دیں
ہر ذرۂ نا چیز کو خورشید بنائیں
جو خشک ہو قطرہ اسے دریا کر دیں

۹۸

یا رب ہے عیاں تجھی پہ کارِ دشمن
انجامِ حسین و کار زارِ دشمن
البتہ محبت ہے تری سب پر شاق
تو دوست کو کرتا ہے شکارِ دشمن

۹۹

شہ کہتے تھے اعدا سے دمِ بازپسیں
کیا مار کے لوگے مجھے اے دشمنِ دین
جز داغ نہیں اہلِ حرم کا زیور
جز گنجِ شہیداں کوئی دولت ہی نہیں

۱۰۰

آؤ **قلق** اب شاہ کے غم میں روئیں
فریاد کریں ، درد و الم میں روئیں
کیا ننگ ہے رونے سے ہمیں جبکہ حرم
سر ننگے کھڑے اہلِ ستم میں روئیں

۱۰۱

گردن کو جھکا دیتا ہے ادنٰی احسان
کس طرح سے دکھلائیں گے منہ نا احسان
رزاق ہے تو اور غفورالعصیان
ہے دیتا ہے ہم جیسوں کو تیرا احسان

۱۰۲

اس خطے کی جا عالمِ بالا میں نہیں
یارائے نظر چشمِ تماشا میں نہیں
ہر طائفہ شایانِ طوافِ ملکوت
میرٹھ میں ہیں وہ لوگ کہ دنیا میں نہیں

۱۰۳

نظارۂ پنہاں کا نہیں کچھ درماں
سینے میں ہر اک سانس ہے خارِ حرماں
آنکھوں میں کھٹکتی ہے تری گردشِ چشم
چبھتی ہے نظر میں تری نوکِ مژگاں

۱۰۴

اے ابر کہاں تک ترے رستے دیکھیں
اس طرح سے دنیا کو ترستے دیکھیں
بھولا نہیں بارش کا طریقہ تو اگر
آ سامنے ہم بھی تو برستے دیکھیں

ردیف الواو

۱۰۵

کہتا ہے یہ دل بر کہ نہ بہلا دل کو
تسکین و دلاسے[1] کا سبب کیا دل کو
جس سے ہمیں ضد تجھے اُسی سے خلطہ[2]
جس نے ہمیں چاہا، نہیں چاہا دل کو

---

۱ - ''تسکین و دلاسا'' مرکب عطفی ہے - مؤلف نوراللغات لکھتے ہیں :
دلاسا: (دل آسا ، فارسی میں دل کی تسلی ، دل کو تسکین
(حاشیہ نمبر ۱ کا باقی حصہ اور حاشیہ نمبر ۲ اگلے صفحے پر)

۱۰۶

عیّار یہ مرنا ہی نہ تھا پر مجھ کو
یعنی کہ بھروسا ہے وفا پر مجھ کو
روتا ہوں پڑا دیر میں کافر کے لیے
آتی ہے ہنسی شانِ خدا پر مجھ کو

۱۰۷

شب ہائے جوانی نے چھپایا دن کو
بدمستیِ دوشیں نے گنوایا دن کو
کیا یاد رہے عہدِ جوانی کی بہار
بیداریِ ہر شب نے سلایا دن کو

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)

دینے والا ، دل کو تسلی دینے والا - یہ لفظ ہندی میں بہ معنی دل کی تسلی ہے) مذکر ، تسلی و تشفی (دینا کے ساتھ) -
(نوراللغات جلد دوم ص ۶۴۷ طبع کراچی)

۲- خلطہ - (بالضم - عربی میں خُلْطَۃٌ - شرکت) مذکر ، میل جول ، امیر :

تب اُس بہشتی رو سے یہ خلطہ بہم کیا
جب برسوں ہم نے سورۂ یوسف کو دم کیا

(نوراللغات ج ۲ ص ۶۴۵)

ردیف الہائے ہوز

۱۰۸

یاں ہم کو دیا کیا جو وہاں پر ہو نگاہ
طاعت سے کچھ اُمید نہ کچھ خوفِ گناہ
کر فضل ہی اپنا کہ عدالت کیسی
آپھی[1] تو مدعی ہے آپھی ہے گواہ

۱۰۹

یا رب ہے خجالت کے سبب خوں توبہ
ہے بادۂ گل رنگ سے گل گوں توبہ
آلودہ زباں ذکرِ صنم میں ہے مدام
کس منہ سے ترے رو برو آؤں توبہ

۱۱۰

مسجد میں نہ جا واں نہیں ہونے کا نباہ
بے وجہ خصومت بھی ہے عصیاں کی گواہ
مے خانے میں صدیق مسلماں ہیں گبر
کیا جوشِ محبت ہے کہ اللہ اللہ

---

۱ - 'آپ ہی' بر وزن 'فاعلن' ہے لیکن قلق نے اس مصرع میں 'آپھی' بر وزن 'فعلن' برتا ہے (مرتب)

۱۱۱

کم حسنِ عمل سے نہیں ہر کارِ سیاہ
مظہر ہے رحیمی کا تری میرا گناہ
قہّار تجھے جاننا نادانی ہے
'لا علم لنا[۱]' 'و ما عرفنا[۲]' ہیں گواہ

۱۱۲

ہے شانِ نبیِ عربی کعبۂ جاہ
محتاجِ فقیری ہے اسی در پر شاہ
جس شعر میں ہو سید لولاک[۳] کا ذکر
اے قبلۂ عالم ہے وہی بیت اللہ

۱۱۳

جب سے تجھے دیکھا ہے نہ دیکھا کیا کچھ
نادم ہوئے کیا کیا ہوئے رسوا کیا کچھ
دکھلاؤ نہ اس پردہ نشینی کی شان
نظروں ہی کے اوجھل میں مری کیا کیا کچھ

---

۱ - دیکھیے سورۂ بقر ، پارۂ اول ، رکوع ۳ -
۲ - دیکھیے حدیث "وما عرفناک حق معرفتک -"
۳ - تلمیح حدیث "و لولاک لما خلقت الافلاک -"

ردیف الیائے تحتانی

۱۱۴

محراب و مصلاؔ اور زاہد بھی وہی
سجدہ ، مسجود اور ساجد بھی وہی
تکلیفِ قیامت ہے یہ کس کی خاطر
حاکم بھی، مدعی بھی شاہد بھی، وہی

۱۱۵

اک عمر پڑی ہے رنج اٹھانے کے لیے
ہیں سینکڑوں راہ جان جانے کے لیے
کیا فرض ہے ظالم میں تجھی کو چاہوں
ساماں ہیں بہت دل کے ستانے کے لیے

۱۱۶

کیا کیا عوض غیر نہ لیں گے تجھ سے
گو دل نہ ملو[۱] ہم تو ملیں گے تجھ سے
اس شعلہ مزاجی کو تری دیں گے فروغ
کس طرح نہ اغیار جلیں گے تجھ سے

---

۱ - اصل متن (ص ۱۸۷) میں 'گو دل نہ ملو' بے معنی ہے ؛ ''گو دل نہ ملے'' یا 'گو تو نہ ملے' با معنی رہے گا - (مرتب)

۱۱۷

بد مستیِ دوشینہ جو یاد آتی ہے
خود رفتگی قابو سے نکل جاتی ہے
ہے یاد شبِ وصل سحر خواب و خیال
اک لمحے میں دنیا ہی بدل جاتی ہے

۱۱۸

جو جا کے نہ آئے پھر، جوانی ہے یہ شے
پر حیف نصیبِ رائگانی ہے یہ شے
کیا جان کی فکر ، لینی دینی ہے یہ چیز
کیا دل کا خیال ، آنی جانی ہے یہ شے

۱۱۹

جو بات کہ ہے عیاں چھپانی کیا ہے
بگڑی ہوئی پھر شکل بنانی کیا ہے
مانا کہ نہیں تم کو کسی سے الفت
اب قصۂ غیر کی کہانی کیا ہے

۱۲۰

جاں جائے پر امید نہ جائے گی کبھی
نیند آنکھ میں آرام نہ پائے گی کبھی
غیر آئے گا کیوں خانۂ دل میں ، تو آ
اے پردہ نشیں یاس نہ آئے گی کبھی

۱۲۱

اس بزم کی طرفہ میہمانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آ کے نہ جائے پھر بڑھاپا دیکھا
جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

۱۲۲

صد حیف کہ مے نوش ہوئے ہم کیسے
ابرار سے روپوش ہوئے ہم کیسے
کچھ یاں کا خیال ہے نہ واں کا کھٹکا
ہوش آتے ہی بے ہوش ہوئے ہم کیسے

۱۲۳

کیا ذکرِ وفا، جفا کسی سے نہ بنی
گر دوست ملا تو مدّعی سے نہ بنی
آخر کو **قلق** نے زہر کھایا ناچار
اب کس سے بنی، جب اپنے جی سے نہ بنی

۱۲۴

دل جوشِ معاصی سے نہ کیوں خوں ہو جائے
کعبہ بھی مرے طوف سے مجنوں ہو جائے
بوسے میں اگر دوں حجرِ اسود پر
لب ہائے مے آلود سے گل گوں ہو جائے

۱۲۵

جب پردہ نشیں یاد تری آتی ہے
منہ ڈھانپ کے پہروں مجھے رلواتی ہے
صدموں سے ہوا سینہ یہ پکا پھوڑا
ہر سانس میں اک ٹھیس سی لگ جاتی ہے

۱۲۶

کب چرخ سے فریاد رسی آتی ہے
افغاں مری منہ اور بھی سی آتی ہے
میں شب کو نہ روؤں تو سحر کیونکر ہو
رونے پہ مرے سب کو ہنسی آتی ہے

۱۲۷

جوہر ہے اگر فرد تو کیا عزت ہے
کچھ عرض کی حاجت نہیں جو ذلت ہے
اندازۂ تقدیر ہے معلوم ہمیں
مل جائے تو قسمت نہیں ہے قسمت ہے

در یادِ کافرہ منصرہ

۱۲۸

جب بن کے طبیب واں رسائی پائی
پیتے ہی دوا اور انھیں قے آئی
اس چرخ کا یہ تازہ شگوفہ دیکھو
عیسیٰ نے مسیحا کو زمیں دکھلائی

در هجر یگانۂ دل سوز اخی مولوی عبدالکریم سوز
خلف مغفور صہبائی داغ ناصیۂ شہادت برنائی

۱۲۹

وہ ایک مہینے کے لیے کیا بچھڑے
جو اُٹھ نہ سکے حادثے وہ مجھ پہ پڑے
جنبش نہ کرے گا یہ مہینا صد سال
اے چرخ عجب پیچ سے ہفتے جکڑے[1]

۱۳۰

جو چھٹ نہ سکے وہ آج چھوڑا ہم نے
مےخواری کے سامان کو توڑا ہم نے
جاتا ہے کوئی خیالِ لذت توبہ
داماں ترا آخر کو نہ چھوڑا ہم نے

۱۳۱

برسات قلق مجھ کو بھلا کیا خوش آئے
گر ایک قدم چلیے پھسلیے سو جائے
کہنہ در و دیوار گرے پڑتے ہیں
ابر آکے نہ کیوں کر مرے گھر میں گھر جائے

---

۱ - اصل متن (ص ۱۸۹) میں 'جکڑے' - (مرتب)

۱۳۲

ہر سانس میں منہ کو ہی جگر آتا ہے
اس ضبط سے دل سینے میں تھرّاتا ہے
کس طرح ترا ناوکِ مژگاں بھولوں
یاد آتے ہی اک تیر سا لگ جاتا ہے

۱۳۳

یہ دولت و مال خاک ہو جائیں گے
ہر حالت و حال خاک ہو جائیں گے
کیا ذلتِ افلاس و غرورِ دولت
یہ خواب و خیال خاک ہوجائیں گے

۱۳۴

منہ تیرے رخِ شوخ[1] سے موڑوں میں بھی
اس کشمکشِ یاس کو توڑوں میں بھی
قبضے میں ترے ہوں نہیں جرأت لیکن
چھٹ جائے جو دل تجھ کو نہ چھوڑوں میں بھی

---

۱ - اصل متن (ص ۱۹۰) 'شوق' بے معنی ہے ؛ 'شوخ' تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

۱۳۵

کیا طبع سوے ظلم و ستم مائل ھے
ھے خوف کی جا آپ کا کیسا دل ھے
کچھ رحم ھے تو قتل ھی کیجے لیجے
بے رحمیوں سے کارِ قلق مشکل ھے

۱۳۶

ھے مہرِ کرم گناہ گاری میری
امضاے نوید اُمیدواری میری
کر رحم، نہ انصاف کہ سب جانتے ھیں
رحمت تیری تباہ کاری میری

مرثیت[1]

۱۳۷

بانو نے کہا قطرہ[2] نہیں شیر کا ھے
اور حال بُرا اصغرِ[3] دل گیر کا ھے
شہ بولے کہ تم صبر کرو شکر کرو
کوثر میں بھی اب فاصلہ اک تیر کا ھے

---

۱ - واقعات کربلا سے متعلق ھے اس لیے یہ عنوان قائم کیا ھے - (مرتب)

۲ - اصل متن (ص ۱۹۱) 'مطر' ؛ 'قطرہ' تصحیح قیاسی ھے - (مرتب)

۳ - 'اصغر' امام حسین کے چھ ماھہ صاحب زادے جو میدان کربلا میں پیاسے شہید ھوئے - (مرتب)

۱۳۸

کس طرح سے گریہ کو نہ ہو طغیانی
ہے کشتیِ دریائے کرم طوفانی
عباس کے شانے بھی گرے مشک کے ساتھ
اے تشنہ لبی اب تو ہو پانی پانی

۱۳۹

شہ کہتے تھے افسوس نہ کہنا مانے
عباس کو وہ گھیر لیا اعدا نے
اے کوفیو! یہ دست درازی ہیہات
باللہ کہ یداللہ کے کاٹے شانے

۱۴۰

مظلوم کو دیکھو یہ ستم کرتا ہے
خوں اپنا عبث آپ کے سر دھرتا ہے
کیا کیجیے گا عذر مسیحائی کا
سنتے ہیں کہ تم پہ ہی قلق مرتا ہے

۱۴۱

یا رب ہے عجب حادثہ خلقت میں تری
ہیضے سے بجاں آئے حمایت میں تری
یہ ایک ہی قزاق ہے لے اس سے قصاص
کرتا ہے خیانت یہ امانت میں تری

۱۴۲

کل[1] تک تھی خلد خانہ زادِ دھلی
ھے خواب و خیال آج یادِ دھلی
جز نام ھمیں یاد نہیں اب نقشہ
تھا سایۂ عنقا کہ سوادِ دھلی

مرثیت

۱۴۳

ھے دوستیِ آل عبا[2] رونے سے
ھے درجۂ والائے ولا رونے سے
تو دلکا غبار اپنے قلق رو کے نکال
یہ آئنہ ھوتا ھے صفا رونے سے

۱۴۴

کیونکر نہ لبوں پہ جانِ زار آ جائے
کس طرح سے صبر آئے قرار آ جائے
مقتولِ نگاہ کی تسلی معلوم
یہ ظلم کہ خوں بہا بھی مارا جائے

۱- کل سے مراد (وسط ۱۸۵۷ع) تباھی سے پہلے کی دھلی ھے۔ (مرتب)

۲- 'آل عبا': مراد 'حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن، حضرت حسینؑ' سے ھے۔ (مرتب)

۱۴۵

دامن سے گلِ تازہ مہکتے نکلے
گلشن سے مرغِ گل چہکتے نکلے
کیا کہیے **قلق** کہ صاف کہنا مشکل
مے خانے سے کیوں مست بہکتے نکلے

۱۴۶

ایجادیِ خالق کا ثمر ہے ہستی
اُمیدِ دو عالم کی سحر ہے ہستی
سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں آخر کار
بے خبریِ مطلق کی خبر ہے ہستی

۱۴۷

وہ عیش کی حسرت نہ وہ غم باقی ہے
رخصت ہوئے ہم اُس کا کرم باقی ہے
گھٹنے پہ ہے تھوڑی تو نظر ہر جانب
جانا کہ بس اب آنکھ میں دم باقی ہے

۱۴۸

خورشید پہ جس وقت زوال آتا ہے
کیوں زیرِ زمین چھپ کے چلا جاتا ہے
جو داغ تہِ خاک ہیں روشن اُن سے
ہر شب یہ چراغ اپنا جلا جاتا ہے

۱۴۹

آفت میں شریک بھی ہوا ہے کوئی
ہمدرد کسی کا یاں بنا ہے کوئی
جاں دیتے ہو، دو، خلق تماشائی ہے
مرنے کے لیے قلق موا ہے کوئی

۱۵۰

دیں بھی دیا دل بھی دیا فرصت پائی
اللہ رے خجل پر نہ خجالت پائی
غیرت سے خیال کا پہنچنا مشکل
پہنچی ہے بہت دور مری رسوائی

۱۵۱

بہتاں جو کوئی یار پہ دھر دیتا ہے
وہ دامنِ حق خون سے بھر دیتا ہے
کب مفت وہ لیتا ہے کسی کے دل کو
دیکھ آنکھ سے کیا سلکِ گہر دیتا ہے

۱۵۲

کیوں کہیے کہ سرشاریِ بدمستی ہے
غفلت نہیں ہشیاریِ بدمستی ہے
کیوں دیکھیے عیب اور سنیے غیبت
سونے ہی میں بیداریِ بدمستی ہے

۱۵۳

جب باپ موا تو پھر ہے بیٹا کیا شے
آگے پیچھے دھریں ہیں سب کے لاشے
دنیا ہے **قلق** کچھ تو یہی کچھ ہے بس
ہر چیز ہے نا چیز ، تو ہر شے لاشے

۱۵۴

دولت مندوں کو ربط دولت سے ہے
یا کبر و غرور و بخل و نخوت سے ہے
ہوگا کوئی بادشاہ و میر و نواب
اپنا تو گزر تیری عنایت سے ہے

۱۵۵

گو شمع ہزار بار محفل سے جائے
پر جلوہ نہ وہ دیدۂ مائل سے جائے
دامن کو چھڑا کر وہ کہاں جاتا ہے
اُس کو ہی گیا جانیے جو دل سے جائے

۱۵۶

اے گور ملی خاک میں جاں تیرے لیے
ہر سانس پھری نعرہ زناں تیرے لیے
مٹ مٹ کے بنایا ہے تری صورت کو
بن بن کے مٹے نام و نشاں تیرے لیے

۱۵۷

چاکِ دلِ دل گیر کا پردہ ڈھک دے
رسوائیِ تدبیر کا پردہ ڈھک دے
یا رب کفِ خاکِ مکّہ کافی وافی
عریانیِ تقدیر کا پردہ ڈھک دے

۱۵۸

یا رب تجھے فکرِ پائے بندی کیا ہے
ناچارگی و نیاز مندی کیا ہے
ہے خالقی اور عاشقی ہے اور
پوچھ ہم ہی سے درد و دردمندی کیا ہے

۱۵۹

ہم کون ہیں اہتمام کرنے والے
ہر کام میں صبح و شام کرنے والے
کیا وعدہ و پیغام ہمارے تیرے
وہ آپ ہیں اپنا کام کرنے والے

۱۶۰

کیا لینے سوے جاہ و حشم جائیں گے
کیا دینے سرِ کوے کرم جائیں گے
آخر تو کہیں دیر کی نکلے گی راہ
جائیں گے تو کعبے ہی کو ہم جائیں گے

۱٦۱

هر چند فنا سے زبر و زیر ہوئے
لذّات سے لیکن نہ کبھی سیر ہوئے
پیری میں یہ جملہ نظرِ حرص کا ہے
دو آنکھ ذرا کھلتے ہی سو شیر ہوئے

۱٦۲

ناصح کی شکایت وہی زخمِ جاں ہے
ساقی و شراب ہی کا نوحہ خواں ہے
دیکھو تو اسے یاد ہیں کیا کیا باتیں
اللہ رے ترا حافظہ ، کیا شیطاں ہے

حصة مخمسات

تخمیس بر غزل شریف تبریزی

قلق دل دے کے تنگ آئے ہیں ہم مشکل سی ہے مشکل
کبھی آزارِ جاں مرہم ، کبھی آرامِ دل مشکل
یہاں بیدار ہے بدخواب اور ہشیار ہے غافل
به عالم عشق بازی با پری رویانِ سنگیں دل
عجب دردیست بے درماں عجب رنجیست بے حاصل

مزاجِ دل یہ بگڑا ہے کہ سب سے ہو گئی ان بن
پسند آئے ہمیں صحرا ، نہ خوش آ ئے ہے کچھ گلشن
اگر جنت میں بھی دیں مژدۂ وصلت ، تو ہے مدفن
به کامِ دل دو روزے چوں توانم زندگی کردن
که باشد چرخ ظالم یار بدخو عمر مستعجل

کہوں اے ہم نشیں میں اپنی ناکامی کا کیا عالم
کہ وہ ظالم ، جفا جو ، تند خو اور اس قدر برہم
ادھر تقدیر کے یہ پیچ آدھر تدبیر کے وہ دم[1]
به گردابِ بلائے عاشقی زیں ساں کہ افتادم
محالست ایں کہ افتد کشتیِ امید بر ساحل

۱- ن - غم -

بیانِ عشق کو رہنے دے یوں ہی گومگو ناصح
جو تو یک بار اس کو دیکھ لے تو پھر نہ ہو ناصح
میں دیوانہ سہی پر عقل اپنی تو نہ کھو ناصح
ز من در عشق لیلیٰ پیکرے ساماں مجو ناصح
ز مجنوں کس نجوید راہ و رسمِ مردمِ عاقل

نہیں کچھ شعلہ ہائے داغ و برقِ نالہ سے حیرت
کہ پرتو سے ترے روشن ہے سب کی خلوت و جلوت
مگر حیراں ہوں تیرہ رہ گئی کیوں کر شبِ فرقت
تو آں شمعے کہ بزمِ عاشقاں گرم است از یادت
جہالت از نظر دزد و خیالِ شمع ہر محفل

قلق کی سختیِ جاں سے رہے یہ نالہ و افغاں
جب آیا دم تو دیکھا لب پہ ہے لختِ دلِ نالاں
رہا رنجور جتنے دن، قیامت کو رکھا مہماں
شریفِ خستہ در ہجرِ تو آساں می‌سپارد جاں
ولے امیدِ وصلت کارِ او را می‌کند مشکل

تخمیس بر غزل حافظ شیرازی رحمۃ اللہ
نگویمت کہ در اخوان با صفا می باش
نگویمت پۓ پیرانِ پارسا می باش
امید وار گنہ پوشیِ خدا می باش
بہ‌دور لالہ قدح نوش و بے ریا می‌باش
بہ بوے گل نفسے ہم دم صبا می‌باش

یہ دھوم ابر کی یہ جوشِ لالہ و گلبن
وہ میکدے کی ترقی کہ برسے ہے اک دھن
خدا کے واسطے صوفی پسر تو اتنی سن
نگویمت کہ ہمہ سالہ مے پرستی کن
سہ ماہی می خور و نہ ماہ پارسا می باش

کہاں کا ذکر مناہی، کہاں کی فکرِ حسد
چلی ہی جاتی ہے واعظ کی ہم سے یہ رد و کد[1]
نہ اس کا قول درست اور نہ اپنا فعل سند
چو پیرِ سالکِ عشقت بہ مے حوالہ کند
بنوش و منتظرِ رحمتِ خدا می باش

وہ لطفِ خاص سے دل دار و جاں فزا ہی سہی
اور آنکھ اس کی بہ جز وصل لگ نہیں سکتی
مآلِ کار مگر سن ہماری بھی اتنی
وفا مجوے ز کس، ور سخن نمی شنوی
بہ ہرزہ طالب سی مرغ و کیمیا می باش

تلاش عالمِ صورت کی، کوچے کوچے کی
نہ کچھ ہوس رہی سر میں، نہ دل میں حرص رہی
کدھر کو ہم نہ گئے اور کہاں نظر نہ پڑی
گرت ہواست کہ ہمدم بہ سرِّ غیب رسی
بہ یاد ہمدمِ جانِ جہاں نما می باش

۱ - اصل متن (ص ۱۹۷) 'رد کد' - (مرتب)

وہ بستہ کرتے تھے اس طرح غیر سے پیماں
دو ابروؤں میں گرہ اور گرہ میں نازِ نہاں
اشارہ کرتے تھے مجھ کو یہ کاکلِ پیچاں
چو غنچہ گرچہ فروبستگی است کار جہاں
تو ہم چو بادِ بہاری گرہ کشا می باش

قلق کلامِ الٰہی کے گو نہ ہو حافظ
ولیک خاطرِ احباب کے رہو حافظ
سنو تو کہتا ہے کیا خوب نکتہ گو حافظ
مریدِ طاعتِ بیگانگاں مشو حافظ
ولے معاشرِ رندانِ آشنا می باش

ایضاً

لب پر تھی جان چشم میں تھا انتظارِ دوست
رہ رہ کے یاد آتے تھے قول و قرارِ دوست
ہو ہی چکی تھی جانِ رمیدہ نثارِ دوست
ایں پیکِ نامہ بر کہ رسید از دیارِ دوست
آورد حرزِ جاں ز خطِ مشکبارِ دوست

قاصد کا حال کچھ نظر آتا ہے مجھ کو زار
ہاتھوں سے دل کو تھامتا ہے ہو کے بےقرار
گو ضبط کر کے آپ کو کم بخت بار بار
خوش می دھد خبر ز جمال و جلالِ یار
خوش می کند حکایتِ عزّ و وقارِ دوست

قاصد سے پہلے کاش نکل جاتا اپنا دم
یا بدلے خوش خبر کے وہ لاتا پیامِ غم
اللہ رے بختِ بد کہ ہے شادی میں یہ الم
دل دادمش بہ مژدہ و خجلت ہمی برم
زین نقدِ کم عیار کہ کردم نثارِ دوست

قاضی کو مےفروش کی خدمت میں ہے نیاز
زاہد بھی میکدے کو اڑا چھوڑ جانماز
رندوں کے محتسب بھی اٹھانے لگا ہے ناز
شکرِ خدا کہ از مددِ بختِ کارساز
بر حسبِ آرزو ست ہمہ کاروبارِ دوست

گیسو و رخ سے شام و سحر دونوں آشکار
رفتار یہ غضب ہے کہ محشر ہے جاں نثار
گردش سے چشم کی ہے فلک سخت شرمسار
سیرِ سپہر و دورِ قمر را چہ اختیار
ہر گردش است بر حسبِ اختیارِ دوست

تو ہی ہے خاکساروں کی یار اے نسیمِ صبح
بن تیرے شعلہ بار بہار اے نسیمِ صبح
گونام کو ہیں دوست ہزار اے نسیمِ صبح
کحل الجواہری بمن آر اے نسیمِ صبح
زاں خاکِ نیک بخت کہ شد رہ‌گزارِ دوست

پھر جائے گو کہ صفحۂ هستی په خطِ رد
هو جائے شش جہات کی گو باهم ایک حد
بن جائے گو ابد ازل اور یا ازل ابد
گو بادِ فتنه هر دو جہان را بہم زند
ما و چراغِ چشم و رہِ انتظارِ دوست

گو اک جہان هم سے قلق رهوے بغض ناک
یا دشنۂ حسد سے کریں سینه اپنا چاک
اپنا ھے یه عقیده به قولِ جنابِ پاک
دشمن به قصدِ حافظ اگر دم زند چه باک
منت خداے را که نیم شرم سارِ دوست

تخمیس غزل بیدل میرزا عبدالقادر مغفور دهلوی

عدو کا خط تیرے پاس آیا که خوب تو نے همیں جلایا
غرض که جو جو تھا اس میں لکھا وہ تجھ کو سب من و عن سنایا
مگر تأسف ھے مجھ کو اس کا که تجھ کو شمشاد قد ھے لکھا
اگر به گلشن ز ناز گردد قدِ بلندِ تو جلوه فرما
زهی[1] که از سرو موجِ خجلت شود نمایان چو مے ز مینا

---

۱ - اصل متن (ص ۲۰۰) میں 'زهے سرو موجِ خجلت شود نمایاں چو مے ز مینا' مصرع ساقطالوزن تھا ، تصحیح قیاسی کی گئی - (مرتب)

شباب اک نقدِ زندگی ہے ، نہ کھو تو واعظ نہ ہو تو ناداں
سنیں گے افسانہ تیرا آکر ، تو پہلے مے خانے چل مری جاں
کدھر ہے جنت، کہاں ہیں نہریں، کدھر ہیں حوریں کہاں ہیں غلماں
ز صفحۂ رازِ ایں دبستاں ز نسخۂ رنگِ ایں گلستاں
نہ گشت نقشِ دگر نمایاں ، مگر غبارے بہ بالِ عنقا

نہ جاں کے دینے کی ہم کو مہلت، نہ دم کے لینے کی جاں کو فرصت
نہ ضبط کرنے کی دم کو قدرت، نہ نالہ کرنے کی دل کو جرأت
یہ کیا کیا اے طلسمِ آفت ، نقاب کے ساتھ اٹھی قیامت
بہ اولیں جلوہ ات ز دل ہا ، رمید صبر و گداخت طاقت
کجاست آئینہ تا نگیرد غبارِ حیرت دریں تماشا

فروغِ بزمِ ہوس نہیں ہے تو کیوں ہے غیروں سے گرم جوشی
کدھر گئی شرم اور حیا وہ ، کہاں سے آئی شراب نوشی
چھپے گا کب تک یہ رنگِ صحبت، رہے گی کب تک یہ پردہ پوشی
بہ دورِ پیمانۂ نگاہت ، اگر زند لافِ می فروشی
نفس برنگ کمند پیچد ز موجِ مے در گلوے مینا

جو اب کے وقتِ بہار آئے ، تو یہ ہے دل میں خدا بھی چاہے
کہ بزمِ سرخوش کو جمع کرکے اڑائیں باہم شراب گاہے
کہ پیرِ صہبا فروش تجھ کو ہزار قسموں سے یوں سراہے
ز چشمِ مستِ تو گر بیابد قبولِ کیفیتِ نگاہے
شود[1] ز مستی بروے آئینہ نقشِ جوہر چو موجِ صہبا

۱۔ اصل متن (ص ۲۰۰) میں 'شد' ہے ، مصرع ناموزوں ہے ۔
'شود' تصحیح قیاسی ہے ۔ (مرتب)

چھکا دے[1] ساقی نظر سے اتنا کہ اپنی ہستی ہو وقفِ مستی
نہ دیر دیکھوں نہ کعبہ جھانکوں نہ جاؤں جنگل نہ آؤں بستی
دماغ یاں پر کسے ہے اتنا کہ کیجے فکرِ بلند و پستی
نخواند طفلِ جنوں مزاجم خطے ز پست و بلندِ ہستی
شوم فلاطونِ ملکِ دانش اگر شناسم سر از کفِ ما

نہ اٹھ تو اے آہ دل سے میرے فغانِ پیہم نہ کر بلندی
جو دل سے اٹھے تو لب سے پھرجا یہ ہے یہاں کی نظر بلندی
زمیں پہ گرتا ہے مثلِ شبنم ، کسی کو ہووے اگر بلندی
بہ ہیچ صورت ز دورِ گردوں ، نصیبِ ما نیست سر بلندی
ز بعدِ مردن مگر نسیمے غبارِ مارا برد ببالا

خفا ہیں ہم زندگی سے اپنی بلا سے جاں نیشِ غم سے چھیدی
سوائے مدفن نہیں ہے مامن زمینِ فکر آج تک کریدی
الٰہی کیوں یہ کدورتیں دیں ہمیں کو مٹی نہ تونے دے دی
نہ شامِ مارا سحر امیدے نہ صبحِ مارا دمِ سپیدی
چو حاصلِ ماست نو اُمیدی غبارِ دنیا بہ فرقِ عقبا

---

۱ - اصل متن (ص ۲۰۰) میں 'جھکا دے' ہے - 'چھکا دے' تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

یہ ہم نے مانا نہیں ٹھہرتا تو ایک جا جوں صدائے قلقل
کبھی ہے دل میں کبھی جگر میں کہ تجھ کو کہیے ترا تأمل
مگر یہ دل میں سمجھ تو اپنے یہ شوخی کیوں کر نہیں تجاہل
رمیدی از دیدہ بے تامل گذشتی آخر بہ صد تغافل
اگر نہ دیدی تپیدنِ دل شنیدنی داشت نالۂ ما

غبار پہنچے گا عرش تک پھر نہ کھینچ دامن کو تا عطارد
خرام تیرا ہمارا نالہ اخیر رکھتے ہیں ایک ہی حد
ہماری تیری ہے ایک حالت کرے گا کیا اس میں کوئی رد کد
بہر کجا ناز سر برآرد نیاز ہم پائے کم ندارد
تو و خرامے و صد تغافل من و نگاہے و صد تمنا

ہوئے نمایاں ہیں صاف رخ سے غبار دل میں جو اس کے کچھ تھے
قلق صفائی وہ اٹھ گئی اب جو اس کے ملنے کی آس رکھتے
ضرور بگڑے گی شکلِ مطلب یہ جا کے مقطع اسے سنا دے
ز غنچۂ کس دمید **بیدل** بہار خطِ نظر فریبے
بہ معجزِ حسن گشت آخر رگِ زمرد ز لعل پیدا

تخمیس اُردو غزل میرزا رفیع متخلص بہ سودا

پھرتا ہوں کوچے کوچے شب و روز ہر کہیں
وقتِ مسا کہیں ہوں تو وقتِ سحر کہیں
کچھ بھی لگے سراغ ادھر یا اُدھر کہیں
جی تک تو دے کے لوں کہ جو ہو کارگر کہیں
اے آہ! کیا کروں نہیں بکتا اثر کہیں

خندیدگیِ گل نہیں کچھ چشمِ انتظار
موجِ ہوائے سرد نہیں آہِ سوگوار
بے اعتبار چیز کا کیا کیجے اعتبار
ساقی ہے اک تبسّمِ گل فرصتِ بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

وعدوں کی تیرے راہ دکھاتی ہے مجھ کو نیند
حسرت بڑھا بڑھا کے ستاتی ہے مجھ کو نیند
ہر جنبشِ نفس سے جگاتی ہے مجھ کو نیند
ہوتی نہیں ہے صبح ، نہ آتی ہے مجھ کو نیند
جس کو پکارتا ہوں سو کہتا ہے مر کہیں

مژگاں کا چھیڑنا ہے رگِ ابر کھولنا
آیا مژہ تک اشک کہ طوفان آ گیا
کیا تجھ سے ہوں حریف ترا کیا مقابلا
پھرنے لگے تو جوں کفِ دریا بہا بہا
دامن اگر نچوڑیے اے ابرِ تر کہیں

گاہے ہوا ہوں خاک کدورت بڑھا بڑھا
گہ شعلہ تھا میں آہ سے جی کو جلا جلا
پر سدِّ رہ ہوا نہ کوئی جوشِ گریہ کا
خوں ناب یوں کبھی نہ مری چشم سے تھا[1]
اٹکا نہ جب تک ان کے لختِ جگر کہیں

---

۱ - 'تھنبھا' املا اصل متن (ص ۲۰۲) میں - (مرتب)

قطعه

حالِ **قلق** تو کیا کہوں افشا ہے چار سو
دیوانگی کے جوش میں پھرتا ہے کو بہ کو
پر دوستو اک اور سنو طرفہ گفتگو
سودا سے رات میں کہا مغموم کیوں ہے تو؟
اٹکا ہے ان دنوں میں ترا دل مگر کہیں

کہتے تو کہہ چکا پہ ہوا سخت منفعل
یعنی خموش ہوگیا سن کر وہ مضمحل
جب پایا میری وضع سے مجھ کو بھی کچھ خجل
کہنے لگا یہ سچ ہے پر اب کے اگر یہ دل
بچ جائے تو نہ دوں کبھی بارِ دگر کہیں

ہاں غیر کے بھروسے پہ کیا لطفِ زندگی
گو دشمن آسماں ہو زمیں ہووے مدّعی
پر رابطہ کسی سے نہ پیدا کروں کبھی
پوچھا جو میں سبب تو کہا کیا نہیں سنی؟
قاصد مرے کے حال کی تو نے خبر کہیں

یہ داستاں دراز ہے کیا شرح کیجیے
پر منہ پہ آئی رک نہیں سکتی ہے بن کہے
کچھ جی ہی جی میں اٹھے جو یک بار ولولے
نامہ لکھا تھا یار کو میں یہ سمجھ کہ ہے
عالم میں رسمِ نامہ و پیغام ہر کہیں

گو دل میں شوق شوق، کو تھا میرا اختیار
مجبور شوق بھی نہ سہی خود تھا بے قرار
کیا بے قرار جان ھی تھی لب پہ بار بار
لیکن سوائے بندگی و عجز و انکسار
نقطہ ھو اُس میں حرفِ تمنا سے گر کہیں

یا طرزِ مدّعا کی کہیں پائی جائے تہ
یا شکوۂ ستم کی کوئی ھو کشادہ رہ
یا نامہ بر سے رازِ درونی دیا ھو کہہ
واں لا کے مارئیے مجھے گردن کہ جس جگہ
پانی کے قطرے کا بھی نہ ھووے اثر کہیں

ثابت کرو اب اس میں جو میرا قصور ھو
ساری خدائی جانتی ھے سارے حال کو
گر موردِ خطا ھوں تو کی جائے گفتگو
ورنہ خدا کے واسطے انصاف تو کرو
آتا ھے ایلچی پہ زوال اس قدر کہیں

یعنی اک آشنا یہ خبر لایا پُر شغف
تھی خلق جمع تیغ بہ کف تھا وہ منحرف
دیکھا جو میں نے جھک کے یکایک میانِ صف
نامہ اُڑا پھرے ھے گلے میں کسی طرف
سر سے جدا پڑا ھے سرِ نامہ بر کہیں

جس جا ہو دل نثار وہاں کا ہو یہ سلوک
اس سے جو داد خواہ نہ جاں کا ہو یہ سلوک
واں کیا مرے کوئی کہ جہاں کا ہو یہ سلوک
وقتے کہ دلبرانِ جہاں کا ہو یہ سلوک
پھر دل کو دوں کہو تو کس امید پر کہیں

ایضاً

یہ بھی گزار دیں گے جب اتنی گزر گئی
گریے سے اور فغاں سے تو چشمِ اثر گئی
یعنی یہ کہتے کہتے نسیمِ سحر گئی
کچھ تو ہی اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی
شبنم بھی اس چمن سے صبا چشم تر گئی

فرہاد بےستوں[1] پہ ہے اور قیس راغ میں
آتش بھری ہے سنگ میں صہبا ایاغ میں
اور میں ہوں اپنی جائے پہ تیرے سراغ میں
دیوانہ کون گل ہے ترا جس کو باغ میں
زنجیر کرنے موجِ نسیمِ سحر گئی

ساقی ترا بیان یہ سنتا ہوں کب سے میں
جوں سرو اس چمن میں کشیدہ ہوں سب سے میں
یعنی کہ دور دور ہوں ہر بےادب سے میں
نظارہ باز بزمِ بتاں کا ہوں جب سے میں
تو ہی نظر پڑا مری جیدھر نظر گئی

۱- کوہ بے ستوں ۔

گر چل دیا ہے شیخ سوے کعبہ صبح گاہ
صوفی بھی دوڑا جاتا ہے اب سمتِ خانقاہ
اور پیرِ مغ نے پکڑی ہے بیت الصنم کی راہ
کیجو اثر قبول کہ تجھ تک ہماری آہ
سینے سے ارمغاں لیے لختِ جگر گئی

تو اور دستِ غیر تھا اور چاندنی کی سیر
میں اور حسرتوں کا بڑھانا تھا ٹھیر ٹھیر
کچھ ہوسکے جو تجھ سے تو کر ذکرِ عیشِ غیر
مت پوچھ یہ کہ رات کٹی کیوں کہ مجھ بغیر
اس گفتگو سے فائدہ پیارے، گزر گئی

اک عمر شوقِ ضبط میں سینہ کیا تھا خوں
ٹھانی تھی یہ کہ اُس سے نہ بولوں نہ کچھ کہوں
جس پر نظر کے ملتے ہی نکلا زباں سے یوں
خانہ خراب دل تو ہے لیکن میں کیا کہوں
جیسی بلاے جان ہے یہ آنکھ گھر گئی

قطعہ

تھا ذکر کیا لکھا تھا کچھ اُس کینہ کار نے
پڑھتے ہی جان دی قلقِ دل فگار نے
اس بات پر یہ نقل کی اک رازدار نے
سودا لکھا **فغاں** کو یہ خط اُس کے یار نے
جس وقت اُس کے حال کی اُس کو خبر گئی

وہ دعوہاے ضبط کدھر ہوگئے ہوا
اب جو نفس نفس میں ہے صد قافلہ بکا
اور نامہ‌بر سے کہہ دیا یہ کہیو برملا
سن اے فغاں جہان میں عاشق جو ہوگیا
معشوق سے اسی روش اُس کی گزرگئی

تمئیز کچھ تو عشق و ہوس میں ہو پردہ‌در
تا بوالہوس کو ہو نہ دلیری رہے خطر
اور عذر گر قبول نہیں تو یہ غور کر
شیریں نے جور کب نہ کیا کوہ‌کن کے سر
مجنوں پہ کیا جفا تھی کہ لیلیٰ نہ کرگئی

لاکھوں غریب ہو کے موے ہیں وطن کے بیچ
سو خوش قماش چاک گریباں کفن کے بیچ
کیا آج تو گرفتہ نیا ہے محن کے بیچ
کل ہی پڑی سسکتی تھی بلبل چمن کے بیچ
ذرہ نہ اُس کے حال پہ گل کی نظرگئی

مرجائیں گر حزیں شبِ ہجراں بھلے کہ صبح
منزل شناسِ راہ شباشب چلے کہ صبح
بیدارِ شامِ غم ہی نہ آنکھیں ملے کہ صبح
پروانے رات شمع سے اتنے جلے کہ صبح
خاکستر اُن کی لے کے صبا دوش پرگئی

ایضاً

یاں تن پرست کو ہے سدا خونِ دل سے کبج[1]
اور سر پہ کج کلاہ کے مانندِ قیس جبج[2]
مرنے کو شورشوں سے نہ کچھ زشت اور قبح
پروانے رات شمع سے اتنے جلے کہ صبح
خاکستر اُن کی لے کے صبا دوش پرگئی

ہر وضع سے اب آبروے ناز تو گئی
واں وہ زباں درازیاں اور یاں یہ خامشی
پر تجھ سے پوچھتا ہوں میں یہ سن تو مدعی
میں تازہ کیا کیا ہے کہ بدنامی کو مری
آوازِ آہ و نالہ تری در بدر گئی

کب آہ لب سے آٹھی کہ بجلی نہ گر پڑی
نالہ کیا ہے کب کہ قیامت نہ آگئی
عاشق کا مشغلہ یہ سہی پر کبھی کبھی
حرمت رکھی نہ رعد کی فریاد نے تری
رونے سے تیرے آبروے ابرِ تر گئی

مجنوں نے کب کری تھی قبا اپنے بر کی سرخ
اور کوہ‌کن کی بھی تھی دستار سر کی سرخ
ہاں سب نے جوشِ گریہ سے کچھ چشم تر کی سرخ
لوہو سے تیرے سر کے ہے دیوار گھر کی سرخ
آنکھوں سے موجِ خوں تری بیرونِ در گئی

---

۱ - غذا و پنیر ۔ ۲ - آشیانۂ زنبور ۔

ہے صلح اُس سے ہے جو حریفِ نبردِ ہجر
اور صاف دل ہین اُس سے جو ہو جائے گردِ ہجر
عاشق اُسی کا نام ہے جو ہوئے مردِ ہجر
دل کو ترے نہیں ہے اگر تابِ دردِ ہجر
تو کارِ عشق سے تو مری جان کرگئی

یا ربط پیدا اور سے کر خانماں خراب
تا میں رہا ہوں رنج سے اور تو ہو کامیاب
تو مدعیِ عاشقی اور میں سہوں عذاب
القصہ اُس نے خط کو یہ پڑھ کر لکھا جواب
تیرے ہی دل کی مہر نہ جانوں کدھر گئی

سو سو جفا مین ایک بھی پاتا نہیں وفا
ہر ہر نظر کے ساتھ ستم کا ہے مشورا
جو اہلِ دل سے دور ہے وہ کب ہے دل ربا
شیریں کی ایک مین نہ کہوں ورنہ بارہا
مجنوں جدھر تھا وادی مین لیلٰی اُدھر گئی

دل دادہ دلبروں سے ہیں کس شان مین جدا
برہم دلی یہاں ہے وہاں زلف ہے بلا
جتنے ہین دور دور ، ہین اُتنے ہی ایک جا
یاں تک تو گھٹ مین لیلٰی کی مجنوں سما گیا
آنِ بکے اُس اتحاد سے باہم گزر گئی

لوہو کے گھونٹ یاں پیے گر واں ہوا ہے مصد[1]
یاں پیچ پر تھا پیچ جو واں طرے کو تھا عصد[2]
دونوں کا ایک حال تھا دونوں کا ایک قصد
جاری ہوا ہے خون رگِ مجنوں سے وقت فصد
لیلٰی کے پوست مال اگر نیشتر گئی

یاں تک ہوا ہوں ضبطِ کدورت سے خاک خاک
پر سہم میری گرد سے ہے دامنِ ہلاک
جس پر تنک مزاجی سے ہوں تیری سہم ناک
ظالم کروڑ گل کا گریباں ہوا ہے چاک
اک عندلیب گر اجل اپنی سے مرگئی

سرگرمِ نالہ کب ہوئے بلبل ہیں ہو کے جمع
گلشن میں برگ ، برگ سے گل بن گیا نہ شمع
ہے سینہ سینہ سوزِ محبت کا لمع لمع
پروانہ کون سا نہ جلا شام کو کہ شمع
روتی ہوئی نہ بزم سے وقتِ سحر گئی

---

۱ - آب دھن فروبردن - مکیدن (شمس اللغات ج ۲ ص ۲۴۵) -
۲ - پیچش -

کب تک کہوں کہ شمع سے پروانہ گر جلا
کیوں روتے روتے شمع نے خود کو بہا دیا
کیوں گل نے نالہ سن کے گریباں کو شق کیا
اس گفتگو سے قطعِ نظر اس سے تجھ کو کیا
مجھ سے جفاے ہجر کی طاقت اگر گئی

میرے ھی جوشِ دل نے مری چشمِ تر کی سرخ
میری ھی سرزنی سے ھے دستار سر کی سرخ
میرے ھی گریے سے ھے قبا میرے بر کی سرخ
لوھو سے سر کے ھے مری دیوار گھر کی سرخ
میری ھی موجِ خوں مرے بیرونِ در گئی

میں آپ رویا مجھ کو ھی رونے کا شوق تھا
ڈوبا یہ کچھ کہ نام و نشاں تک ڈبو دیا
سب قصہ بر طرف ھے ولے تجھ کو اس سے کیا
شکوہ کرے ھے تو جو مرے اشکِ سرخ کا
تیری کب آستیں مرے لوھو سے بھر گئی

تخمیس مصرع خواجہ احسن اللہ بیان[1] دھلوی

دل ھی کی دل میں آرزو اپنی تو ھم نشیں رھی
وصل میں بھی مہاجرت اُس کی مرے قریں رھی
چہرے سے رنگ اُڑ گیا سینے میں جاں حزیں رھی
زلف میں اُس کی خم رھا ماتھے پہ اُس کے چیں رھی
شام سے لے کے صبح تک وہ ھی نہیں نہیں رھی

---

۱ - وفات ۱۲۱۳ھ - (مرتب)

آتے ہی خود بہ خود غضب حشر خرام ہوگیا
حرفِ صلائے جامِ مے تلخ پیام ہو گیا
ایک بھی جرعے کا اُسے پینا حرام ہوگیا
ناز ہی یہ سہی مگر اپنا تو کام ہوگیا
شام سے لے کے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

رات تصور آپ کا یاں جو کرم فزا ہوا
لطف سے دل ربا ہوا مہر سے آشنا ہوا
شکر کیا کہ مفت میں حاصلِ مدعا ہوا
یاد سے شوخیوں کی پر تازہ غضب بپا ہوا
شام سے لے کے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

بزم میں غیر کی اگر تو نہ گیا تو کیا ہوا
سینہ بہ سینہ لب بہ لب مجھ سے رہا تو کیا ہوا
بوس و کنار الغرض خوب ہوا تو کیا ہوا
میری بغل میں رات بھر سویا کیا تو کیا ہوا
شام سے لے کے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

اُس کی ادا و ناز کو پوچھ نہ مجھ سے ہم نشیں
بارہ برس کے بعد وہ رات جو رہ گئے یہیں
غیر کے انتظار کا تذکرہ آ گیا کہیں
میں نے کہا کہ خیر ہے سوئیے گا بھی یا نہیں
شام سے لے کے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

رنجِ شبِ وصال کو کس سے کہوں میں جا کے آہ
ظلمِ فلک کا کیا بیاں کوئی نہیں مرا گواہ
منت آہ و نالہ نے شوخ کے کی نہ دل میں راہ
پاؤں پہ اُس کے سر رہا تو بھی نہ کی ذرا نگاہ
شام سے لے کے صبح تک وہ ھی نہیں نہیں رھی

سوز برائے ساز ھے لیک اخیر بھی کہیں
ضبط ضرور راز ھے لیک اخیر بھی کہیں
ظلم بے نیاز ھے لیک اخیر بھی کہیں
ضد بھی اگرچہ ناز ھے لیک اخیر بھی کہیں
شام سے لے کے صبح تک وہ ھی نہیں نہیں رھی

شب کی کہوں میں بات کیا مرثیہ ھے جگر گداز
میرا بیان مختصر قصۂ درد و غم دراز
پھرتے عدو کو دیکھ کر پھر گئی چشمِ نیم باز
ترچھی ھوئی وہ یک بیک ٹھہری ھوئی نگاہِ ناز
شام سے لے کے صبح تک وہ ھی نہیں نہیں رھی

میری بغل بدلتے ھی ایسا وہ کچھ بدل گیا
ھاتھ سے غیر کی طرح صاف مرے نکل گیا
شانے سے زلف ھٹ گئی چھاتی سے ھاتھ ٹل گیا
مثلِ نگہ اُچٹ گیا اشک صفت مچل گیا
شام سے لے کے صبح تک وہ ھی نہیں نہیں رھی

وصل کی شب کا اتفاق پوچھ نہ مجھ سے ہم نشیں
اپنے ہی ہاتھ سے ہوا زہرِ ہلاہل انگبیں
ساغرِ بادۂ خوشاب دینے لگا جو مہ جبیں
میں نے کہا ابھی نہیں سن کے ہوا یہ خشمگیں
شام سے لے کے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

اپنی ہی عقل کی کمی اپنے ہی فہم کا قصور
پاسِ لحاظ و شرم کو اس کے سمجھ لیا جو دور
ہم ہی تھے تازہ کامیاب ہم ہی کو کچھ نہ تھا شعور
خود ہی کو حوصلہ نہ تھا اس کو پڑی تھی کیا ضرور
شام سے لے کر صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

اُس کا بناؤ میں بگاڑ پی کے شراب ہائے ہائے
میرا تڑپ تڑپ کے وہ ہونا کباب ہائے ہائے
اُٹھتے ہی اُٹھتے رہ گئی رخ سے نقاب ہائے ہائے
میری سماجت آہ آہ اُس کا عتاب ہائے ہائے
شام سے لے کے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

پوچھتے کیا ہو دوستو رنجِ نشاط کا بیاں
گوشے میں ہم نے کی بسر سایے سے بھی نہاں نہاں
پاس کا لیٹنا ستم برقع کا کھولنا گراں
شرم نے قہر کر دیا کہہ نہ سکا جو لب سے ہاں
شام سے لے کے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

نفرت و ربط ھائے ھائے شوق و درنگ حیف حیف
جوشش و ضبط ھائے ھائے جی کی اُمنگ حیف حیف
نوش میں نیش ھائے ھائے چرخ دو رنگ حیف حیف
عیش میں طیش ھائے ھائے وصل میں خنگ حیف حیف
شام سے لے کے صبح تک وہ ھی نہیں نہیں رھی

جب کہ قلق سپہر کا مکر کوئی چلا نہیں
وعدے پہ آیا اپنے یار گو کہ یقین تھا نہیں
کہنے لگا وہ چھیڑ سے کہیے وفا ھے یا نہیں
شامت بخت دیکھنا منہ سے نکل گیا نہیں
شام سے لے کے صبح تک وہ ھی نہین نہیں رھی

حصۂ مسدسات

مسدس ترجیع بند

امتحانِ دلِ بےتاب ہے گر جور سہی
نہ سہی عہد ترا غیر ہی کا دور سہی
پر ذرا صبر و تحمل پہ مرے غور سہی
اس پہ بھی قطعِ محبت ہے تو فی الفور سہی
تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

رات دن سوزِ جدائی سے کہاں تک میں جلوں
جو چلن تیرا ہے لازم ہے وہی چال چلوں
داد شیوہ کی ترے دوں کہ ترا نام نہ لوں
نہ ملے کوئی جہاں تجھ سے میں واں بھی نہ ملوں
تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

صبر کب تک دلِ صد داغ دکھاؤں سب کو
تا کجا تابِ تحمل کہ رلاؤں سب کو
جو کہ سننے کی نہیں بات سناؤں سب کو
جی میں ہے میں بھی وفا اپنی جتاؤں سب کو
تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

ہر گھڑی جھگڑا ہے ہر لحظہ پریشانی ہے
روز کا رنج و محن دشمنیِ جانی ہے
چینِ پیشانی سے کیا دیکھیے پیش آنی ہے
بعد ازیں ہم نے بھی اب دل میں یہی ٹھانی ہے
تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

دل کو لازم ہے کہ اور آفتِ جاں پر اب آئے
اور جلانے کو ترے تیرا ھی ہم بزم بنائے
اپنے جلوے کو دکھا کر یہ ترا رنگ اڑائے
تو مجھے دیکھ کے آئینۂ حیراں بن جائے
تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

یاد رکھ یاد کہ عاشق کا ہے ملنا مشکل
ٹوٹ کر جڑتا ہے دل دادۂ شیدا مشکل
چھٹ کے ملتا ہے غرض چاہنے والا مشکل
تجھ کو دشوار نہیں کچھ تو ہمیں کیا مشکل

تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

چھوڑ کر عشق ہوس کار بنیں گے ہم بھی
حسنِ[1] تازہ کے خریدار بنیں گے ہم بھی
افسرِ فرقۂ اغیار بنیں گے ہم بھی
عاقبت تجھ سے ہی عیار بنیں گے ہم بھی

تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

تو سنے یا نہ سنے جی کی سناتا ہے کون
جگر افگار سہی تجھ کو دکھاتا ہے کون
آشنائی تھی کبھی تجھ سے بتاتا ہے کون
منفعل روٹھ کے مت ہو کہ مناتا ہے کون

تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

---

۱ - اصل متن (ص ۲۱۳) میں 'جنبش' غلط ہے ، حسن ، تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

کیا وفا اپنے کیے کی یہ سزا پائی ھے
کیا جفا شامتِ تقدیر کی رسوائی ھے
زندگی بس کی نہیں موت کو موت آئی ھے
ٹھہر جا ٹھہر کہ ھم نے بھی یہ ٹھہرائی ھے
تو ھے ھرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

تجھ کو ھم بزمیِ اغیار ھی مرغوب سہی
جو نہ طالب ھو کبھی تیرا وہ مطلوب سہی
دل‌بری حسن میں ھر وجہ سے معیوب سہی
بے وفائی مری جاں ، خوب سہی خوب سہی
تو ھے ھر جائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

عاقبت فتنۂ محشر کو اٹھایا تونے
کس و ناکس کو اشاروں پہ لگایا تونے
جو نہ دیکھا تھا تماشا وہ دکھایا تونے
بے وفا ھم کو بھی افسوس بنایا تونے
تو ھے ھر جائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

کیا کہوں دل کی حقیقت کہ تماشا ہے دل
کون سی بات پہ کیا جانیے آتا ہے دل
غور کر خوب ، نہ میرا ہے نہ تیرا ہے دل
دل ستانی ہو جسے یاد ، اُسی کا ہے دل
تو ہے ہر جائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

خوفِ اغیار سے ہرگز نہیں ڈرنے والے
سیکڑوں صدمے ہیں الفت میں گزرنے والے
موت ہو اپنی کہیں ، ہم تو ہیں مرنے والے
جیتے جی منت بے جا نہیں کرنے والے
تو ہے ہر جائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

کون کافر ہے مسلمان ، مگر یہ سن لے
کچھ نہیں شرط کہ ہندو ہی رہیں تیرے لیے
رشتۂ جاں نہیں زنار کہ توڑے نہ بنے
دیر اگر چھوٹ گیا ، خیر کلیسا تو ہے
تو ہے ہر جائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

برھمن زاد ھی سے کچھ نہیں اُلفت ھم کو
ٹیکا ماتھے کا نہیں قشقے کی رغبت ھم کو
فرض ھو کیوں کہ مسلماں سے نفرت ھم کو
کفر و اسلام سے یکساں ھے محبت ھم کو
تو ھے ھر جائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

در بہ در تیرے لیے مفت میں رسوا ھے **قلق**
لو گیا گزرا عبث ھاتھ سے جاتا ھے **قلق**
کیا نہیں موت بھی جو تجھ پہ ھی مرتا ھے **قلق**
ھو کوئی غیر کا ھمدم تو ھمیں کیا ھے **قلق**
تو ھے ھر جائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

ایضاً

دور ھیں راہِ درِ یار بتانے والے
حسرتِ دید کو چشمک سے دکھانے والے
باختہ رنگ سے جلوے کے جتانے والے
ھم نہیں پردۂ اسرار اٹھانے والے
آپ ھم کوچۂ جاناں کے ھیں جانے والے
خضر کیا جانے، غریب اگلے زمانے والے

وھی تو ھے کہ جہاں رنج و بلا رھتے ھیں
وھی تو ھے کہ جہاں جور و جفا رھتے ھیں
وھی تو ھے کہ جہاں نالہ سرا رھتے ھیں
وھی تو ھے کہ جہاں راز کشا رھتے ھیں
آپ ھم کوچۂ جاناں کے ھیں جانے والے
خضر کیا جانے ، غریب اگلے زمانے والے

شور فریاد سے ھے دور ، مگر دل کے پاس
دو جہاں کا ھمیں پڑتا ھے سفر دل کے پاس
پشت اُمید کی جانب ھے تو سر دل کے پاس
خود کو کھویا ھے تو پایا ھمیں گھر دل کے پاس
آپ ھم کوچۂ جاناں کے ھیں جانے والے
خضر کیا جانے ، غریب اگلے زمانے والے

جس کو ھو دیکھنا وہ سر سے جدا ھو کے چلے
ننگِ ھم راھیِ رھبر سے جدا ھو کے چلے
اضطرابِ دلِ مضطر سے جدا ھو کے چلے
ھر ظن و وھم سے ، یاور سے ، جدا ھو کے چلے
آپ ھم کوچۂ جاناں کے ھیں جانے والے
خضر کیا جانے ، غریب اگلے زمانے والے

جا بہ جا حسرت و ارمان پڑے رہتے ہیں
ہر طرف تہمت و بہتان پڑے رہتے ہیں
فتنے ہر گوشے میں بے جان پڑے رہتے ہیں
جتنے ہمسائے ہیں سنسان پڑے رہتے ہیں
آپ ہم کوچۂ جاناں کے ہیں جانے والے
خضر کیا جانے، غریب اگلے زمانے والے

رازداروں کے لیے دار کھڑی رہتی ہے
پائے آزاد[1] میں زنجیر پڑی رہتی ہے
آشتی خوئے محبت سے لڑی رہتی ہے
ہوسِ ہمدمیِ یار چھڑی رہتی ہے
آپ ہم کوچۂ جاناں کے ہیں جانے والے
خضر کیا جانے، غریب اگلے زمانے والے

ہند گو واں کا سگِ راندۂ غوغا افزا
چشم بددور پھٹکنے نہیں پاتی ہے حیا
اسی بازار میں ہے، عصمتِ یوسف رسوا
ٹھہر اے یادِ خودی، شوقِ فنا آگے آ
آپ ہم کوچۂ جاناں کے ہیں جانے والے
خضر کیا جانے، غریب اگلے زمانے والے

۱- اصل متن 'آزا'۔

رفرف و عرش تو یہ ہیں نہیں نایاب سراغ
دور کتنے ہیں[1] کہ جس پر ہے فرشتوں کو دماغ
بس کہ ہے حوصلۂ دید عزادار فراغ
لیے پھرتا ہے وہاں ہاتھ میں خورشید چراغ
آپ ہم کوچۂ جاناں کے ہیں جانے والے
خضر کیا جانے، غریب اگلے زمانے والے

دور جو عقل و خرد سے ہو[2] نہیں اصلا دور
کھل گیا جس کا پتا پاس ہے، پھر وہ کیا دور
متہم قرب ہے اس راہ میں اور رسوا دور
ہے سراغ اس کا تعین سے بہت ہی سا دور
آپ ہم کوچۂ جاناں کے ہیں جانے والے
خضر کیا جانے، غریب اگلے زمانے والے

۱- اصل متن (صفحہ ۲۱۷) میں 'ہے' معنی کو الجھاتا ہے - 'ہیں' تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

۲ - مصرع اصل متن ساقط الوزن ہے ؛ 'ہو' کا اضافہ تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

واں فقیروں کی صفِ[1] نعل میں دولت والے
اور رقیبوں کے حوالے ہیں محبت والے
ننگ و ناموس سے بیزار ہیں غیرت والے
پردے کے نام سے چھپتے ہیں حمیت والے
آپ ہم کوچۂ جاناں کے ہیں جانے والے
خضر کیا جانے، غریب اگلے زمانے والے

بدگمانی یہ نہیں خوب کہ غمّاز ہیں ہم
پاسبانِ طلب و حافظِ ہر راز ہیں ہم
بے نشانی ہے نشاں واقفِ انداز ہیں ہم
دیکھنے والے قلق کے ہیں نظر باز ہیں ہم
آپ ہم کوچۂ جاناں کے ہیں جانے والے
خضر کیا جانے، غریب اگلے زمانے والے

۱۔ اصل متن (ص ۲۱۷) میں 'صفت نعل' بے معنی ہے 'صف نعل' بہ‌معنی صف نعال تصحیح قیاسی ہے۔ فرہنگ عمید ص ۱۱۹۰ میں نعال جمع نعل و نیز بہ معنی درگہ و پائیں مجلس اور 'نعل' - کفش پا افزار و قطعۂ آہن کہ بہ‌پاشنۂ کفش پا بہ‌سم ستور می زنند نعال جمع ہے 'صف نعال' مستعمل ہے مؤلف نوراللغات (ج ۳ ض ۳۳۲) لکھتے ہیں وہ جگہ جہاں کفش آثار کے داخل مجلس ہوتے ہیں -

صبا : خدا نے دی ہے عجب منزلت محبت کو
یہ بزم وہ ہے کہ جس میں صف نعال نہیں

ایضاً

قاصد مجھے غیرت بھی ہے اور غیض و غضب بھی
اور شاق ہے اب روز کے صدموں کا تعب بھی
کچھ اُس کے نہ آنے کا ہو معلوم سبب بھی
گر عذر بھی معقول ہو کہہ دیجیو جب بھی
اے وعدہ فراموش تو مت آئیو اب بھی
جس طرح کٹا روز گذر جائے گی شب بھی

جب تو ہی نہیں پاس تو کیا خوف قضا سے
جو تجھ سے تھی اُمید وہ چاہیں گے خدا سے
اب ہم کو شکایت نہ وفا سے نہ جفا سے
ہو شامِ جدائی و دم نزع بلا سے
اے وعدہ فراموش تو مت آئیو اب بھی
جس طرح کٹا روز گذر جائے گی شب بھی

اے نامہ بر اب اُس کی تو باتوں میں نہ آنا
آتا ہے ہمیں اور جگہ دل کا لگانا
آئے تو وہ آجائے، نہ آئے تو نہ لانا
اس پر بھی مکدر ہو تو یہ صاف سنانا
اے وعدہ فراموش تو مت آئیو اب بھی
جس طرح کٹا روز گذر جائے گی شب بھی

ہر لحظے کی رنجش ہے تو ہر دم کی لڑائی
چھٹ کر بھی تو ممکن نہیں اُمیدِ صفائی
تو آکہ نہ آ، آگئی اپنی تو بن آئی
ہو وصل کا ارماں جو نہ ہو موت جدائی
اے وعدہ فراموش تو مت آئیو اب بھی
جس طرح کٹا روز گذر جائے گی شب بھی

دیکھیں تری رہ تا بہ کجا ، دیر اور ایسی
سب پھر گئے تو ھی نہ پھرا ، دیر اور ایسی
حیلہ کوئی باقی نہ رہا ، دیر اور ایسی
لے روزِ قیامت بھی ڈھلا ، دیر اور ایسی
اے وعدہ فراموش تو مت آئیو اب بھی
جس طرح کٹا روز گذر جائے گی شب بھی

بس خونِ جگر پیتا ہوں کھاتا ہوں ہوا حیف
جس کا یہ سہارا ہو وہ تا چند جیا حیف
خورشید بھی گریے سے مرے ڈوب گیا حیف
پر بزم سے اغیار کی تو بھی نہ اُٹھا حیف
اے وعدہ فراموش تو مت آئیو اب بھی
جس طرح کٹا روز گذر جائے گی شب بھی

دیکھو قلق اس راہ میں وہ چال نہ کر جائے
یہ شوخیاں موجود نہ باہر ہو نہ گھر جائے
منت کے لیے عمر ہے اک شب تو گزر جائے
سنتے ہی وہ آتا ہے یہ پیغام اگر جائے
اے وعدہ فراموش تو مت آئیو اب بھی
جس طرح کٹا روز گزر جائے گی شب بھی

ترجیع بند

ساقی یہ شراب ہے کہ خوں ہے
جو صبح فراق لالہ گوں ہے
غیرت سے اڑا نہ رنگ اس کا
تو دیکھ کہ جام سر نگوں ہے

ساغر کو گرا، سنبھال مجھ کو
بدمستیِ حالتِ زبوں ہے
رکھ آگ میں چادرِ گل آگیں
لرزاں ہوں کہ سرد اندروں ہے

پھینک عطر کو گردِ عود پر تو
نفحات سے تیزیِ جنوں ہے
گل شمع و چراغ کو کہیں کر
جو داغ ہے ملتہب فزوں ہے

کر شیر و شراب ایک جا تو
دل پھٹنے کا غیر سے شگوں ہے

اب کس کا حجاب رہ گیا ہے
در بستہ تو ہی بتا کہ کیوں ہے
مطرب کو خموش ساز کر بند
دستک بھی تو غیر کا فسوں ہے
ہر نغمہ ہے پُر فغانِ فریاد
ہر دم یہ صدائے ارغنوں ہے
رفتی بہ شب و سحر نہ کردی
روزِ سیہم نظر نہ کردی

کس طرح سے چھوڑ دوں وفا کو
ظالم نے ستایا ہے جفا کو
تو بھی تو نہیں کچھ اپنے بس میں
کیا چین ہو جانِ مبتلا کو
ہر دم ہے خیالِ خلوت غیر
کیا کیجیے جانِ آشنا کو
جائے بھی کہیں یہ شوقِ دیدار
آنکھوں سے لگاؤں نقشِ پا کو
تیرا نہیں رشک مجھ کو منظور
چھوڑوں میں امیدِ نا سزا کو
کچھ یاد بھی ہے تجھے ہماری
یا بھول گئے سبھی خدا کو

همسایۂ و هم محلہ ہے پر
پیٹو مرے بخت نا رسا کو
کس واسطے نکلے گھر سے باہر
تو سمجھے ہے طرزِ مدعا کو
تو بچ کے چلا گیا کدھر کو
پامال کیا نہ رہ نما کو
تھی لب پہ جفا کے توبہ توبہ
چھوڑا ہے تڑپتے یوں حیا کو
رفتی بہ شب و سحر نہ کردی
روزِ سیہم نظر نہ کردی

دیوانہ ہوں نازِ مدعی کا
میرا ہی نیاز ہے کبھی کا
جب تو ہی نہ اپنی شکل دیکھے
کیا اس میں فتور آرسی کا
کیا شہرتِ قیس و کوہ کن ہے
کیا عام مرض ہے عاشقی کا
اغیار کا شکوہ کون سنتا
تو یار ہوا ہے کب کسی کا
کیا لب پہ شبِ فراق جاں آئے
پتلا ہوں میں گردِ نا رسی کا
مجھ کو نہیں اعتبار دل ہو
تجھ کو نہیں اختیار جی کا

کیا اُس کی گلی میں جی لگے گا
کوئی نہیں دوست اجنبی کا

اے پردہ نشیں تجھے بھی دیکھا
تو بھی نہیں اپنی بےکسی کا

منہ دیکھتا رہ گیا کھڑا میں
چلتا نہیں بس کچھ آدمی کا

رفتی بہ شب و سحر نہ کردی
روزِ سیہم نظر نہ کردی

یک لخت پھرا زمانہ ہے ہے
فریاد بنی ترانہ ہے ہے

اس طرح چلا ہے تو کہ گویا
اغیار کا تھا بہانہ ہے ہے

تیرا آہنگ لاابالی
پامالیِ جاودانہ ہے ہے

بیزاریِ یارِ غارِ بیمار
بیماریِ عاشقانہ ہے ہے

افسونِ خموشیِ جدائی
افسانۂ خانہ خانہ ہے ہے

چلتی ہے زباں مری کہ خنجر
خوبی ہے تری فسانہ ہے ہے

گیسوے درازِ لیلِ فرقت
ہو ذکرِ مژہ سے شانہ ہے ہے

ہر تیرِ خطائے آسماں کا
تنہا میں ہی مگر نشانہ ہے ہے

مانا کہ خفا گیا ہے مجھ سے
رکنے پہ بھی تو رکا نہ ہے ہے

تیزیِ غضب نے بھی نہ پھیرا
کیا جلد ہوا روانہ ہے ہے

رفتی بہ شب و سحر نہ کردی
روزِ سیہم نظر نہ کردی

دل پر اگر اختیار ہوتا
تو ہی مرا جاں نثار ہوتا

کیا زندگیِ فراق کٹتی
مرنا جو نہ بار بار ہوتا

اے کاش میں غیر ہوکے مرتا
در پر تو ترے مزار ہوتا

کیا وصل میں تجھ کو منہ دکھاتے
گر ہجر میں غمگسار ہوتا

جس قصے کو مختصر میں کرتا
طولِ شبِ انتظار ہوتا

کب تک میں سلگ سلگ کے جیتا
کیوں نالۂ شعلہ بار ہوتا

کیا میری زبان کٹ نہ جاتی
کس طرح ستم شعار ہوتا

گر غیر بھی غم‌گسار ہوتے
ناصح ہی نہ دوست دار ہوتا

ق

یہ بختِ سیاہ جب جلو میں
اے فتنۂ روزگار ہوتا
پردہ نہ ترا کبھی بھی اُٹھتا
ہرچند کہ تار تار ہوتا

رفتی بہ شب و سحر نہ کردی
روزِ سیہم نظر نہ کردی

بیزاریِ صبر و نازِ غم حیف
عجزِ اُلفت زبوں شیم حیف
فریاد ، نہ کشتنِ ستم گر
بیداد دریغیِ ستم حیف
دشوار ، وفائے عہدِ فرقت
طولِ شبِ غم کی ، عمرِ کم، حیف
اغیار کا جور و جبر ہے ہے
احباب کا لطف ، اور کرم حیف
تلخیِ فراق کے سوا اب
معدوم ہوا جہاں میں سم حیف
اُمید کا خون دیکھنے کو
ارماں کا ہجوم ہے بہم حیف
افسوس ، افسوس ، ہائے صد ہائے
ہیہات ہیہات دم بہ دم حیف

تو جائے اور آئے تیرا ارماں
آٹھا نہ متابعت کو غم حیف

ہندو سے یہ برھمن کو نفرت
کس رام سے کر گیا ھے رم حیف

کیوں کر نہ گرا سپہرِ بے مہر
جس وقت آٹھا ترا قدم حیف

رفتی بہ شب و سحر نہ کردی
روزِ سیہم نظر نہ کردی

بے رحم کے خاک کام کا دل
یہ چھیڑ کہ تو ھی لے گیا دل

آٹھتے آٹھتے ھی محشر آیا
لیجو ، لیجو ، وہ لے چلا دل

کیا غارتِ عشق کا ٹھکانا
گویا کہ بغل ھی مین نہ تھا دل

د زدیدہ نظر کی "ھف' نگاھین
نظروں نظروں میں آڑ گیا دل

۱۔ 'ھف نظر' : (عو) ایک کلمہ ھے جو چشم بد کا اثر دفع کرنے کے لیے ماشاء اللہ کی جگہ مستعمل ھے ۔ غالب ۔ ؎

صبر آزما وہ آن کی نگاھیں کہ ھف نظر
طاقت ربا وہ آن کے اشارے کہ ھائے ھائے

[نوراللغات ج ۴ ۔ ص ۸۶۵]

قلق نے اس شعر میں آسی معنی میں 'ھف نگاھیں' استعمال کیا ھے ۔ (مرتب)

اللہ رے ہجوم نامرادی
ہل چل میں کہیں وہیں رہا دل

ہے حجت قرب حشر ظاہر
نظروں سے تری مرا گرا دل

ہے رشک شریک بے وفائی
جی بیٹھتے ہی مرا اٹھا دل

ہے آتش ہجر غیر کیا سرد
پتھر ہے اسی طرح ترا دل

بیداد سے بھی کیا کنارہ
فریاد نے خون کر دیا دل

یک لخت کیے جگر کے ٹکڑے
یک بارگی اس طرح پھٹا دل

رفتی بہ شب و سحر نہ کردی
روز سیہم نظر نہ کردی

گر عشق خود آشنا نہ ہوتا
کوئی کبھی بے وفا نہ ہوتا

گر حسن سے انتقام لیتے
تو بھی یہ ستم روا نہ ہوتا

احباب کو متہم نہ کرتے
اغیار پہ فیصلا نہ ہوتا

گر ناخن غیر تو بھی بنتا
عقدہ مرے دل کا وا نہ ہوتا

کیوں آئینہ ہم تجھے دکھاتے
گر شوق ہی خود نما نہ ہوتا

سنتا جو ذرا بھی جی کی کوئی
نالہ ہدفِ صدا نہ ہوتا

تجھ سا جو میں اور ڈھونڈ لاتا
مجھ سا کوئی دوسرا نہ ہوتا

ہوتا جو نگاہوں ہی میں ہوتا
کیا کیا ارماں ہیں کیا نہ ہوتا

گو وقتِ وداع حشر آتا
یہ حال زمانے کا نہ ہوتا

اس طرح سے آسماں نہ پھٹتا
ایسا کبھی حادثہ نہ ہوتا

رفتی بہ شب و سحر نہ کردی
روزِ سیہم نظر نہ کردی

ہر دم کی عیاں ہے تیغ رانی
کٹتی نہیں تو بھی زندگانی

اب ولولۂ جگر کہاں وہ
ہے آتشِ سینہ پسانی پسانی

یخ بستہ ہے شعلۂ درونی
برفاب ہے آتشِ نہانی

میں کہتے ہی کہتے ہو گیا چپ
تھی زیست مگر کوئی کہانی

ہر بات کا ذکر اور مزے ہائے
اللہ رے لذتِ زبانی
خم پشت نکیونکہ ہو کہ ہے اب
پہلو زنِ زورِ ناتوانی

ہر دانۂ سبحہ سنگِ ورزش
وہ بھی بہ ہزار جاں فشانی
دم ایسا چرایا اب قویٰ نے
ہر لحظہ ہے اپنی پاسبانی

اک درد ہے اب شریکِ بستر
اک داغ رہا ہے یارِ جانی
کیا تیز قدم ہے عمرِ ناکام
کیا جلد گئی تو اے جوانی
رفتی بہ شب و سحر نہ کردی
روزِ سیہم نظر نہ کردی

دم سے پہلے ہوا ہوا تو
اے جانِ جفا ہے بےوفا تو
میں تیری طرح تجھے بتاؤں
جب میری طرح ہو مبتلا تو

کیا دیر و حرم کا ایک جھگڑا
بدنام ہوا ہے جا بہ جا تو
اے خضر بری ہے رہنمائی
اک میں ہوں خراب دوسرا تو

بوسے کی ہوس عدو کی ہوگی
مت نام کسی کا لب پہ لا تو
غیروں سے خوش اختلاط ہیں وہ
آتی ہے کہاں کو اے حیا تو

آتی نہیں گر تجھے محبت
صورت مری آکے دیکھ جا تو
ہم لیں گے خدا سے تیرا بدلہ
کیا دے گا کسی کا خوں بہا تو

تنہائی کا ہے خیال تیری
فرقت کو نہ ساتھ لے گیا تو
آنکھوں آنکھوں میں اڑ گیا بس
کیا خوابِ شبِ فراق تھا تو
رفتی بہ شب و سحر نہ کردی
روزِ سیہم نظر نہ کردی

گر نالۂ دل نشیں اب آتا
بے تاب وہ مہ جبیں اب آتا
رکھتا وہ اگر قدم اٹھا کر
یہ چرخ تہِ زمیں اب آتا

فردا کا بھی وعدہ ہے پسِ پشت
آتا تو ہمیں یقیں اب آتا
یہ صبحِ ازل وہ شام محشر
ملتا جو وہ نازنیں اب آتا

کیسوے سیاہ ہے پریشاں
دن دیکھتے شانہ ہیں اب آتا

وہ دامنِ ناز و خاکِ عاشق
اے لختِ جگر گزیں اب آتا

محشر میں چھپانے والے لاکھوں
بے باک ، ستم کمیں ، اب آتا

وعدے پہ نہ آیا خیر گزری
پھر تجھ پہ دلِ حزیں اب آتا

کچھ جور و ستم نہ پھیرنا تھا
کیوں دشمنِ داد و دیں اب آتا

اس طرح گیا ہے چھوڑ کر تو
غصے کے سوا نہیں اب آتا

رفتی بہ شب و سحر نہ کردی
روزِ سیہم نظر نہ کردی

قطعہ

جو تیرا قدیم آشنا تھا
سرِ حلقۂ اُلفت و وفا تھا

ہر تیر قضا کا تھا نشانہ
ہر ناز و ادا کا دل ربا تھا

یہ چشم اُسی کے سمت وا تھی
دیدار اُسی کو دیکھنا تھا

یہ عشوہ اُسی کا عشوہ خوردہ
یہ غمزہ اُسی کا غم زدہ تھا

یہ ناز آسی کا ناز بردار
ابرو کا وهی گره کشا تها

یہ شوق آسی کا آرزومند
یہ ذوق آسی کا قند خا تها

یہ شانہ آسی کا تکیۂ سر
یہ سینہ آسی کا آئنہ تها

یہ مہر آسی کی دست بستہ
یہ قہر آسی کا ولولہ تها

یہ جلوه آسی کا کشتۂ حسن
یہ حسن آسی کا مبتلا تها

آخر دیکھا آسی قلق کو
نگراں ، نگراں ، یہ کہہ رہا تها

رفتی بہ شب و سحر نہ کردی
روزِ سیہم نظر نہ کردی

متفرقات

روزے کہ شود 'اذالسماء انفطرت'
آں دم کہ شود 'اذالنجوم انکدرت'
من دستِ ترا بگیرم اندر عرفات
گویم 'صنما ہای ذنبِ قتلت'

وله

ھاں ھاں چو قلق کیستِ کہ مقہور بود
کیں شوخ بہ جاہِ غیر مغرور بود
دستے ست تہی دستیِ سارا دریاب
ساغر کہ ز مے تہی ست پر نور بود

مطلع

کب آئے جان میں جان اور[1] وہ کب قدم ڈالے
کہ مر رہے ھیں قیامت کے آسرے والے

۱- بر وزن فع -

واسوخت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مثمن ۱۳۰۰ھ

★ اے خانہ برانداز حیا ، ہم سے پھرا تو
پامال کیا نقش وفا ، خوب گیا تو
کس خاطر ناکام کا آرام ہوا تو؟
رنگ رخ مایوس کی مانند اُڑا تو
کیا کام ہے دل میں اگر آنکھوں سے چھپا تو
ارماں کی طرح پھر کے نہ آنے سے بھی جا تو
جیتے ہیں تو مقدور تلک صبر کریں گے
مجبور سہی ، دل پہ مگر جبر کریں گے

★ بھر آئے ہے جی دیکھ کے خالی پڑے گھر ہائے
آرائش خلوت کدہ ہے خار نظر ہائے
چیں چادر بستر کی بنی زخم جگر ہائے
چنگاریوں کی شکل پڑے ہیں گل تر ہائے
وہ سکتۂ دیوار ، وہ خمیازۂ در ہائے
میدان ہی میدان ہے ، جاؤں میں کدھر ہائے
کیوں خانہ خرابی کو مری یاد کرو گے
کیا غیر کا گھر ہے جسے آباد کرو گے

★ اس گھر سے غم و رنج نکلتا ، نہ کہ تو حیف
جاتا سوے دشمن ترا چرچا ، نہ کہ تو حیف
چھپتا تو مرا داغِ تمنا ، نہ کہ تو حیف
چھٹتا تو ترا شکوۂ بے جا ، نہ کہ تو حیف
ہاتھوں سے گریبان نکلتا ، نہ کہ تو حیف
جاتا تو ترے ہجر کا کھٹکا ، نہ کہ تو حیف
حسرت ہو تری کاش جس آغوش میں تو ہو
اور چشمِ تماشا میں ترا جلوہ لہو ہو

★ جاں لب پہ ہے اور جاں میں تری یاد نہاں ہے
ہاتھوں میں ہے دل ، دل میں ترا داغِ تپاں ہے
ارماں ہے یہ تیرا ہی جو سینے میں فغاں ہے
تیرا ہی بیاں ہے جو گرہ بندِ زباں ہے
آنکھوں میں ہے دل ، آنکھ سوے دل نگراں ہے
اے خانہ برانداز! کہاں ہے ، تو کہاں ہے؟
خلوت میں کیا کاھے کو تہہ جلوہ‌گری کو
پردے میں چھپایا ہے غضب ، پردہ دری کو

★ کس سے کہوں جو صدمے اٹھائے سو اٹھائے
جو سانگ مقدر نے دکھائے سو دکھائے
اغیار پئے صلح بلائے سو بلائے
احبابِ جگر بند تڑائے سو تڑائے
انداز بگڑنے کے بنائے سو بنائے
کچھ اب بھی سمجھ لوگ ہنسائے سو ہنسائے
ہے لختِ جگر آنکھ میں ، فریاد ہے لب پر
محشر کو لیے نالۂ ناشاد ہے لب پر

★ یہ جانا کہ جانا تھا ، پر اس طرح سے جاتے
اغیار نے جو کان بھرے تھے ، وہ سناتے
اس رونے پہ پہلے ہی سے طوفان اٹھاتے
ناکردہ گنہ تہمتِ بیہودہ لگاتے
کوئی تو بگڑنے کے لیے بات بناتے
جانے پہ تمھارے مجھے ارماں تو نہ آتے
تھم تھم کے مری جان نکلتے جو نکلتے
رہ رہ کے سب ارمان نکلتے جو نکلتے

★ ہاں مدِ نظر خانہ خرابی ہی اگر تھی
تو چاکِ سراپردہ سے کیوں یہ نظر تھی
"دردا" کہ تجھے دردِ جدائی کی خبر تھی
یعنی کہ شتابیِ وصال آٹھ پہر تھی
کیا آگے یہی طور ، یہی شکلِ گذر تھی؟
کیا یہ ہی قیامت مرے سر شام و سحر تھی؟
بن ٹھن کے تو ہر رات کو اغیار کے گھر ہو
اور صبح بگڑ جانے کی تہمت مرے سر ہو؟

★ تا چند تپش خاطرِ افسردہ میں ہے ہے
ہوں داغ نہ کیوں سینۂ آزردہ میں ہے ہے
فریاد سے محشر ہے دلِ مردہ میں ہے ہے
ہے حشر بپا جانِ ستم بردہ میں ہے ہے
ناسور پڑا دیدۂ خوں خوردہ میں ہے ہے
صدمہ سا ہے صدمہ دلِ آزردہ میں ہے ہے
رخصت ہے بس اب آپ کو ، جاؤ ، کہیں جاؤ
ہو پردہ نشیں ، منہ نہ دکھاؤ ، کہیں جاؤ

★ کیا فیصلے کو منتِ اغیار کریں گے
مرجائیں گے پر یہ تو نہ زنہار کریں گے
اب صبر ہی ہم عاقبتِ کار کریں گے
دو نیم نہ دل ہوگا نہ ہم چار کریں گے
دل غیر ہے کیا ، ہم جو اسے خوار کریں گے
جاں اپنی ہے کیوں کر اسے بیزار کریں گے
پھرتے ہی تری آنکھ کے دل اپنا پھرا ہے
اب آئیں ترے گھر پہ تو مرجانے کی جا ہے

★ اب پیچ و خمِ طرۂ طرار سے کیا کام
اب کشمکشِ رنجش و آزار سے کیا کام
اب سرزنیِ کاکلِ خم دار سے کیا کام
اب ساحریِ غمزۂ عیّار سے کیا کام
اب جاں دہیِ نرگسِ بیمار سے کیا کام
اب سادگیِ عشوۂ پرکار سے کیا کام
جس دل پہ تمھیں ناز تھا اب دل وہ کہاں ہے
آسان ہے جینا ہمیں مشکل وہ کہاں ہے

★ تجھ سے نہ یہ امید تھی اے مایۂ راحت
غیروں کو بٹھا کر تو اٹھائے گا قیامت
بیہودہ تھے سب سابقے ، کیا حرف و حکایت
بن آئی مرے کوئی تو کیا تجھ سے شکایت
کیا تجھ کو غرض ہے کہ اٹھائے تو ندامت
کیا صلح سے اب بحث لڑے غیر کی قسمت
ہرگز نہ یقیں ہوگا ترے دل میں مقرر
مر کر بھی جو دکھلائیں کہ یوں مرتے ہیں تجھ پر

★ بے حسنِ وفا ہم نہیں ، سم کھائیے کیوں کر
دامانِ جفا چھوڑ کے مرجائیے کیوں کر
اک مردنِ دشوار سے گھبرائیے کیوں کر
میدانِ محبت سے نکل جائیے کیوں کر
گمراہ ، تجھے راہ پہ اب لائیے کیوں کر
تجھ کو ترے اقرار سے شرمائیے کیوں کر
بے دید ، مروت تری آنکھوں میں نہیں ہے
خجلت سے عرق چیں ، تری پیشانی پہ چیں ہے

★ ان ٹھوکروں کے کھانے سے کیا مجھ کو پڑا تھا
پامالِ جفا رہنا تقاضائے وفا تھا
یہ وقت ہے کچھ اور ، وہ عالم ہی جدا تھا
کیا جانیے کیا ہو گیا ، کیا جانیے کیا تھا
اب تک تھی حیا ، پردے کو منہ پر نہ دھرا تھا
قابو میں زباں تھی کہ مرا منہ نہ کھلا تھا
آخر لبِ خاموش مرا آبلہ زا ہے
اب دل کے اگر خار نکالوں تو سزا ہے

★ وہ وقت بھی ہے یاد کہ تم سادہ ادا تھے
زلفیں تھیں پریشان ، کھلے بندِ قبا تھے
آئینے سے چھپتے تھے گرفتارِ حیا تھے
وہ سادگیِ لطف کہ خوں ریز جفا تھے
القصہ ہر اک شکل سے صد شکلِ وفا تھے
تم دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگئے کیا تھے
شوخی کا ہر انداز کہو کس نے سکھایا
افسوس بگڑنے کو تمہیں ہم نے بنایا

آنکھوں کو دلِ زار سے خوں ریز تھا کیا کیا
★ بیمار کو بیمار سے پرھیز تھا کیا کیا
ھر حرفِ شکر ریز ، سم آمیز تھا کیا کیا
نظارۂ دزدیدہ حیا خیز تھا کیا کیا
یاں عشق پئے پردہ دری تیز تھا کیا کیا
واں حسن حیا سے ستم انگیز تھا کیا کیا
کچھ بھی نہ سمجھتے تھے کنائے نہ اشارے
منہ دیکھ کے رہ جاتے تھے چپ شرم کے مارے

★ پر جب اثرِ مہر و وفا جوش میں آیا
تم کو بھی اس آسیب نے دیوانہ بنایا
کچھ بن گئے تم ایسے کہ کچھ بھی نہ بن آیا
کھوئے گئے اس غم میں کہ کیوں دل کو گنوایا
جو دل سے اٹھا جوش ، وہ آنکھوں میں سمایا
نظارۂ دزدیدہ نے یہ جلوہ دکھایا
ھر لحظہ نئے پردۂ حائل کے تھے ٹکڑے
اس پردے میں گویا دلِ بسمل کے تھے ٹکڑے

★ آگاہ نہ تھے آپ جو اندازِ جفا سے
گر مجھ کو پشیمان بھی کرتے تو وفا سے
کھا کھا کے قسم مجھ کو یہ دیتے تھے دلاسے
میں تم پہ مروں تم نہ ڈرو حیف خدا سے
گھر والے بگڑ جائیں ، بگڑنے دو بلا سے
کیا تم سے تڑا کر وہ ملائیں گے خدا سے
واللہ کبھی شکلِ جدائی ھی نہ ھوگی
ھوں تم سے جدا ایسی خدائی ھی نہ ھوگی

★ کہتے تھے کوئی راہ بس اب ایسی نکالو
ہیں خار یہ سب اپنے مجھے ان سے چھڑا لو
رسوائی کا کیا پاس ہے باتوں میں نہ ٹالو
دب جائیں گے سب کہنے بھی دو خاک بھی ڈالو
ہر چند سبک ہو گے پہ یہ بار اُٹھا لو
دیکھوں تو ہنر عیب کی مانند چھپا لو
گر پردۂ ناموس ہوا چاک تو ہو جاے
گھر لاکھ کا ہو جاے اگر خاک تو ہو جاے

★ ہر شکوے پہ کہہ اُٹھتے میں قربان تمھارے
میں نکلوں تو نکلیں یہ سب ارمان تمھارے
کب دیکھیے ہم ہوئیں گے مہمان تمھارے
کب کام میں آئے گی مری جان تمھارے
کب سر سے ٹلیں گے مرے احسان تمھارے
ہر آن میں ہوں تابعِ فرمان تمھارے
کیوں میرے نکلنے کی یہ کرتے ہو حیا تم
کم سمجھے ہو ہے ہے مجھے لیلیٰ سے بھی کیا تم

★ آخر تو قدم راہِ محبت میں رکھا ہے
پھر ٹھوکروں کے کھانے* سے انکار بھی کیا ہے
گھر والوں سے کیوں ڈرتے ہو ڈر کس کا پڑا ہے
سامانِ قیامت مری ٹھوکر میں دھرا ہے
ہر فتنۂ محشر مرے دامن سے لگا ہے
چل دینے پہ ہم آئے تو رکنا تمھیں کیا ہے
رکتے ہیں کوئی حشر بھی آ جائے تو آئے
سودا نہ یہ جائے گا جو سر جائے تو جائے

★ آخر کو تجھے جذبۂ دل کھینچ کے لایا
یعنی کہ شبِ ماہ میں تو آپ ہی آیا
ہمراہ حیا سے تھا ڈھٹکتا ہوا سایا
میں نے بھی قدم دیکھ کے آگے کو بڑھایا
فرمایا کہ لو ہم نے تو فتنے کو جگایا
گر اب بھی وہی حیلۂ دوشینہ بنایا
یوسف تو تہِ چاہ گرائے سے گرا ہے
ہم آپ گرے پڑتے ہیں ہم کو تو حیا ہے

★ ناخواندہ کیا عشق نے جب آپ کو مہماں
اور لطف و عنایت نے کیا مجھ کو پشیماں
پھر شرم نے اک گوشے سے پکڑا مرا داماں
اور آگے سے کھینچا مرا غیرت نے گریباں
کچھ بھی نہ بنِ آیا مجھے خود کردہ کا درماں
کرتے ہی بنی خانہ براندازی کا ساماں
اے پردہ برانداز تجھے واں پہ چھپایا
جس جا نہ پڑا تھا کبھی عنقا کا بھی سایا

★ ہوتے ہی سحر جاگ اٹھا فتنۂ شر
در در مرا چرچا تھا حکایت تری گھر گھر
ناتجربہ کاری سے مرا حال تھا ابتر
بیتابیاں لاکھوں تھیں مگر دل ہی کے اندر
جب طاقتِ ہر پائے طلب ہوگئی آخر
جو اٹھا سو دل تھام کے جو بیٹھا سو تھک کر
کہتے تھے کہ اس شوخ کی شوخی سے یقیں ہے
ہر چند وہ اس جائے پہ ہے بھی تو نہیں ہے

★ اطوار سے ڈر کر فلکِ حادثہ زا کے
چوروں کی طرح زیست رہی تم کو چھپا کے
گہ خاک میں سوتے پھرے، تکیوں کو بسا کے
گہ ٹھوکریں کھاتے پھرے ہم شہر میں آ کے
شام آ کے کہیں کی تو سحر کی کہیں جا کے
سو ناز اٹھانے پڑے غماز صبا کے
قائم کیا ہر کوچے میں ہر روز نیا گھر
جوں گردشِ ایام بھٹکتے پھرے در در

★ غمازوں کے ہاتھوں سے غضب ہوش تھے پرّاں
مجموعۂ حیرت تھا مرا حالِ پریشاں
درباں تھی خرابے میں مرے گردشِ دوراں
کیا دخل کہ نیند آنکھ میں آئے سرِ مژگاں
کیا تم تھے بغل میں کہ قضا سر پہ تھی لرزاں
کیا لب تھے لبوں پر کہ لبوں پر تھی مری جاں
اس وصل کے دھوکے نے بڑے رنج دیے ہیں
ہر کھٹکے پہ سو مرتبہ مر مر کے جیے ہیں

★ سر نیچے کو تھا ناصحِ طناز سے ڈر کر
رنگ اڑتا تھا احباب کے انداز سے ڈر کر
ملتا تھا ہر اک تفرقہ پرداز سے ڈر کر
سو ساز رکھے دشمنِ ناساز سے ڈر کر
گوشے ہی میں رہنا پڑا غماز سے ڈر کر
کچھ بات نہ کر سکتا تھا آواز سے ڈر کر
جاں تن سے نکل جاتی تھی، آنے سے صبا کے
رو پڑتا تھا آخر تمھیں چھاتی سے لگا کے

★ یہ چرخ کہ ہے ایک ہی عیاروں کا عیار
لاتا ہے عجب سانگ نئی شکل سے ہر بار
اول ہی سے اس فکر میں تھا عاقبتِ کار
یوسف کی طرح لائیے تجھ کو سرِ بازار
تا اہلِ ہوس میں ہو ترا شہرہ و اظہار
جاں بیچ کے دیکھیں تو بنے کون خریدار
ناگاہ پتا دشمنِ بے باک کو دے کر
پردے سے قیامت کو نکالا ہے کھلے سر

★ آئے جو عدو ، ہوگئے احباب کنارے
اور تم بھی چلے چھوڑ کے چپ شرم کے مارے
نالوں کے سوا کون کہ مرتے کو پکارے
ٹھوکر کے سوا کون کہ گرتے کو سہارے
جاں دینے کے غیرت نے کیے لاکھ اشارے
تنہائی میں شامل نہ ہوئی موت بھی بارے
احساں تھا جو اس وقت کوئی قتل بھی کرتا
قرباں میں جب ہوتا تو اب کاہے کو مرتا

★ جو فتنہ کہ رفتار سے تیری نہ اٹھا تھا
وہ بہرِ عیادت مری بالیں پہ کھڑا تھا
جو اٹھ نہ سکے حادثہ وہ مجھ پہ پڑا تھا
اٹھنا مجھے دشوار زمانے سے ہوا تھا
ماتم میں تھے فریاد و فغاں مرگ فزا تھا
حیرت میں تھی حسرت کہ یہ کیا ہوگیا کیا تھا
ہنگامۂ بیداد تھا وہ جانِ حزیں پر
تھا حشر فلک پر تو قیامت تھی زمیں پر

★ حرماں کا تقاضا کہ بس اب ہاتھ اُٹھاؤ
حسرت کی تمنا کہ ذرا دیکھ تو آؤ
غیرت کا یہ طعنہ کہ چلو منہ نہ دکھاؤ
جرأت کا یہ غصہ کہ ابھی سر کو کٹاؤ
گریے نے کہا بیٹھ کے طوفان اُٹھاؤ
نالوں نے کہا اُٹھ کے فلک کو تو گراؤ
آخر کو یہ ٹھانی کہ بس اب ہیچ ہے جینا
خوں پہلے گرے میرا تو پھر تیرا پسینا

★ نالوں نے اُٹھایا مجھے آغوش میں لے کر
اور خوف و رجا آئے چپ و راست برابر
صد حسرت و ارماں کا پس و پیش تھا لشکر
بے تابیوں نے توسنِ جرأت کیا ٹھوکر
آندھی سا چلا جوش میں بے منتِ یاور
بجلی کی طرح خرمنِ اغیار پہ گر کر
یوں صاف تجھے حلقۂ اعدا سے نکالا
آیا ھی نہ تھا گویا کہ اس چاند پہ ہالا

★ نکلے تھی زمیں پاؤں سے وہ سر پہ ٹھنی تھی
بگڑا ھی تھا نقشہ کہ بری آن بنی تھی
جوں سنگ ہر ایک سانس سرِ سنہ زنی تھی
تھی ریزۂ الماس کہ نیزے کی انی تھی
مایوسیِ و حرماں کی وہ ناوک فگنی تھی
جو دل میں تمنا تھی سو گردن زدنی تھی
بتلائیے اس وقت وہ عیّار کہاں تھے
بازارِ مصیبت میں خریدار کہاں تھے

★ جو مرنے کو تیار تھا ، وہ کون ہے کہیے
جو مرگ خریدار تھا ، وہ کون ہے کہیے
جس پر کہ سدا پیار تھا ، وہ کون ہے کہیے
جو محرمِ اسرار تھا ، وہ کون ہے کہیے
جو مردۂ گفتار تھا ، وہ کون ہے کہیے
جو تشنۂ دیدار تھا ، وہ کون ہے کہیے
دیکھو تو کہ سر مشقِ نظر ہم بھی کبھی تھے
بولو کہ ہر اک بات کے سر ہم بھی کبھی تھے

★ کس شانے پہ یہ زلف پریشاں تھی تمھاری
کس پہلو میں یہ جنبشِ مژگاں تھی تمھاری
کس سینے سے یہ چھاتی تواماں[1] تھی تمھاری
کس ہاتھ میں یہ کاکلِ پیچاں تھی تمھاری
کس لب کے لیے سیب زنخداں تھی تمھاری
کس منہ میں زبانِ شکر افشاں تھی تمھاری
اس نرگسِ بیمار کو پرھیز تھا کن سے
مژگانِ سناں کار کو خوں ریز تھا کن سے

۱- اصل متن (ص ۲۳۹) میں ' تواباں ' بے معنی ہے ؛ ' تواماں' تصحیح قیاسی ہے - تقطیع میں حرف دوم کو متحرک اور حرف سوم کو ساکن پڑھیں گے - ' توام ' کا تثنیہ ' تواماں ' بر وزن 'نوجوان' ہے - مولف نوراللغات لکھتے ہیں، وہ دونوں بچے جو حمل سے ایک ساتھ پیدا ہوں - منیر :

تواماں اللہ نے پیدا کیے عشق اور حسن
عاشق و معشوق سائے کی طرح ہمزاد ہیں

[نور اللغات ج ۲، ص ۳۰۹ - فرہنگ عمید ص ۳۲۴- غیاث اللغات ص ۱۱۰ - شمس اللغات ج ۱ ص ۲۲۷]

★ وہ کون ہے جس کو کہ مناتے ہی بنے تھی
جو بات بگڑتی تھی بناتے ہی بنے تھی
آٹھتے ہی اشاروں سے بٹھاتے ہی بنے تھی
احوالِ دل و دیدہ سناتے ہی بنے تھے
ہر ناز کو سو ناز آٹھاتے ہی بنے تھی
منت سے سے وصل پلاتے ہی بنے تھی
کچھ یاد تو کیجے کہ کسے بھول گئے ہو
بدلے گئے کچھ تم تو اب ایسے کہ نئے ہو

★ بیگانہ ادا ہو گئے کیا کہنے تمہارے
سب تم پہ فدا ہو گئے ، کیا کہنے تمہارے
کیا اہلِ وفا ہوگئے ، کیا کہنے تمہارے
ہر دل کی دوا ہوگئے ، کیا کہنے تمہارے
چل پھر کے ہوا ہوگئے، کیا کہنے تمہارے
اب ہوش ربا ہوگئے ، کیا کہنے تمہارے
پر نیچی نگاہوں کی حیا داریاں وہ ہی
صورت پہ برستی ہوئی ناچاریاں وہ ہی

۔ کیوں خاک آڑاتے ہو کدورت نہیں اچھی
کیوں جی کو جلاتے ہو شرارت نہیں اچھی
کیوں منہ کو بناتے ہو یہ صورت نہیں اچھی
یہ رنجِ عدو ایسی محبت نہیں اچھی
کیا آپ کے اعدا کی طبیعت نہیں اچھی
یہ ناز و نزاکت پہ تو تہمت نہیں اچھی
چل نکلے تم ایسے کہ قدم بھی نہیں آٹھتے
ایسے تو کبھی ضعف میں ہم بھی نہیں آٹھتے

★ تغییر سراپا میں دمِ جلوہ‌گری ہے
آپ اپنی خبر لیویں یہ کیا بے خبری ہے
کیوں زلف میں یہ خود بہ خود آشفتہ سری ہے
کیوں نرگسِ بدمست میں یہ نیند بھری ہے
کیا خواب میں دیکھا کہ پریشان نظری ہے
کیا اوس پڑی رخ پہ جو کافور تری ہے
حیرت زدہ آنکھیں ہیں پُر آشوب ہیں نظریں
کیا بار ہے خاطر پہ کہ دل کوب ہیں نظریں

★ دیکھو تو ذرا نرگسِ مخمور کا عالم
جس طرح دمِ نزع ہو رنجور کا عالم
بگڑا ہے یہ رنگِ رخِ پر نور کا عالم
ہو جیسے کسی مضطرِ معذور کا عالم
ہے نورِ جبیں میں شبِ دیجور کا عالم
نظارہ طلب ہے رخِ مستور کا عالم
نظروں سے جو دیکھو تو میں آنکھوں سے دکھاؤں
تم منہ نہ بناؤ تو میں آئینے کو لاؤں

★ کیسی چمنِ حسن میں یہ خاک اڑائی
کیسی گلِ رخسار پہ اڑتی ہے[1] ہوائی
کیوں کر مہِ پیشانی سے عنقا ہے صفائی
کیوں کر رخِ روشن پہ گھٹا سی امنڈ آئی
کس طرح لبوں میں نہیں وہ روح فزائی
کس طرح وہ اب تم میں نہیں سحر ادائی
کیا پردے ہی پردے میں یہ رخنہ نکل آیا
اے غنچہ دھن منہ جو ذرا سا نکل آیا

---

۱ - اصل متن (ص ۲۴۰) 'ہیں' - (مرتب)

★ یہ قفلِ دہن جو کبھی کھولے بھی نہ کھلتا
اوباشِ ہوس کار نے کیسا کیا جھوٹا
یعنی کہ قسم لے کے مجھے دیتے ہو دھوکا
اس پردے کے قربان کہ کھلی کھیلے سراپا
خلوت میں خدا جانے کہ خاک اُڑتی ہے کیا کیا
خوبی کو پشیماں کیا اور حسن کو رسوا
کیا گرمیِ صحبت ہے کہ جلتی ہے خدائی
کچھ بھی نہ رہی شرم، نقاب ایسی اُٹھائی

★ ہاں رخنے بھی دیواروں میں ہوتے ہیں نہ ایسے
کانٹے بھی بہت راہ میں بوتے ہیں نہ ایسے
ہاں آبرو و آب ڈبوتے ہیں نہ ایسے
ناموس و نکوئی کو بھی کھوتے ہیں نہ ایسے
ہاں نشۂ مستی میں بھی سوتے ہیں نہ ایسے
دیدے کو نمِ شرم سے دھوتے ہیں نہ ایسے
گھٹنے سے جبینِ مہِ انور تو اُٹھاؤ
کیا سر یہ اُٹھایا ہے ذرا سر تو اُٹھاؤ

★ یہ رنج نہیں رازِ محبت کہ چھپاؤں
یہ داغ نہیں نقشِ تمنا کہ مٹاؤں
یہ سوز نہیں آتشِ حسرت کہ بجھاؤں
یہ راز نہیں رمزِ مدارا کہ نہ پاؤں
جو چاک ہے پردہ اُسے کیوں کر نہ اُٹھاؤں
جو شکل ہے ظاہر اُسے کب تک نہ دکھاؤں
اس وجہ سے سر تیرا فرو ہے جو فرو ہے
عطرِ شب دوشیں کی ابھی جیب میں بُو ہے

★ هاں سچ ہے یہ تہمت تمھیں بیہودہ لگائی
کیا لوگ ھیں کمبخت عجب بات بنائی
کیوں کر کہوں ہے آپ کو منظور لڑائی
یعنی کہ ہے اب تک وهی دیدے میں صفائی
سچ کہتے هو تم سچے هو جهوٹی ہے خدائی
کیا دیکھ لیا ہے جو کرے کوئی برائی
غمّازوں کا کیا منہ ہے ذرا بات تو کر لیں
کیا اُن پہ گزرتی ہے وہ اپنی تو خبر لیں
★ کس طرح نہیں پاسِ حیا آپ کو توبہ
کب چین ہے خلوت کے سوا آپ کو توبہ
خودکاموں سے کیا کام پڑا آپ کو توبہ
کیا دیں گے فریب اهلِ دغا آپ کو توبہ
مے نوشی کا الزام بھلا آپ کو توبہ
کہہ سکتا ہے سچ هی کوئی کیا آپ کو توبہ
لوگوں هی کے منہ میں مے گل رنگ کی بو ہے
چولی کا مسک جانا بھی جھوٹوں کا رفو ہے
★ شاعر هوں اگر بات میں میں بات نکالوں
تم کیا هو کہ تصویر کو چاهوں تو بلا لوں
پریوں کے بھی سائے کو میں دیوانہ بنا لوں
هر چند اُڑے کوئی مگر دل کی اُڑا لوں
الزام اگر آپ کو دوں بھی تو میں کیا لوں
خاک آنکھوں میں ان تفرقہ پردازوں کی ڈالوں
چٹکی کا کہاں آپ کے زانو پہ نشاں ہے
اس آئنے میں عکس نگاهوں کا عیاں ہے

★ کیا خوب مجھے کہتے ہو تم کو خفقاں ہے
تعریض سے خالی نہیں جو طرزِ بیاں ہے
تم ہوش میں آؤ تو ذرا دھیان کہاں ہے
چپ رہیے کسی اور کے منہ میں بھی زباں ہے
ہاں میرے ہی رخسارے پہ یہ نیل عیاں ہے
ہاں میرے ہی زانو پہ یہ چٹکی کا نشاں ہے
تم کاہے کو، میں ہی تو کسی بر میں رہا ہوں
مانندِ حنا غیر کے ہاتھوں سے پسا ہوں

★ جاں بازوں سے اس ڈھنگ کی دم بازیاں اللہ
غیروں سے ہر اک بات کی غمازیاں اللہ
اغیار کی خاطر یہ عناں تازیاں اللہ
یہ پردہ بر اندازوں سے ہم رازیاں اللہ
دم بازیاں اللہ سخن سازیاں اللہ
اللہ رے تری شعبدہ پردازیاں اللہ
سن تو کوئی چالاک بھی ہوتا ہے تو ایسا
پردے میں کہیں چاک بھی ہوتا ہے تو ایسا

★ ہے شرط کہ اب میں بھی تری خاک اڑاؤں
ہر دل سے تو اٹھ جائے یہ نظروں سے گراؤں
خونابۂ حسرت کے تجھے رنگ دکھاؤں
ہو زہر بھی میٹھا یہ مزا تجھ کو چکھاؤں
اس آتشِ خاموش سے وہ آگ لگاؤں
ہو شمع بھی انگشت بہ دنداں یہ جلاؤں
ایسے سے ملوں جس سے نہ تو آنکھ ملائے
صورت سے تری اپنی کفِ پا کو چھپائے

★ ہرچند ترے تازہ خریدار بہت ہیں
کیا چاہئیں، اب یار کہ اغیار بہت ہیں
پر یاد رہے میرے بھی غم خوار بہت ہیں
غرفے سے مری تاک میں طرار بہت ہیں
نایاب نہیں ایسے طرح‌دار بہت ہیں
گل‌زارِ وفا میں گلِ بےخار بہت ہیں
کاشانۂ حسرت میں اب اُس شمع کو لاؤں
خاکسترِ پروانہ تجھے جس سے بناؤں

★ وہ اُس کا سراپا ہو کہ دیکھا نہ سنا ہو
کانوں میں جو پڑ جائے تو آنکھوں سے ادا ہو
پوشاک ہو وہ تنگ کہ غنچہ بھی قبا ہو
اور رنگ کا وہ رنگ کہ تو پس کے حنا ہو
آواز میں وہ سحر کہ اعجاز فدا ہو
اور ناز میں وہ شکل کہ معشوق وفا ہو
دامن کے چھڑانے میں بھی پیدا ہو لگاوٹ
بگڑے بھی تو اس طرح کہ گویا ہو[1] بناوٹ

★ وہ سلسلۂ زلف کہ پھنس جائے رہائی
رنجش میں بھی آئینہ جبیں پر ہو صفائی
پیدا گلِ ہرگوش میں سو عطر کشائی
برپا مہِ رخسار سے خورشید زدائی
ابرو کے اشارے پہ چلے ہوش ربائی
اور دامنِ مژگاں میں سما جائے خدائی[2]
آنکھوں میں وہ جادو اگر اعجاز دکھائے
زہرہ کو فلک سے چہِ[3] بابل میں گرائے

۱- اصل متن (ص ۲۴۴) میں 'ہے' ہے - (مرتب)
۲- اصل متن (ص ۲۴۴) میں 'جدائی' ہے - (مرتب)
۳- 'چاہ بابل' (ف) مذکر - کنواں، جس میں ہاروت، ماروت (فرشتے) محبوس ہیں - (نوراللغات ج ۲، ص ۵۰۰)

★ ٹھوکر سے جو کشتوں کو وہ ٹھکرا کے جلائے
اعجازِ مسیحا بھی قدم بوس کو آئے
ہر گام میں موج آبِ بقا کی اُمنڈ آئے
ہو نقشِ کفِ پا پہ خضر سر کو لگائے
سایہ بھی گرے خاک پہ تو حشر اٹھائے
گر حشر اُٹھے، نقشِ کفِ پا سے دبائے
یوں چرخ پہ ہر بات کو ہر دم وو[1] اُتارے
شیشے میں پری کیا کہ مسیحا کو اُتارے

★ خودبینی کا بینی ہی سے نقشہ نظر آوے
اور نرگسِ بیمار عصا رکھ کے بتاوے
وہ منہ ہو کہ قم تک کو ذرا منہ نہ لگاوے
اور دورِ دہاں میمِ عدم میں نہ سماوے
برّاقیِ دنداں سے صفا برق گراوے
اور چاہِ ذقن غرقۂ یوسف کو تراوے
گردن کی بلندی جو صراحی میں جھلک جائے
سرشار سم شرم سے ہو یہ کہ چھلک جائے

★ ہو بحرِ لطافت کا برو دوش کنارا
مژگاں میں تلاطم سا ہو گرتے ہی نظارا
یہ ذبح کرے جنبشِ بازو کا اشارا
وہ قتل، یہ بسمل، اسے زخمی، اسے مارا
انگشتِ حنائی تپشِ دل کا شرارا
اور ساعدِ سیمیں سے ہو سیماب بھی پارا
گر شمع پہ گر جائے کفِ دست کا سایہ
ہو صاعقہ پروانۂ سر مست کا سایہ

۱۔ 'وو' بجائے 'وہ' بہ طور قافیہ استعمال کیا ہے۔ متاخرین شعرائے اردو اسے ترک کر دیا۔ (مرتب)

★ اور سینۂ آئینہ ہو وہ چشمۂ مہتاب
ہوں جس کے حباب آب زنِ دیدۂ پر خواب[1]
وہ صاف شکم ہو کہ نہ ہو قاقم و سنجاب
مخمل بھی جو دیکھے تو یہ چونکے کہ اڑے خواب
ہو ناف میں آبِ گہرِ حسن کا گرداب
اور ساقِ دل افروز ہو اک شمعِ جہاں تاب
القصہ سراپا میں سراپا ہو وہ آفت
ہو بیٹھنے میں فتنہ، تو اٹھنے میں قیامت

★ پھر اس کو فسوں ہائے وفا سارے سکھالوں
پھر شوق نئے ہوں، نئے ارمان نکالوں
وہ سحرِ محبت سے وفادار بنا لوں
پہلو سے نہ اٹھے جو میں تجھ کو بھی بٹھا لوں
ہر حسرتِ خوابیدہ کو خلوت میں جگا لوں
نظروں سے گراؤں تجھے اور دل کو اٹھا لوں
ہر لحظہ نئے وصل کے ساماں نظر آویں
تصویر بھی محفل کی تواماں[1] نظر آویں

۱- اس بند میں 'پر خواب' اور 'خواب' کی تکرار سے ایطائے جلی ظاہر ہوتا ہے۔ مؤلف بحرالفصاحت لکھتے ہیں:

خواجہ نصیر الدین طوسی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی اور مسدس وغیرہ اقسام مسمط میں اگر 'ایطا' واقع ہو تو مضائقہ نہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں:
در قوافی سجع ہا و مثنوی ہا و خانہائے مربع و مسمط استقصائے بسیار نہ کنند و استعمال بعضے عیوب را روا دارند۔
الغرض ایطائے جلی سخت عیب ہے اور ایسے قافیے کا استعمال بہت نا زیبا و قطعاً ناروا ہے (بحرالفصاحت ص ۳۴۷)۔

۱- 'تواماں بر وزن نوجوان؛ یہاں شاعر نے ضرورت شعری سے بر وزنِ 'حکیماں' استعمال کیا ہے۔

★ هو لطف اگر بزم میں تو بھی کہیں آ جائے
اور طرز سے تیرے تجھے کھویا ہوا وہ پائے
پھر برقع کو بےساختہ یوں چہرے سے سرکائے
اڑ جائیں ترے ہوش، تو دل تھام کے رہ جائے
فریاد میں فریاد ہو اور ہائے میں ہو ہائے
جاں، جاں سے نکل جائے اگر ہوش میں ہوش آئے
هو اہلِ تماشا کو بھی حیرت کہ یہ کیا ہے
بد حالِ ستم گر ہے، کہیں روزِ جزا ہے

★ برقع کو اٹھاتے ہی زمانے کو گرا دے
محشر کو اٹھا دے تجھے خاموش بٹھا دے
گرمیِ نظر سے کچھ عجب آگ لگا دے
یہ حسن معِ گرمیِ ہنگامہ جلا دے
حیرت سے مٹا کر تجھے آئینہ بنا دے
جو مجھ پہ گزرتی ہے وہ تجھ میں ہی دکھا دے
وہ جال میں تو آئے کہ رفتار کو بھولے
پھندے میں پھنسے طرّۂ طرار کو بھولے

★ بل نکلے تری زلف کا ہر ایک پئے ہم
ابرو سے نکل کر تری گردن میں پڑے خم
گرمیِ ادا سردیِ خجلت سے بنے نم
اور دردِ مسیحایِ لب کی ہو دوا سم
بن جائے یہ کچھ جی پہ کہ دم دم میں ہو بیدم
ہر غمزے سے فریاد ہو ہر عشوے سے ماتم
چہرے سے ترے رنگ اڑے چاندنا[1] ہو جائے
اندھیر ہو کچھ ایسا کہ تو بزم میں کھو جائے

۱۔ چاندنا ہوجانا ۔ (۴) رونق ہو جانا، زیبائش ہوجانا ۔ جیسے معشوق کے آنے سے چاندنا ہو گیا ۔ (نوراللغات ج ۲، ص ۴۹۸)

★ مستیِ نظرِ دیدۂ مےخوار سے اڑ جائے
موزونیِ خم ابروے خم دار سے اڑ جائے
پرہیزِ حیا نرگسِ بیمار سے اڑ جائے
اندازِ ستم نازِ جفا کار سے اڑ جائے
آزارِ جہاں غمزۂ خوں خوار سے اڑ جائے
ہنگامہ فزائی تری رفتار سے اڑ جائے
تو ایسا پریشانیِ خاطر کے قریں ہو
نظارہ کہیں، دھیان کہیں، ہوش کہیں ہو

★ ہو دل پہ ترا ہاتھ تو دل سینے سے باہر
ارماں ہوں تری جان میں جاں لب پہ ہو مضطر
دامن میں گریں اشک تو ہر اشک ہو اخگر
ہو درد جگر میں تو جگر نوکِ مژہ پر
بے تابی و حیرت سے رہے مضطر و ششدر
کیا میرے کہ ہو اپنے بھی قابو سے تو باہر
بے تابیوں کے عذر کو تو پاس اگر آئے
بس ایک ہی 'چل دور' میں دنیا سے گزر جائے

★ پھر ہنس کے کہے وہ کہ چلو ہوش میں آؤ
ہے تازہ ملاقات ذرا منہ تو دکھاؤ
کیا بات نہ ملنے کی ہے نظریں تو ملاؤ
جاتے ہی رہے ہاتھ سے اتنے بھی نہ جاؤ
بے چین ہو کیوں اتنے، بتاؤ لو بتاؤ
میں دل نہیں عاشق کا مجھے تو نہ اڑاؤ
معشوق ہو فرمائیے عشاق ہیں کتنے
مشتاق ہیں بتلائیے مشتاق ہیں کتنے

★ دل کش ہے ہر انداز ہر اک ناز مقرر
جب سامنے تم آؤ تو قابو کسے دل پر
گیسو میں وہ نکہت کہ صبا چلتی ہے بچ کر
رخ پر وہ صفائی کہ نگہ کھاتی ہے ٹھوکر
تر دامن مژگاں ہی نہیں شرم سے یکسر
گردن کا اٹھانا بھی نزاکت سے ہے دوبھر
بے شبہ ہے دل خلق کا کاکل پہ گراں بار
ہاں چیں بہ جبیں ہے شکن طرۂ طرار

★ منہ پھیر کے گہ کہوے کہ اللہ رے نخوت
کیا ختم ہوئی حسن کی سب تم ہی پہ دولت
کیا لعل جڑے ہیں کہ نہ دیکھے کوئی صورت
بس دیکھ لیا اہل تمنا کی ہے شامت
قربان کیا تھا یہ[۱] سلیقہ یہ طبیعت
اس شکل پہ اور چاہنے والوں سے ہے نفرت
منہ کو تو ذرا ڈالو گریباں میں تم اپنے
بس ڈوب مرو چاہ زنخداں میں تم اپنے

★ گیسوے دراز ایسے کہ طومار قضا کیا
وہ ابروے خوش خم کہ فلک بھی ہے دوتا کیا
سوہان دل و جاں ہے ادا، اس سے سوا کیا
ہے حال برا خلق کا خوبی میں رہا کیا
جس دل میں ہو تم دغدغۂ رنج و بلا کیا
ہو ذکر جہاں آپ کا محشر کا گلا کیا
نظارے سے اس وضع کے خوف آتا ہے، ہے ہے
ہر شخص اسی وجہ سے مر جاتا ہے، ہے ہے

---
۱ - اصل متن (ص ۲۴۸) میں 'بہ' ہے - (مرتب)

★ القصہ وہ لے چٹکیوں پہ چٹکیاں پیہم
تو چیخ اٹھے کہوے خداوندِ دو عالم
فریاد کہ تھے ہم بھی کبھی توش خو و خرم
کیا گردشِ قسمت ہے کہ اب وہ نہ رہے ہم
بے جرمِ محبت بھی کیا چرخ نے ملزم
کیا خاک جیے کوئی مرا ناک مین ہے دم

بس بس مرے اللہ نہ اتنا بھی گھٹوں میں
محفل سے اٹھوں جب کہ جہاں سے ہی اٹھوں میں

★ اے چرخ ستم ہے کہ ستانے کو ہمیں تھے؟
کم بخت ترے ناز اٹھانے کو ہمیں تھے؟
یہ اشک ان آنکھوں سے بہانے کو ہمیں تھے؟
اس آتشِ حسرت کے جلانے کو ہمیں تھے؟
یہ حادثۂ سخت اٹھانے کو ہمیں تھے؟
اس بزم مین کیا جان سے جانے کو ہمیں تھے؟

جو حادثہ اس وقت ہے کس وقت ہوا تھا؟
معشوق بھی عاشق کے لیے کوئی موا تھا؟

★ دیکھوں یہ ترا حال جب اے دشمنِ الفت
یاد آئے جو رسم اگلی تو آ جاے محبت
دے میری وفا مجھ کو ہی خود طعنۂ غیرت
لوں اپنی ہی گردن پہ تری ساری ندامت
مرہم ہو پےِ زخمِ جگر عذرِ مروت
پھر شکوہ نہ رہوے کوئی باقی نہ شکایت

آخر کو گلے سے تجھے ناچار لگا لوں
پھر جان و جگر کو وہی آزار لگالوں

★ اور روبرو بٹھلا کے کہوں دیکھ مری جاں
دشوار تھا جو تم کو وہ مجھ کو ہوا آساں
یعنی جو کہا اُس کا دکھایا وہی ساماں
آخر تو ہوا کیسنا پشیماں سا پشیماں
آوارہ کیا آپ کو اور مجھ کو پریشاں
اب سحر بیانی پہ تو لایا مری ایماں
وہ نظمِ محبت میں دل آویز سبق ہوں
بے چین کیا تجھ کو بھی آخر تو قلق ہوں

مرثیه

مرثیہ

مرثیۂ امام ہمام حسین ابن[1] (علی ابن) ابی طالب علیہ السلام

جب صبح کربلا میں دھم کی ہوئی نمود
جاے شفقِ فلک سے عیاں تھا ھجومِ دود
گرنا نگاہِ نور سے تھا مہر کا صعود
ہر ذرہ خیرگی سے تھا خالِ رخِ ہنود
تھا نور دور مہر سے اور مہر نورِ سے
خود کو ٹٹولتا تھا ہر اک قرب دور سے

ہر ذرے میں تھا نور نہ تھی نور میں ضیا
خورشید مین نہ سایہ نہ سائے مین تھی صفا
لمعاں نہ تھی نظر مین نظر میں نہ تھی فزا
شعلے میں تھی نہ تاب نہ تھی تاب میں جلا
نورِ نگاہ سایۂ مژگاں سے تھا نفور
اور تھا ادھر اشارۂ مژگاں کہ دور دور

---

۱ - اصل متن (ص ۲۵۰) میں 'حسین ابن ابی طالب علیہ السلام' ہے ، سہوِ کتابت معلوم ہوتا ہے - (مرتب)

وحشت کا جوش بادِ سحر میں کہ الاماں
خمارِ دماغ بو گلِ تر مین کہ الاماں
تیغِ بہار شاخِ شجر میں کہ الاماں
بے رونقی یہ نورِ نظر مین کہ الاماں
داغِ نظر تھا نور مکدّر نگاہ مین
تمئیز تھا نہ چرخ کو خورشید و ماہ میں

وقتِ سحر اعادۂ شب کا ہوا گماں
خورشید کے نکلنے پہ چھپنے کا تھا سماں
جو شے نظر کے سامنے آئی سو رائگان
ہر سو عیاں تھی شکلِ تباھی نہاں نہاں
کہتی تھی صبح شام سے پردہ نہ اب اٹھے
اچھا تو ہو جو تفرقۂ روز و شب مٹے

یہ تہلکہ زمانے مین یک بارگی ہوا
پانی میں خاک میں جا کر چھپی صبا
اور کوہ زیرِ کاہ کمین گیر ہو گیا
رفعت نے کی حضیض کے دامن میں اپنی جا
دنیا و دین و عزت و دولت بدل گئے
اپنی جگہ سے، اپنے محل سے نکل گئے

افسوس ہے کہ آج مدینہ ہے غرقِ خوں
نوحِ عرب عجم کا سفینہ ہے غرقِ خوں
خیرالبشر کی جان وہ سینہ ہے غرقِ خوں
اور سعیِ فاطمہ کا پسینہ ہے غرقِ خوں
چرخ و زمیں تمام ہے کون و مکاں اخیر
ہے وقتِ عصر دورۂ آخر زماں اخیر

گرتے ہیں آج مسجدِ اقصیٰ کے اب ستوں
اب ہوتے ہیں ثوابت و سیّارہ سر نگوں
اب آسماں سے اٹھتا ہے تاریک ابرِ خوں
اب ہر ملک کو ہوتا ہے سرسام سے جنوں
نورِ نگاہ اب کوئی دم میں فنا ہوا
اندھیر سے کھیے گی تجلی یہ کیا ہوا

اُمید آج خون ہے اور آرزو تمام
ہر سعی کا اخیر ہے ہر جستجو تمام
دُرِّ صفا و نور کی ہے آبرو تمام
ہر وصف کا ہے خاتمہ ہر گفتگو تمام
ہیہات جانِ ختمِ رسل کا ہے خاتمہ
بے تاب مرتضیٰ ہیں تو بے چین فاطمہ

اب کوئی دم مین خاک کو آتا ہے زلزلہ
محور سے آسماں کو گراتا ہے زلزلہ
ہر فتنۂ قضا کو جگاتا ہے زلزلہ
زیر و زبر جہاں کو سلاتا[1] ہے زلزلہ
ہستی و نیستی کا اک انجام دیکھنا
ہر نقشِ بے ثبات کو ـ. نام دیکھنا

ہل جائے گی زمین، لرز جائے گا فلک
تا حشر اپنی جا پہ نہ پھر آئے گا فلک
مثلِ غبار چرخ سے تھرّائے گا فلک
پہلے ہی اپنے رنگ سے اڑ جائے گا فلک
گرتے فلک کو دیکھ کے ہٹ جاے گی زمیں
مانندِ برگِ کاہ اُلٹ جاے گی زمین

کعبہ سیاہ ہووے گا زمزم کو ہوگا جوش
ہر اک فرشتہ عرش کا ہوگا سیاہ پوش
برپا لحد سے فاطمہ کی ہوگا وہ خروش
سامع کو ہوگا بے خبری کے سوا نہ ہوش
فریادِ اہلِ بیت سے ہو گی قضا خجل
تسلیم سے ہمیشہ رہے گی رضا خجل

۱- اصل متن (ص ۲۵۲) میں 'سولاتا' ہے - (مرتب)

ہنگامہ صد ہزار کا مظلوم پر دریغ
ظلم و ستم کا حادثہ معصوم پر دریغ
سب کی نگاہ کشتنِ مغموم پر دریغ
یہ ظلم اور قبلۂ مخدوم پر دریغ
ہو کیوں نہ حشر سبط پیمبر کا سامنا
یہ سامنا ہے داورِ اکبر کا سامنا

پوری نہ پڑھ چکے تھے نمازِ سحر امام
نقّارہ کوب معرکے میں آئی فوجِ شام
گبر و یہود ، میسرہ و میمنہ تمام
تھی قلب گہ میں ذلت و ناموس و ننگِ نام
چاروں طرف سے حملۂ خرس و کلاب تھا
اور درمیاں میں خیمۂ عالی جناب تھا

دیکھی یورش جو شاہ کے رفقا[1] نے ناگہاں
آ گھیرا خیمہ‌گاہ کو اعدا نے ناگہاں
منہ پھیرا شہ سے اہلِ مدارا نے ناگہاں
گھبرایا اہل بیت کو غوغا نے ناگہاں
اذعان[2] جاں نثاری کو چاہا ہر ایک نے
آقا سے حق گزاری کو چاہا ہر ایک نے

---

۱ - 'رفقا' بر وزن 'فعلا' ہے ؛ قلق نے ضرورت شعری سے حرف دوم (ف) کو ساکن استعمال کیا ہے - دیکھیے فرہنگ عمید (ص ۶۳۴) -
رفقا - ع (بہ ضم را و فتح قاف) دوستاں ، ہمراہاں - جمع رفیق -
۲- اذعان - ع - (بہ کسر ہمزہ) اقرار کردن - گردن نہادن۔ اعتراف - فرمان برداری - [فرہنگ عمید ص ۱۰۳-] (مرتب)

آٹھتے پئے قتال شجاعانِ حیدری
بائیں تھی خیبر افگنی دائیں تھی صفدری
خالی تھی ایک حملے میں جو صف کہ تھی بھری
قدموں پہ تھرتھرا کے گرا چرخِ چنبری
دم توڑتی تھی تیغ تو تھا سہم تیر پر
وہ ہی بچا کہ جس کی قضا ہو گئی سپر

————

صف پر گرائی صف سرِ میداں کھڑے کھڑے
آٹھتا نہنگ و شیر کا غل جس طرف پڑے
آیا نظر پہاڑ ، جدھر کو ذرا اڑے
پر لڑنے سے حصول ، مقدر نہ جب لڑے
آخر تصدقِ سرِ شبیر ہو گئے
اعمال نامے امتِ عاصی کے دھو گئے

————

سب کٹ گئے جو تازہ نہالانِ مصطفیٰ
غم سے خمیدہ پشت ہوا سروِ مرتضیٰ
بھائی موا ، بھتیجا موا اور پسر موا
ہے ہے وہ ایک دل کہ بہتّر کا داغ تھا
یارا رہا نہ شاہ کو صبر و ثبات کا
کہہ کر آٹھے اب آسرا ہے تیری ذات کا

————

اول بہ سوے قبلہ مناجات کی ادا
اے قادرِ ضعیف نواز و ستم گزا
تو ساتھ تھا مسیح کے جب دار پر چڑھا
ہمدرد تھا دو نیم جو زکریا[1] کو کیا
یا رب ترا حسین یہ جس دم شہید ہو
ہو امتحاں قبول کہ تا مجھ کو عید ہو

یہ صبر یہ ثبات مرا حوصلہ نہ تھا
تو ہی تھا اور کوئی سرِ قافلہ نہ تھا
سمجھا کہ تیری رائے پہ یہ فیصلہ نہ تھا
گر دو جہاں ملتے تو میرا صلہ نہ تھا
اب گھر لٹے کہ خیمہ جلے کچھ نہیں گزند
کھلتا ہے کیا گرہ سے مری میں ہوں کاربند

بندے کی کیا مجال ترا فضل چاہیے
ہر دم ہر ایک حال ترا فضل چاہیے
سب پوچ ہے خیال ترا فضل چاہیے
اے ربِ ذوالجلال ترا فضل چاہیے
راضی اگر رضا پہ ہو انسانِ بے پناہ
لنگر بنے جہاز کا طوفانِ بے پناہ

---

۱ - زکریا : بہ فتحتین و کسر راے مہملہ و تشدید یاے تحتانی ، نام نبی علیہ السلام - از مزیل الاغلاط - [غیاث اللغات مع چراغ ہدایت ص ۲۰۹ مطبع خاص منشی گلاب سنگھ لکھنؤ] -

پر عاقبت بشر ہی ہوں ، گردِ ضعیف ہوں
بے یار و بے دیار ، نزار و نحیف ہوں
تیرا ہی ہے یہ نور ، میں خاکِ کثیف ہوں
ایسا نہ ہو کہ لغزشِ پا سے خفیف ہوں
مجھ میں رہا ہے کیا کہ فقط تیرا نام ہے
مرنے سے پہلے ابنِ علی تو تمام ہے

سینہ تو رنجِ عون و محمد سے چھد گیا
عباس کی جدائی سے بازو ہوئے جدا
قاسم نے رن میں گر کے کیا پشت کو دوتا
اکبر نے صاف نورِ بصارت کو کر دیا
اک دل رہا سو اس میں رفیقوں کا شین ہے
زندہ ہے تیرا حکم کہاں اب حسین ہے

عباس جب چلے تو ہوئے مرتضیٰ وداع
شکلِ[1] نبی کے ساتھ ہی تھے مصطفیٰ وداع
قاسم نے رن میں جا کے حسن کو کیا وداع
اصغر کے ساتھ ابنِ علی ہو گیا وداع
گھر لٹ گیا نبی و علی کا تمام ، حیف
مر کر حسین زندہ رہا بہرِ نام ، حیف

۱- مراد علی اکبر جو ہم شکل نبی صلعم تھے - (مرتب)

تو منتقم ہے دار[1] کا تجھ پر مدار ہے
جو کچھ عیاں ہے اُس کا تو ہی راز دار ہے
ہر چند صبر و ضبط کو بندے سے قرار ہے
پر درد مند ہونا بشر کا شعار ہے
غربت زدہ حسین بہت نا صبور ہے
سیدانیوں کو سونپتا ہوں تو غیور ہے

آئے دعا کے بعد بس اب سوئے خیمہ گاہ
برہم حواس و ہوش تو بکھری ہوئی نگاہ
شورِ رضینا[2] لب پہ تو سینے میں جوشِ آہ
آتے ہی دی دعا کہ خدا کی تمھیں پناہ
دیکھو ذرا نہ خیمے سے باہر تم آئیو
اس خانداں کی عصمت و عفت پہ جائیو

نذرِ ازل تھے ہم تو شہادت کے واسطے
یہ سر تھا اختتامِ رسالت کے واسطے
سب کچھ کیا قبول شرافت کے واسطے
تم ہو خصوص عصمت و عفت کے واسطے
یوں ہی قنات خیمے کے در پر اڑی رہے
میداں میں میری نعش اگرچہ پڑی رہے

۱- مراد خیمۂ اہل بیت -
۲- ہم راضی ہیں -

ہے آج خاندانِ رسالت کا کس کو پاس
بے وارثوں کی عزت و حرمت کا کس کو پاس
سب پر دغا ہیں شرم و حمیت کا کس کو پاس
سب بے حیا ہیں سترِ سیادت کا کس کو پاس
عریاں نہ ہونا چادرِ تطہیر[1] سر پہ ہے
تم جاننا کھڑا ہوا شبیر سر پہ ہے

یہ سنتے ہی جو شور اٹھا خیمہ گاہ سے
دل قدسیوں کے ہل گئے بیبوں کی آہ سے
کرسی و عرش آئے نظر بے پناہ سے
شبیر سرنگوں ہوئے ذکرِ تباہ سے
کہتی تھیں شہ سے ہم کو یوں ہی چھوڑ جاؤ گے
سب آسروں کو توڑ کے، منہ موڑ جاؤ گے

۱۔ آیۂ تطہیر: انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا۔

ترجمہ: سوائے اس کے نہیں کہ ارادہ کرتا ہے اللہ تاکہ دور کرے تم سے پلیدی اے اس گھر والو اور پاک کرے تم کو خوب پاک کرنا۔

(سورۂ احزاب۔ آیت ۳۳۔ پارہ ۲۲)

زینب نے کی یہ عرض کہ بھیا بہن کو دیکھ
کوفی[1] کو دیکھ اور ہمارے وطن کو دیکھ
بے وارثی کو اور ہمارے چلن کو دیکھ
غربت کو دیکھ اور مرے رنج و محن کو دیکھ
عابد مریض و بانوے مضطر قریبِ مرگ
جیتی رہی تھی آج کو میں بے نصیبِ مرگ

ٹلتے نہیں ہو ضد سے تو بچوں کو ٹال آؤ
رانڈوں سے گھر بھرا ہے انہیں کو نکال آؤ
صغرا تڑپتی ہوگی اُسے دیکھ بھال آؤ
درگور زندہ مجھ کو مدینے تو ڈال آؤ
اور[2] ہی کہیں چلو جو مدینہ نہیں نصیب
رونا تو ہم کو بیٹھ کے ہوگا کہیں نصیب

بھیا تمام چاہنے والوں کو رو چکی
کم بخت ہوں کہ گود کے پالوں کو رو چکی
سینہ ہے داغ داغ کہ لالوں کو رو چکی
باغِ علی کے سارے نہالوں کو رو چکی
سنسان ہے جہان ، بھرا گھر کیا نثار
قربان جاؤں سب ہی کو تم پر کیا نثار

۱- مراد اهل کوفه اور شام -
۲- اور بر وزن ' فع '

چوڑی(کذا) میں رو رہی ہوں بھرا گھر کدھر گیا
قاسم کہاں گیا علی اکبر کدھر گیا
عباس نوجوان برادر کدھر گیا
رفقاے جاں نثار کا لشکر کدھر گیا
اتنوں کا داغ کم نہیں رونے کے واسطے
طوفاں سے سوا ہے ڈبونے کے واسطے

تم بھی چلے تو آئی قیامت ہوئے اسیر
سیدانیوں کی ہوئے گی کیا کیا نہ دار و گیر
اب تک تو کچھ تھی آبروے عزتِ امیر
پھر تو نظر میں سب ہی کی ہو جائیں گے حقیر
لاکھوں طرح کے صدمے اور عابد کی ایک جان
اجڑوں کو کیوں اجاڑے ہے بھیا خدا کو مان

بانو نے دست بستہ یہ کی شہ سے التماس
ہے عرض گر قبول ہو یا شاہِ حق شناس
ہوں غیر کفو کس کو تمھارے سوا ہے پاس
ہے میری زندگی کا فقط آپ پر اساس
کیجے دعا کہ ہو مرا قصہ ابھی تمام
وارث بغیر زندگی عورت کی ہے حرام

فرمائیے کہ کون مرا بعد آپ کے
میں اور ھج ۔ نج و بلا بعد آپ کے
جینے کا کے ۔ ھے مزا بعد آپ کے
ے بھی جو قضا بعد آپ کے
مر جاؤں کاش صدقۂ ابن رسول میں
ڈھک جائے میرا پردہ[1] طفیلِ بتول میں

بولی رباب کون سی کل اب بناؤں میں
کنبہ ھو ساتھ اور مدینے کو جاؤں میں
چھپ جائے میری شکل جو تم کو نہ پاؤں میں
بختاوری نصیب کی کیا منہ دکھاؤں میں
کیا چھوڑنے کو لائے تھے ایسے جو چھٹ چلے
قربان یہ گھڑی کہ سب ارمان لٹ چلے

اب سب کا پردہ پوش دکھاؤ تو کون ھے
لے جائے جو ھمیں آسے لاؤ تو کون ھے
اپنا سوا تمھارے بلاؤ تو کون ھے
مل کے ساتھ میری بتاؤ تو کون ھے
شہ نے کہا کہ جسم کا تھا کربلا مقام
اب سر رھے گا ساتھ انے کے تا بہ شام

---

۱ ۔ پردہ کے بعد لفظ 'میرا' اصل متن (ص ۲۵۸) میں زائد تھا ، حذف کر دیا گیا ۔ (مرتب)

آئی سکینہ اتنے میں حضرت کے روبرو
رخصت کی حیص و بیص کی سن سن کے گفتگو
نم ناک چشم ہو کے لگی کہنے نیک خو
ابا جی تم کو جانے نہیں دیں گے ہم کبھو
عموں کی طرح تم بھی چلے جاؤ گے کہیں
صورت کے دیکھنے کو بھی ترساؤ گے کہیں

اماں ، پھپھی ، چچی کو رلاتے ہو ہائے ہائے
کہرام سارے گھر میں مچاتے ہو ہائے ہائے
بہلانے کو گلے سے لگاتے ہو ہائے ہائے
دامن تم اپنا مجھ سے چھڑاتے ہو ہائے ہائے
دامن کبھی نہ چھوڑوں گی کتنا ہی تم چھڑاؤ
مجھ کو نہ لے چلو تو چچا کو بلا کے لاؤ

شہ نے کہا پکار کے زینب سے اے بہن!
آخر رضائے حق میں ہے بہبود ہر سخن
اس خانداں کا صبر ہمیشہ سے ہے چلن
ہیں واسطے ہمارے ہی دنیا کے سب محن
تم صابرہ کی بیٹی ہو درکار صبر ہے
لازم ہے صبر ، حصۂ ابرار صبر ہے

گھر بھی جلے گا قتل بھی ہوں گے لٹیں گے ہم
اس کی رضا میں کس کو ہے دم مارنے کا دم
گردن جھکی ہے اور نہیں ابرو میں جائے خم
راضی ہیں ہم رضا پہ کچھ اصلا نہیں ہے غم
بھاری کرو نہ دل کو سبکدوش ہے حسین
فریاد یہ تری ہے کہ خاموش ہے حسین

دنیا ہے کون، کام نہیں کائنات سے
ہم تشنہ جان سیر ہیں آبِ حیات سے
فارغ ہیں اضطرابِ حیات و ممات سے
ہر آن میں علاقہ ہے اس کی ہی ذات سے
ہم تو ازل کے روز سے ہر دم رہے شہید
آیا نہیں کبھی بھی محرم میں روزِ عید

عابد گرے قدم پہ کہ اے شاہِ بحر و بر!
اکبر ہوا شہید کہ تھا مجھ سے خورد تر
کچھ غور ہو تو جائے ندامت ہے کس قدر
ہر چند ہوں مریض ولے اذن دو اگر
رن کی زمین کو تہ و بالا ابھی کروں
جی جاؤں گر تلافیِ حضرت میں، میں مروں

رمایا جانشینِ امامت ہے کون پھر
حلالِ مشکلاتِ شریعت ہے کون پھر
چشم و چراغِ بزمِ رسالت ہے کون پھر
نقشِ نگینِ مہرِ نبوت ہے کون پھر
اسرارِ انس و جاں کی تمھیں تو کلید ہو
ہو جاؤ تم شہید تو کعبہ شہید ہو

سمجھا کے سب کو شاہ نے خاموش کردیا
پھر خلعتِ رسول کو زیبِ بدن کیا
پہنی زرہ مشابۂ حمزہ سرِ قبا
لی ذوالفقار زیرِ بغل مثلِ مرتضیٰ
دستارِ مصطفیٰ جو ہوئی زیبِ فرقِ نور
ہیبت یہ کہہ رہی تھی اجل سامنے سے دور

یوں آئے خیمہ گاہ سے پر قہر شاہِ دیں
جس طرح[1] نیستاں سے بڑھے ضیغمِ غریں
زیر و زبر زمانہ ہوا دیکھ کر جبیں
خر تھا سوارِ عرش تو عیسیٰ سرِ زمیں
یہ چہرہ پر جمال و جلالِ جناب تھا
جس ذرے پر نگاہ پڑی آفتاب تھا

۱۔ اصل متن (ص ۲٦۰) میں 'طرح' کے بعد 'سے' غلط ہے،
حذف کیا گیا۔ (مرتب)

پاگاہ[1] سے سمند ادھر آیا جو[2] ہو کے زیں
ہر ہر قدم کے نقش سے پیدا مہِ مبیں
سائے کو اپنے دیکھ کے چمکا جو کچھ کہیں
ہٹنے لگا سپہر سمٹنے لگی زمیں
بدلی ہوئی کنوتیاں اُبلی ہوئی نگاہ
کہتی تھیں اب نہیں ہے کسی کی کہیں پناہ

قربان تھا ہلال اگر نقشِ نعل پر
سرعت کو سجدہ کرتا تھا ہر گام پر قمر
ہر گرد جستہ چشمِ کواکب کی تھی نظر
تیور سے اس کے رعد کا تھا آب تھا جگر
ناگاہ لعل سے جو شرارے ہوئے بلند
ہر برجِ آتشیں سے ستارے ہوئے بلند

۱۔ پایگاہ: ۱ ۔ جا ، مکان ، مقام، قدر ، مرتبہ ، بہ معنی درگاہ و آستانۂ خانہ ہم گفتہ اند ۔ پاگاہ و پایگہ نیز گفتہ شدہ ۔
(فرہنگ عمید ، ص ۳۱۴)

۲۔ مصرع ناموزوں تھا ، 'جو' کے اضافے سے مصرع موزوں ہو جاتا ہے (مرتب)

کس دھوم سے چلا ہے وہ جب تھان سے چلا
سرعت شکستہ رنگ تھی جرأت گریز پا
شعلہ لپک کے چادر قلزم میں جا چھپا
دامان سنگ ڈھونڈتی پھرنے لگی صبا
مغرب سے ہٹ کے جانب مشرق جو کچھ بڑھا
سایہ پلٹ کے سینۂ گردوں پہ جا چڑھا

سائے سے اس کے شمس و قمر گرد بردِ نور
ظلِ ہما غبار کا اس کے فروغِ دور
طلعت سے اس کی ناز فزا عالمِ ظہور
تھا عرش اوج میں تو تجلی میں کوہِ طور
در صفا و نور کی اک موجِ آب تھا
ہر گام اس کا چشمِ کواکب میں خواب تھا

صطبل میں براق وغا میں ہزبر تھا
سرعت میں تھا نشاط تو مہلت میں ابر تھا
چلنے میں تھا نسیم تو رکنے میں ابر تھا
بڑھنے میں تھا امید تڑپنے میں صبر تھا
اسرار غیب کھلنے میں بندھنے میں تھا خیال
گو دیکھنے کو خواب تھا پر فہم میں محال

آنے مین وهم جانے مین هوش و حواس تھا
هر قید سے تھا دور اشارے کے پاس تھا
بڑھنے میں یہ شکوہ کہ اعدا کے پاس تھا
اور رکنے میں تڑپ کے شہیدوں کی پیاس تھا
روندا زمین و چرخ کو یہ آؤ جاؤ مین
خورشید و ذرہ تلنے لگے ایک بھاؤ مین

هلتا تھا هر مکان و مکیں اس کی دھاک سے
برهم تھی هر کمند و کمیں اس کی دھاک سے
شمس و قمر تھے خاک نشیں اس کی دھاک سے
سر در هوا سپہر و زمین اس کی دھاک سے
جب شش جہات اس سے نہ سبقت ربا هوئیں
چاروں طرف لپٹ کے فنا ایک جا هوئین

آیا جو سوے دشت نیستاں میں شعلہ تھا
کچھ جست کی تو دامنِ گردوں سے جا لگا
اٹھنے مین تھا لپٹ تو جھپٹنے مین صاعقا
اور گرد سے غبار سے صرصر کا حوصلا
سایہ چمک کے خرمنِ صد برق بن گیا
هر ذرہ مدعیِ انا الشرق بن گیا

لرزاں تھے[1] اس عقاب سے وحش و طیور تک
رفتارِ شیر چل نہ سکی پائے مور تک
پامالِ خاک و خوں تھی ضیا دور دور تک
پیچھا نہ دیکھتی تھی صبا پھر کے دور تک
تھرا رہے تھے ایسے بد اطوار و بدخصال
کہتے تھے آپ یوسفِ کنعاں کا گرگ حال

گزرا چمن کی سمت تو گل اور ہی کھلا
سرعت سے بند دم تھا روانیِ نہر کا
خجلت سے کی صبا نے تہِ سنگ اپنی جا
گلگوں تنی سے اس کی گلستاں ہوا ہوا
دیکھا تو رنگِ گل میں ذرا بھی چمک نہ تھی
بو کیا کرے دماغ کہ اصلا مہک نہ تھی

چمکا ذرا جو جنبشِ سبزہ سے ناگہاں
بو ہو کے رنگِ گل میں نظر آیا بے گماں
واں سے اڑا تو نشو و نما ہو کے تھا عیاں
القصہ برگ و بار میں چل پھر کے خوش عناں
اہلِ نظر کا لذتِ کام و زباں تھا
لذت سے جست کی تو روانیِ جان تھا

۱- اصل متن (ص۲۶۲) میں 'تھا' ہے، 'تھے' تصحیح قیاسی۔ (مرتب)

غوغا ہوا محیط جو اُس کے شباب کا
ہیبت سے جی بھر آیا ہر اک موجِ آب کا
پانی ڈھلا جو خوف سے چشم حباب کا
گردابِ نیل ہو گیا دامن سراب کا
یک‌بارگی ہوا یہ تلاطم میں اضطراب
کشتیِ نوح ڈھونڈتا پھرتا تھا ہر حباب

ہر سیلِ آب غارتِ پامال ہوگئی
ہر جوے دشت صورتِ غربال ہوگئی
ہر موج درھمی کے لیے جال ہوگئی
ہر شکلِ قطرہ رعد کی تمثال ہوگئی
آوارگی تباہ تھی خوفِ ہلاک میں
ماھی میں تھا نہنگ تو ماھی تھی خاک میں

دریاے شور اُٹھتے ھی یہ تیز ہوگیا
قطرے اُڑے تو اور بھی مہمیز ہوگیا
تھرا کے آسمان زمیں ریز ہوگیا
پیمانہ سب کی موت کا لبریز ہوگیا
صورت لرز رھی تھی یہ طوفانِ نوح کی
ہر موج دستِ توبہ تھی عجزِ نصوح کی

دریا نے[1] اس سے بچنے کی پائی نہ کوئی جا
گہ کوہ پر چڑھا تو کبھی خاک پر گرا
گہ بہرِ امن بیخِ نباتات مین چھپا
واں بھی نہ پایا امن تو پھر خاک میں ملا
پھر خاک سے بخار ہوا اور مآلِ کار
باراں بنا اور اُس سے بنا دُر بےِ نثار

بُرّاقیت سے اس کی ہوا آبِ جو سپید
چشمِ سیہ سے آبِ خضر تھا فنا میں قید
نظروں سے اُس کی موج لرزنے کو نا اُمید
تیور میں اس کے لطمۂ طوفان کی نوید
گرداب کی جو گرد تھی گردِ سم سمند
سوراخِ مور میں ہوا طوفانِ نوح بند

پہنچا سوے فلک تو ملک صاف اُڑ گئے
خورشید و ماہ چھپ کے تہِ قاف اُڑ گئے
مجہول ہو کے عقل کے اُوصاف اُڑ گئے
لوح و قلم سے معنیِ انصاف اُڑ گئے
رفرف پہ جا چڑھا تو گرا عرش سر نگوں
پلٹا ذرا تو عرش پہ تھا فرش سر نگوں

۱۔ اصل متن (ص ۲۶۴) میں 'کو' بے معنی ہے ، 'نے' تصحیح قیاسی ہے ۔ (مرتب)

صحرائے کائنات سے آگے نکل گیا
میدانِ شش جہات سے آگے نکل گیا
قیدِ حدِ حیات سے آگے نکل گیا
یاں تک بڑھا صفات سے آگے نکل گیا
ہرچند اس سے کون و مکاں گرد برد تھا
پر یہ بھی جوشِ خونِ شہادت کی گرد تھا

نہ چرخ ہر خرام میں صد بارہ پس گئے
کیا آسماں ثوابت و سیارہ پس گئے
ہو کر سپہر خوف میں آوارہ پس گئے
تابِ صدا و طاقتِ نظارہ پس گئے
کاوے سے اس کے کون و مکاں تھے کمند میں
تھا یہ بھی ایک معجزہ شکلِ سمند میں

اہلِ سقرخرامِ تگاور سے دنگ تھے
ہیبت سے بیم و یاس کی صورت کے رنگ تھے
جنبش میں نیم کشتہ شکارِ پلنگ تھے
مجبور زندگی کی فراخی سے تنگ تھے
تھا شامیوں میں شور یہ کیسی ہوئی صباح
دیکھا جو غور سے تو برآمد ہے ذوالجناح

پڑھتے ہی 'جا ہدو' کو ہوئے شاہِ دیں سوار
تھے گرد و پیش صبر و توکل کے چوبدار
کہتے بڑھے جلو میں هدایت یہ بار بار
مجرا ادب سے ، هوش سے ، اے قوم نابکار
بوسہ دیا رکاب کو اقبال و جاہ نے
پکڑا شکاربند رضائے الٰہ نے

موسیٰ عصا بہ دوش اگر چوب دار تھا
یعقوب کے تھی هاتھ میں فتراکِ بادپا
اور نوح کی ندا تھی نقیبِ شہِ هدا
اور حسنِ یوسفی تھا خواصی میں پیشوا
قرنا کو پھونکتے ہوئے داؤد تھے رواں
تھامے[1] ہوئے تھے عیسیٰ وادریس ساربان

پہنچی جلو میں بڑھ کے اولوالعزمیِ کلیم
اور جرأت خلیل بڑھی خادمِ قدیم
اٹھی دعائے لوط اُلٹ دینے کو جحیم
اور مصطفائی عرش کو کرنے لگی دونیم
آئی هوائے عاد اڑانے کے واسطے
اور موجِ جوشِ نیل بہانے کے واسطے

۱- املا اصل متن (ص ۲۶۶) ' تھانبے '- (مرتب)

قہر خدا نے عرض کی یا شاہِ خوش خصال!
روکے نہ مجھ کو صبر تو اب سب ہیں پائمال
جاہ و حشم کا اُن کے نہ کچھ کیجیے خیال
اک ہی نظر کو پھیر کے دیکھو تو ان کا حال
شہ نے کہا کہ ہم کو عنایت ہی چاہیے
اُمت سے کیا اڑیں گے مروت ہی چاہیے

پھر آپ نے بہ لطف و عنایت کیے سلام
غصے کو روک روک کے اور دل کو تھام تھام
یہ کیا کیا ہے کچھ تو کہو اے گروہِ شام
تم نے جو خاندانِ رسالت کیا تمام
وہ بات کہتا ہوں جو کسی پر نہیں نہاں
تم بھی تو جانتے ہو کہ سب پر ہے یہ عیاں

دیکھو فقط رسولِ خدا کے تھے چند یار
اور خویش و غیر دشمنِ جانی تھے صد ہزار
تھے سارے بت پرست خدائی میں بے شمار
اللہ رے صدقِ عہد کہ تھے کیسے استوار
ہرگز کیا دریغ نہ کچھ مال و جان سے
ڈھایا ہے زورِ کفر کو کیسا جہان سے

گھر چھوڑ کر مہاجر و انصار ہی رہے
جاہ و حشم لٹا کے خریدار ہی رہے
زندہ دلی سے مرنے پہ تیار ہی رہے
کیا یار غار[1] تھے کہ وفادار ہی رہے
یاں تک فنا ہوئے تھے ولائے رسول میں
بنوائی اپنی قبر بھی پائے رسول میں

اور اہل کوفہ تھے مرے ہژدہ ہزار دوست
ہو ہو کے دست بیع بنے رازدار دوست
اک ایک تھا مبالغے میں جاں نثار دوست
اب ایک بھی نہیں ہے بجز کردگار دوست
آج اپنا سر خدا و محمد کے ساتھ ہے
کل قوم پر دغا کے گریبان ہاتھ ہے

شکوہ اگر دروغ ہے اور یہ بیاں غلط
دیکھو تو کسکی مہریں ہیں اور کسکے ہیں یہ خط
مسلم کے قتل کا مجھے شکوہ نہیں فقط
میراث میری صبر ہے صد شکر ہر نمط
کیا ایک کا خیال کہ میں سب کو رو چکا
فوج خدا و گنج محمد کو کھو چکا

۱۔ مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ۔ (مرتب)

گو سودمند پند نہیں اب ذرا تمھیں
ایمان دار ہوتے تو ہوتی حیا تمھیں
ہوتا جو پاسِ سرورِ خیر الوریٰ تمھیں
آتا مرے ستانے سے خوفِ خدا تمھیں
گو قتل میرا عین رضائے خدا ہوا
پر منصفی کا خون تمھیں کیوں کر روا ہوا

کل ہی کی یہ تو بات ہے کچھ فاصلہ نہیں
یہ بھی اگر دروغ ہے تو کچھ گلہ نہیں
مد نظر کچھ اس کے بیاں سے صلہ نہیں
فوجِ یزید ہے یہ مرا قافلہ نہیں
کوئی تو ان میں ہوئے گا مردِ خدا شناس
اظہارِ حق کرے گا جو ایماں کا ہوگا پاس

گھیرا تھا فوجِ ظلم نے جب آن کر حرم[1]
اور ہر طرف سے کر لیا زیرِ نظر حرم
محصور تھا محاصرے میں سر بہ سر حرم
بادِ سموم تیز تھی اور ریگ پر حرم
یہ دھوپ شعلہ خیز کہ اللہ کی پناہ
مرتی تھی مارے پیاس کے جتنی ہے یہ سپاہ

۱۔ خیمۂ اہل بیت۔

افراطِ العطش سے جو نالاں ہوئی سپاہ
اور چھوڑ کر اصرہ لی اپنی اپنی راہ
حر آیا میرے پاس بہت خستہ و تباہ
کی عرض آب چاہیے اس شب میں تا پگاہ
تابِ محاصرہ نہیں اب فوجِ شام کو
للہ عفو کیجے قصورِ غلام کو

حر سے کہا گیا کہ عبث اضطراب ہے
پانی ہمارے ساتھ ہے کارِ ثواب ہے
نا حق کا بندگانِ خدا پر عذاب ہے
کوثر کو ہم لٹاتے ہیں کیا چیز آب ہے
جب آپ واں پہ کوثر و تسنیم دیں گے ہم
پھر بخل جامِ آب کا یاں پر کریں گے ہم

غل ہر طرف نقیب کا تھا حکمِ عام ہے
فوجِ خدا میں آج تمھارا مقام ہے
سقے پکارتے تھے سبیلِ امام ہے
جی بھر کے خوب پی لے کہ لبریز جام ہے
ساغر چھلک رہے تھے تو مشکیں بھری ہوئیں
پر آب تھیں صراحیاں کوری دھری ہوئیں

پیاسے سبو و جام پہ یہ ٹوٹ کر پڑے
جیسے کہ برق قلزم و جیحون پر پڑے
یا گھوڑے پر تھے یا کہ سرِ خم نظر پڑے
اور بہت[۱] سے تڑپتے تھے تشنہ جگر پڑے
ڈلوایا اُن کے منہ میں گلاب و نبات کو
کچھ پاس ہو زباں کا تو بھولو نہ بات کو

سب سے سلوک دل سے کیے جان کی طرح
پیش آیا شکلِ انس سے انسان کی طرح
خدمت میں تھا مبالغہ مہمان کی طرح
اور وہ بھی دلبری سے نہ احسان کی طرح
کس طرح سے میں اُن کی اذیت کو دیکھتا
مہماں کو دیکھتا کہ مروت کو دیکھتا

اب وہ ہی میں ہوں، وہ ہی ہو تم نا خدا شناس
کچھ خوف ہے خدا کا نہ کچھ مصطفیٰ کا پاس
اب کیا کوئی جہان میں رکھے کسی سے آس
حملہ ہے نو ہزار کا اور تین دن کی پیاس
بچوں کو میرے قتل کیا تاک تاک کر
تشنہ دہان سارے تڑپتے ہیں خاک پر

---

۱ 'بہت' کو قلق نے 'بہوت' یعنی بر وزن 'فاع' بہ طور قدما باندھا ہے، حالانکہ بر وزن 'فَعَل' ہے۔ (مرتب)

میں بھی شجاع ابن شجاعِ جہاں ہوں
روباہوں کی ہوں موت تو شیروں کی جان ہوں
اس فاقے میں بھی قبلۂ تاب و توان ہوں
جنبش کروں تو زلزلۂ آسمان ہوں
دنیا کے سب حصار نہ تم سے اُلٹ گئے
کشتوں سے اپنے غارِ جہنم کے پٹ گئے

آئے جو ہم خوارقِ عادات پر ابھی
اک لقمہ برق و باد کا ہو خشک و تر ابھی
گر جائے آسمان سے شمس و قمر ابھی
تیغِ جلال خلق کے ہو جائے سر ابھی
ہو جائے گر اشارہ شجاعت کے جوش پر
جتنے کھڑے ہو سر نہ کسی کے ہو دوش پر

پانی جو چاہیں ہم تو ابھی ابرشِ[1] مطیر
مارے زمیں میں ٹاپ اُمنڈ آئے جوئے شیر
پر شیر جام سامنے لائے مہِ منیر
اور لے کے آفتابۂ خورشید دوڑے تیر[2]
جنبش سے موجِ ریگ کی پر آب دشت ہو
پانی بھرے زمین پہ نایاب دشت ہو

---

۱ - 'ابرش' کے معنی فرہنگ عمید (ص ۸۲) میں یہ لکھے
(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

تیغ و سپر کے زور پہ اور مجھ سے کارزار
پھینکوں جو مشتِ خاک تو ہو جاؤ سنگ سار
بدلوں نظر تو یہ تہ و بالا ہو آشکار
دب جائیں اپنے سائے میں جتنے ہیں یہ سوار
جو تیغ اٹھائے اس کے ہی حلقوم پر رہے
ہرگز نہ ظلم پھر کسی مظلوم پر رہے

پر کیا کروں کہ اس کی مشیت ہی اور ہے
مجبور آپ ہونے میں قدرت ہی اور ہے
عمداً گلا کٹانے میں قدرت ہی اور ہے
یہ جنگ اور ہے یہ شجاعت ہی اور ہے
ماہی سے تا بہ ماہ مراتب ہمارے سن
سن لی تری رجز تو مناقب ہمارے سن

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)

ہیں : وہ گھوڑا جس کے رنگ کے خلاف چتیاں ہوں یا سرخ رنگ گھوڑا جس کے سفید چتیاں ہوں یا سرخ اور سفید رنگ گھوڑا ۔ 'مطیر' بر وزن فعیل کے معنی غیاث اللغات اور شمس اللغات اور صراح میں 'برسنے والا' لکھے ہیں ۔ البتہ باب تفعل میں 'مطر' کے معنی زمین میں داخل ہونا اور تیز چلنا ہیں اور اس سے 'مطیر' آئے گا ۔ بہر حال قلق نے 'مطیر' گھوڑے کی صفت ٹھہرائی ہے ۔

۲ ۔ عطارد ۔

آدم کی نسل میں ہے ہمارا خمیرِ نور
واقف نہیں محل سے ہمارے قریب و دور
ظلِ خدا ہیں ہم ہی کہ ہیں باعثِ ظہور
غیب الغیوب جانتے ہو جس کو ہے حضور
ہر مرتبہ ہماری بلندی سے پست ہے
واجب کیا خدا کو ہمیں نے کہ ہست ہے

ذاتِ امام علمِ نبوت کا باب ہے
رمز ہدیٰ و معنیِ اُم الکتاب ہے
میں روشنی ہوں دین، اگر آفتاب ہے
اس کا میں ہی جواب ہوں جو لاجواب ہے
وہ شمع ہوں کہ ہوتے ہی گل، ہے جہاں سیاہ
ظلمت سے شکل اپنی چھپائیں گے مہر و ماہ

افسوس ہے کہ واقفِ اسرار تم نہیں
اور باریابِ حضرتِ جبار تم نہیں
راہِ ہدیٰ و حق کے طلب گار تم نہیں
اور قدر دانِ احمدِ مختار تم نہیں
جب میں نہیں تو کچھ بھی نہیں اس جہان میں
یہ بوریائے باد ہے تہ ایک آن میں

میں وہ علم ہوں سایہ میں جس کے ہے لاالٰہ
وہ تیغ ہوں کہ جس سے کٹے کفر و کفرخواہ
ہوں وہ ستوں جو پشتِ نبوت کی ہے پناہ
وہ چیز ہوں کہ سائے میں ہیں جس کے مہرو ماہ
دیکھو کسے گراتے ہو سایہ ہوں عرش کا
گرتے ہی حشر آئے گا پایہ ہوں عرش کا

وہ نور ہوں جو شکلِ محمد میں تھا عیاں
اور فاطمہ کے بطن میں چندے رہا نہاں
پردہ ہوا جو حد سے زیادہ اُسے گراں
یہ میں حسین ہو کے ہوا نامیِ جہاں
اب فدیۂ قبولِ جنابِ کریم ہوں
ایجادِ کائنات کا اجرِ عظیم ہوں

شانِ عجم بھی میں ہی ہوں فخرِ عرب ہوں میں
والا حسب بھی میں ہی ہوں عالی نسب ہوں میں
دنیا و دیں کی دولت و اعزاز سب ہوں میں
احسانِ کردگار ہوں اور فضلِ رب ہوں میں
اُٹھتے ہی میرے دولت و اقبال خاک ہے
انصاف و عدل و دین و دیانت ہلاک ہے

شمعِ حرم کا نور تجلیِ کوہِ طور
سائے سے میرے ہے یدِ بیضا خجول و کور
شمع و چراغِ بزمِ رسالت کا صاف نور
تفریحِ دشتِ قدس و مرورِ ختم ظہور
وہ ذرّہ تہ نشینِ محیطِ ظہور ہوں
ظلمت زدائے شمعِ حرم گاہِ نور ہوں

ہے اک تفِ نجس یہ حکومت یہ احتشام
خاشاک ہے ہمارے ہی گھر کا تو روم و شام
نعلین میں ہمارے ہے ہر شاہ کا مقام
در پر ہمارے صبح ہے ہر آرزو کی شام
ادنٰی غلام اپنے ہوئے شاہ ایسے لاکھ
کیا اک یزید راندۂ درگاہ ایسے لاکھ

سب پر عیاں ہے ناقۂ صالح کی واردات
جب ذبح اس کو کرنے لگے لوگ بد صفات
اک ہی صدا میں اس کی ہوا کوہ بے ثبات
آیا جو زلزلہ تو ہلی ساری کائنات
ربِّ علا کا جوش فگن قہر ہو گیا
الٹا نظر پلٹتے ہی ہر شہر ہو گیا

حیوانؑ کے ہو قتل کا ایسا جب انتقام
آلِ نبی کے خون کے عوض میں ہے کیا کلام
برسے گا خون عرش سے اور قتل ہوگا عام
اب بھی کہو پکار کے توبہ ہے یا امام
وسعت بہت ہے رحمتِ پروردگار میں
اس جبر پر ہے صبر ابھی اختیار میں

سمجھاتے تھے جو شامیوں کو شاہِ نامدار
بعضے تھے خوف ناک تو بعضے تھے شرم سار
پنہاں تھا کوئی منفعل اور کوئی آشکار
چلاّ یا دیکھ کر پسرِ سعد نابکار
کیا سن رہے ہو شاہ کی ترکی تمام ہے
جی چھوڑتے ہو ایک ہی حملے کا کام ہے

انعام و جاہ و منصب و جاگیر لو ابھی
ہے عیش عمر بھر خطِ تقدیر لو ابھی
جانے نہ پائیں کھینچ کے شمشیر لو ابھی
تاراج کر کے غارت شبیر لو ابھی
چاروں طرف سے ٹوٹ پڑی بے شمار فوج
اک شاہ بے پناہ تھے اور صد ہزار فوج

لی ذوالفقار شاہ نے پھر تو نیام سے
نکلی وہ برقِ شعلہ فشاں ابرِ شام سے
شکلِ زبانِ تشنہ وہ باہر تھی کام سے
فریاد سر بلند ہوئی خاص و عام سے
نکلی وہ کیا کہ جان ہی تن سے نکل گئی
ناگاہ روح سہم کے سن سے نکل گئی

قبضے پہ ہاتھ پڑتے ہی اٹھا جہاں سے شور
پاؤں پہ آ پڑا نہ دبا آسماں سے شور
باہر ہوئی دہاں سے زباں اور زباں سے شور
ظاہر تھی یہ نیام سے اور درمیاں سے شور
ہر عقدۂ نقابِ رخِ لافتا[1] کھلا
قدرت کھلی خدا کی علی[2] بند کیا کھلا

۱۔ لا فتیٰ الا علی ، لا سیف الا ذوالفقار ۔
ترجمہ : کوئی بہادر نہیں ہے سوا علی کے اور کوئی تلوار نہیں ہے سوا ذوالفقار کے ۔ مذکر ۔ حضرت علی کی شان میں یہ حدیث ہے ۔
(نور اللغات ج ۳ ، ص ۱۵۲ ، ۱۵۳)

۲۔ علی بند ۔ مذکر۔ (۱)ایک زیور عورتیں کلائی پر باندھتی اور ہاتھوں کی انگلیوں میں بھی پہنتی ہیں ۔ (۲) کشتی کے ایک پیچ کا نام ۔ (۳) ایک قسم کا تعویذ جو جادو کا اثر مٹاتا ہے ۔
(نوراللغات ج ۳ ، ص ۵۱۹)

نکلی وہ جب ذرا سی تو سارے سرک گئے
چمکی اس آب و تاب سے تارے سرک گئے
خورشید و ماہ ایک کنارے سرک گئے
عیسیٰ و خضر وہم کے مارے سرک گئے
نکلی تو ماہ چھوڑ کے ہالہ نکل گیا
گویا دلِ خموش سے نالہ نکل گیا

نکلی بغل سے ہٹ کے دل آرام کی طرح
چمکی کنارہ کر کے مہِ شام کی طرح
دامن کشیدہ یاس سے تھی کام کی طرح
آگے پڑے تھی شوق سے پیغام کی طرح
باہر نیام سے نکل آئی وہ اس طرح
پرواز اڑ گئی پرِ عنقا سے جس طرح

یک بارگی نیام سے باہر جو آ گئی
خیرہ تھے مہر و ماہ نگاہوں میں کھا گئی
سب بجھ گئے زمین پہ حیرت یہ چھا گئی
ٹکرا گئے حواس نظر لڑکھڑا گئی
اندازِ بے خودی سے پامال تھی
اللہ رے جمال کہ شانِ جلال تھی

نکلی جو یہ تو جن و بشر ہوئے نہاں
پھٹ پھٹ گئی زمین شجر ہو گئے نہاں
مجروح ہو کے تیغ و تبر ہو گئے نہاں
پامالیوں میں سینہ و سر ہو گئے نہاں
دامانِ رحم چھرے پہ لے کر قضا چھپی
اور عافیت بھی گوشۂ مرقد میں جا چھپی

سرعت میں مدح و ذم سے سراپا کشیدہ تھی
سائے سے اپنے طائرِ شاخِ بریدہ تھی
اتنی سبک خرام کہ خود ھی ندیدہ تھی
جس کی نظر پڑی وھی آفت رسیدہ تھی
اوصاف اس کے لکھنے میں خاموں کے سر کٹے
ہر بیت پر ملائکِ مضموں کے سر کٹے

بد مست ہو کے گاہ بہکتی ہوئی چلی
گاہے سمٹ کے متکے مسکتی ہوئی چلی
بن کر جگر کی کور کسکتی ہوئی چلی
پیچھے ہٹی تو اور لپکتی ہوئی چلی
پامال ہو کے نیستی ھستی کے سر ہوئی
ہل چل میں کائنات ادھر کی ادھر ہوئی

کھنچ کھنچ کے تھم گئی جو سرِ منکرین پر
لاشے تہِ رکاب تھے اور سر تھے زین پر
گاھے کرم فلک پہ کیا گہ زمین پر
بوسہ دیا جناب کی گہ آستین پر
کھنچتی رہی کہ قیدِ شریعت ضرور تھی
دستِ امام میں تھی مروت ضرور تھی

دل ھی کی دل میں رہ گئی جو جس کے سر میں تھی
فریاد تھی گلو میں نہ طاقت جگر میں تھی
مجروح تھی جو شکلِ رھائی نظر میں تھی
مذبوح وہ اماں جو قضا و قدر میں تھی
اب تک دلِ نفاق میں قطع و برید تھی
حقا کہ یہ امانتِ تیغِ شہید تھی

سر سے گزر کے ناخنِ پا تک گزر گئی
واں سے بڑھی تو تحتِ ثریٰ تک گزر گئی
پلٹی تو دشت و کوہ و سما تک گزر گئی
سدرہ سے چل کے عرشِ علا تک گزر گئی
جو زین پر تھا اُس کا جدا بند بند تھا
گھوڑے سے جو گرا وہ تڑپ کر سپند تھا

نکلا جو منہ سے ایک کے اے لو وہاں چلی
تو دوسرا پکارا یہ آئی یہاں چلی
کہتا تھا تیسرا کہ چلو میری جاں چلی
چوتھا جو کچھ کہے سرِ نوکِ زباں چلی
اک ہی نظر کے ساتھ کہاں سے کدھر گئی
یہ آئی وہ چلی ادھر آئی اُدھر گئی

آیا جو سامنے وہی خوں خوار کٹ گیا
فارغ ہوا کہ جان کا آزار کٹ گیا
اسوار تا بہ سایۂ رہوار کٹ گیا
یک بارگی جو لشکرِ فرار کٹ گیا
رستے سفر کے کٹ کے یہ آوارہ ہو گئے
ٹکرا کے سونے جان دی سید ہے جو دو گئے

اُلفت جدا تھی دل سے تو دل سے جدا جگر
آنکھیں کسی طرف تھیں پریشاں کہیں نظر
رفتار تھی قدم سے جدا اور تن سے سر
بھاگا پسر کو چھوڑ کے میدان میں پدر
ہر ایک کا علاقہ و پیوند قطع تھا
وابستگیٔ دہر کا ہر بند قطع تھا

تابش سے اس کی آگ لگی آفتاب میں
ماہی موج برق رسیدہ تھی آب میں
اخگر ہر ایک قطرہ بنا اضطراب میں
ڈوبے نگاہ بانِ فرات اس کی آب میں
اس خرد برد پر بھی تو صابر لقب رہی
دریائے خون پی گئی اور خشک لب رہی

لاتی تھی غول غول کو یہ گھیر گھیر کر
کشتوں میں ڈوب ڈوب گئی تیر تیر کر
پیچھے رہی اجل جو چلی ٹھیر ٹھیر کر
پہنچی تو بعدِ عمرِ دگر خیر خیر کر
تھے کچھ تو انتظارِ اجل میں کھڑے ہوئے
اور کچھ تڑپ رہے تھے زمیں پر پڑے ہوئے

مثلِ نسیم صاف چمن سے نکل گئی
خوشبو کی طرح سرو و سمن سے نکل گئی
مانندِ روح کوچۂ تن سے نکل گئی
صابن کا تار ہو کے بدن سے نکل گئی
سر دوش سے الگ تھا ولیکن عیاں نہ تھا
جو زخم کارگر تھا اسی کا نشاں نہ تھا

جس کے لپٹ کے سینے سے یہ مہ لقا لگی
جی جان سے چھڑایا نہ رکھی ذرا لگی
کیا چوٹ تھی کہ دل ہی میں ہرا ک کے جا لگی
برباد تھا وہ جس کو ذرا بھی ہوا لگی
ان بے حجابیوں پہ حیا بھی نہ چھٹنے دی
قدموں پہ سر گرائے اور انگلی نہ اٹھنے دی

ارماں کو لے کے جنگ کی حسرت نکل گئی
بے غیرتوں کو چھوڑ کے غیرت نکل گئی
اوجھل میں پشت پھیر کے قوت نکل گئی
آنکھیں چرا کے صاف مروت نکل گئی
میدانِ جنگ چھوڑ کے عالم نکل گیا
سائے کو جس نے دیکھ لیا دم نکل گیا

حبِّ علی میں لپٹی ہی جاتی تھی دوڑ کر
صف زیرِ صف زمیں پہ بچھاتی تھی دوڑ کر
ناز و نیاز سب کے اٹھاتی تھی دوڑ کر
ہر ایک کو گلے سے لگاتی تھی دوڑ کر
جو سر گراں ہوا وہ سرِ جنگ اڑ گیا
لوہو سپید سب کا ہوا، رنگ اڑ گیا

صرصر تھی دشت میں تو چمن میں نسیم تھی
شعلہ تھی خارزار میں، گل میں شمیم تھی
طوفان تھی کہیں، کہیں ابرِ کریم تھی
گہ گردن غضب، گہے فرقِ حلیم تھی
خوف و رجا کے حق میں بشیر و نذیر تھی
آخر تو تیغِ نائبِ ربِ قدیر تھی

پھر بحر کی طرف یہ چلی ایسے گھاٹ سے
ہر موج ٹکڑے ٹکڑے ہوئی پھٹ کے پاٹ سے
ساحل نہ لب گزیدۂ حسرت تھا چاٹ سے
زیر و زبر زمانہ ہوا اس کی کاٹ سے
برجِ اسد طویلۂ گاوِ زمین تھا
ماہِ سپہر ماہیِ دریائے چین تھا

آمڈی جو یک بہ یک تو کفِ آب ہوگئی
قطرے میں چھپ کے گوہرِ نایاب ہوگئی
لرزاں ہوئی یہ موج کہ بےتاب ہو گئی
نکلی جو بیچ کے خشک تو شاداب ہوگئی
دریا کے قطرے قطرے میں شورِ عظیم تھا
ھے ھے ہر اک صدف میں ہر اک در یتیم تھا

یہ قلزمِ محیط کے[1] جب کھوج پر چڑھی
ہو کر سوارِ آب ہر اک موج پر چڑھی
قطرہ زنی سے بادلوں کی فوج پر چڑھی
مانندِ شیر دھار کی ہر اوج پر چڑھی
آب اُس کے عزمِ گرم سے ناپید ہو گیا
دیکھو نا' خشکؔ چشمہ' خورشید ہو گیا

بر ّشِ سے اس کی چرخ تہِ آب جا چھپا
اور بحر کٹ کے کوہ کے دامن میں آ چھپا
ہر مرغ زار و دشت میں کیا کیا پھرا چھپا
غرقِ خلاب[2] و خاک ہوا جا بہ جا چھپا
دریا یہ تھوڑا تھوڑا ہوا اس کی تاب سے
تھا ڈوبنے کی فکر میں موجِ سراب سے

۱۔ اصل متن (ص ۲۷۹) میں 'لہ' ۔ (مرتب)

۲۔ خلاب : (۱) (بہ فتح خا) گل ولالہ ، زمین پر گل کہ پا دراں فرو برود ۔ (فرہنگ عمید ، ص ۵۳۹) (کیچڑ ، دلدل)

برھم کیا یہ اس نے قرار و ثبات کو
تھی رعد و برق ڈھونڈتی راہِ نجات کو
مجروح کر کے رابطۂ کائنات کو
کاٹا ھے اس طرح سے اُمیدِ حیات کو
اب ھر نفس کے ساتھ ھے دھڑکا لگا ھوا
سب کو ھے اپنی موت کا کھٹکا لگا ھوا

تنہا نہ اک بہادرِ یکتا کو دو کیا
روشن ھے آسماں پہ کہ جوزا[1] کو دو کیا
مثلِ نقط ھے قاف میں عنقا کو دو کیا
مشرک کے ساتھ ساری ھی دنیا کو دو کیا
ھر چیز فرش و عرش کی اک پل میں دو ھوئی
ذاتِ خدا بھی دیدۂ احول[2] میں دو ھوئی

۱- جوزا: (ع) - مذکر - تیسرے آسمانی برج کا نام جو دو جڑواں لڑکوں کی شکل کا ھے - (نوراللغات، ج ۲ ص ۴۵۱)

۲- احول: ع (بالفتح) وہ جو ایک چیز کو دو دیکھے، آنکھ، دیدہ یا انسان کی نسبت کہتے ھیں - (نوراللغات ج ۱ ص ۲۸۸)

امراهوں کو جب اُس نے ٹھکانے لگا دیا
ور بادپا نے خاک پہ طوفاں اٹھا دیا
دونوں نے اپنا اپنا تماشا دکھا دیا
شق ہو گئی زمین فلک کو گرا دیا
یہ زور تھی وہ شور تھا یہ برق وہ سحاب
یہ غیظ میں ہوا ہوئی وہ قہر میں عتاب

پھرتے تھے تیز تیز یہ دونوں کہ الاماں
سر ، ریزفتنہ ریز یہ دونوں کہ الاماں
پست و بلند خیز یہ دونوں کہ الاماں
چرخ و زمین ستیز یہ دونوں کہ الاماں
لے بھاگتی زمین کدھر آسماں کو
دونوں نے تنگ کر دیا اک اک کی جان کو

ہر شش جہت بلند تھی فریادِ الحذر
اہلِ وعید نالۂ ناشاد الحذر
آوارگیِ فتنہ و بےداد الحذر
کیا کیا ہلی ہے کفر کی بنیاد الحذر
کیا غیظ میں تھی ادہم شمشیر الحفیظ
لرزاں اُٹھے تھا نعرۂ تکبیر الحفیظ

دونوں تھے ساتھ ساتھ بسانِ مدد نگاہ
جس سمت کو پھرے نہ پھری اُس طرف سپاہ
اس کی گذر تھی سینوں میں اس کی سروں پہ راہ
دھکا یہ موت کا تھا تو یہ مرگ کی تھی راہ
اک ہی طرح کی دھاک تھی نزدیک و دور میں
طوفاں چھپا سفینے میں اور حشر صور میں

دونوں کا عزم ایک تھا اور ایک دم قدم
اُس کے قدم کو کوفت نہ اس کے ہے دم میں خم
ایسے تھے ایک جاں کہ دو قالب ہوے بہم
اُس کی فدا تھی روح تو قربان اس کا دم
یہ اس پہ چل گئی تو وہ اُس پر لپک گیا
چمکی جو یہ ادھر تو اُدھر وہ چمک گیا

سوار اور پیادے سب آوارہ گرد تھے
گویا کہ رفت و روبِ ہزیمت کی گرد تھے
ٹھنڈی بھریں[1] تھے سانس جو مردانِ مرد تھے
شبدیز و ذوالفقار کی گرمی سے سرد تھے
کھوئے گئے کچھ ایسے کہ بس پا گئے شکست
یہ اشتہاے مرگ بڑھی، کھا گئے شکست

---

۱ - اصل متن (ص ۲۸۱) میں 'ٹھنڈی بھریں تھے' - روزمرہ کے خلاف ہے - شاعر اس مصرع کو اس طرح بھی کہہ سکتا تھا:
بھرتے تھے ٹھنڈی سانس جو مردان مرد تھے (مرتب)

تیغ و فرس سے تیر[1] اسد میں لرز گیا
رستم تہِ زمین لحد میں لرز گیا
جو حادثہ تھا اہلِ حسد میں لرز گیا
ہر فتنہ اتہام مدد میں لرز گیا
نقشہ زمیں کا سورۂ[2] زلزال ہو گیا
اٹھتے ہی اٹھتے حشر بھی پامال ہو گیا

منکر تھے اپنی جان بچانے کی فکر میں
اور موت پیچھے پیچھے بہانے کی فکر میں
زیرِ سپر تھے منہ کے چھپانے کی فکر میں
تیرِ قضا تھا اپنے نشانے کی فکر میں
پکڑے زمیں نے پاؤں کہ آوارہ گرد تھے
گرمی میں اپنے خون کی جل بجھ کے سرد تھے

یہ بدحواس و ہوش ہوئی فوجِ فتنہ گر
ترکش میں تیغ ڈھونڈتے تھے، خود میں سپر
سر پر چڑھی ہوئی تھی سواروں کے فکر سر
اور سر پڑے ہوئے تھے پیادوں کے پاؤں پر
سینوں پہ اپنے اپنے ہی بھالے الٹ پڑے
پیچھے ہٹے پیادے رسالے الٹ پڑے

---

۱ - تیر: (ف) مذکر - ۲ - شمسی چوتھا مہینا جس میں آفتاب سرطان میں ہوتا ہے - ساون - شمسی ہر مہینے کا تیرھواں دن - ۳- عطارد ، دبیر فلک [نوراللغات ج ۲ ص ۳۳۵] اس مصرع میں شاعر نے برج اسد میں عطارد کا لرزنا بیان کیا ہے - (مرتب)

۲ - 'اذا زلزلت الارض زلزالها الخ [پارہ ۳۰] -

اہلِ کماں پہ آن کے ایسی کڑی پڑی
شمشیرِ سر فشاں کی سناں پر چھڑی پڑی
زاغِ[1] کماں پہ نوکِ دو پیکر کھڑی پڑی
پیچھے کھنچی کماں کمیں میں پڑی پڑی
پیچھے ہٹی کماں جو سر دوش چھوڑ کر
نکلے بغل سے تیر بھی ترکش کو توڑ کر

چہروں کے رنگ اڑ گئے کافور ہو گئے
لنگوریاں[2] اڑاتے ہی لنگور ہو گئے
آیا جو ایک پاس تو سو دور ہو گئے
بھرّے[3] پڑے کچھ ایسے کہ زنبور ہوگئے
گرد وغا سے برق تھی مشعل بہ کف فرار
ماہی سے لے کے ماہ تلک صف بہ صف فرار

---

۱ - زاغِ کماں: (ف) مذکر - کماں کے گوشے کی نوک - ذوق:
کہے ہے مرغ دل اے کاش میں زاغِ کماں ہوتا
کہ تا شاخ کماں پر اس کی میرا آشیاں ہوتا
[نوراللغات ج ۳ ص ۱۲۱]
۲ - لنگوری : (ہ) اسم مؤنث (۱) چوری پکڑوانے یا نکالنے کی خوشی (۲) گھوڑے کی پھرت یا ایک قسم کی چال ـ
۳- بھرّا : (ہ) اسم مذکر - (۱) ترغیب ، تحریص ، تحریک - لوبھ - (۲) دم ، جھانسا ، فریب [فرہنگ آصفیہ جلد ۴ ص ۲۱۶]
(۳) کسی پھرنے والی چیز مثل پھرکی وغیرہ کی آواز -
(۴) (پورب) ایک قسم کا بڑا پتنگ - (۵) دفعتاً کبوتروں کے اڑنے کی آواز - [فرہنگ آصفیہ ج ۱ ص ۴۳۳]

ھل چل میں ایک ایک پہ گرتا تھا بار بار
ٹھوکر لگی جو ایک کے ٹکرائے صد ھزار
گھوڑے سقط پیادوں پہ اور گھوڑوں پر سوار
افواج پر یہ رنگ تھا میدانِ کار زار
چھپتی پھرے تھی بجلی گراں روحوں سے اجل
کشتوں سے گور پھٹتی تھی مجروحوں سے اجل

پیدل ھٹے سوار ھٹے منہ کو پھیر پھیر
کیا ایک صد ھزار ھٹے منہ کو پھیر پھیر
رک رک کے بار بار ھٹے منہ کو پھیر پھیر
یاں تک ستیزہ کار ھٹے منہ کو پھیر پھیر
مثلِ حیا گروہِ ستم سے نکل گئے
دنیا و دین و عہد و قسم سے نکل گئے

یک بار سب میں پڑ گئی آخر تری[1] بری
فوجِ ستم میں آن کے نالاں اجل پھری
گھوڑوں سے تا بہ اشتر و افیال[2] تھرتھری
مغفر[3] سے لے کے موزۂ پا تک ذری ذری
کہتے تھے شکل اب کے ملے امن و چین کی
لعنت یزید پر ھے، دھائی حسین کی

---

۱ - تری بری : (ھ) صفت - پریشان ، منتشر ، جدا جدا -
[نوراللغات ج ۲ ص ۲۴۹]
۲ - فیل - پیل [ھاتھی] جمع افیال اور فیول - [فرھنگ عمیہ ص ۸۸۷]
۳- مغفر: مذکر- لوھے کا ٹوپ جو لڑائی کے وقت پہنا جاتا ھے
[نوراللغات ج ۴ - ص ۳۲۲]

یاں تک بھی کہ خود کو ڈبایا فرات میں
جز خون مطلق آب نہ پایا فرات میں
تشنہ لبی نے دور اٹھایا فرات میں
کچھ دخل آب کام نہ آیا فرات میں
کہتا تھا ظلم یہ ہے مزا منعِ آب کا
تم جانو اور مقابلہ جانے جناب کا

کہتی تھی سرکشی کہ ذرا سر بچائیو
نخوت بھی میرے ساتھ ہے افسر[1] بچائیو
چار آئینہ[2] کو رکھیو نہ بکتر[3] بچائیو
عزت ہے کچھ تو جان کو بچ کر بچائیو
جرأت نے جی کو چھوڑ دیا آس توڑ کر
مردانگی نے رخ نہ کیا منہ کو موڑ کر

---

۱ - افسر : فارسی میں بہ معنی تاج و صاحب تاج مستعمل ہے - [لوراللغات ج ۱ ص ۳۵۱]

۲ - چار آئینہ : (ف) مذکر - ایک قسم کی زرہ جس میں چار لوہے کے تختے بانات اور مخمل میں مڑھ کر سینے اور پشت کے گرد لگاتے ھیں - [لوراللغات ج ۲ ص ۴۸۹]

۳- بکتر: (ف) مذکر- ایک قسم کا لوہے کی کڑیوں کا بنا ھوا جامہ جولڑائی کے وقت پہنتے ھیں- ایک قسم کی زرہ [نورج ۱ ص ٦۴۸]

امکانِ ضد تصورِ اشیا سے اڑ گیا
رنجِ فساد خاطرِ دانا سے اڑ گیا
رنگِ یقیں مرقعِ دنیا سے اڑ گیا
صورت کا احتمال ہیولا سے اڑ گیا
عیسیٰ ہلاکِ خوف ہوا جنگِ شاہ سے
بھاگا سپہر دیدۂ سوزن کی راہ سے

کبر و غرور و کفر سے خالی جو جا ہوئی
میداں میں پر صفائے راہِ ہدیٰ ہوئی
منکر رہا نہ ایک بغاوت فنا ہوئی
باقی تھی اس کی ذات کہ جس سے بقا ہوئی
متمردوں[1] کے سارے سہارے ہوئے عبث
کذب و دروغ پھرتے تھے مارے ہوئے عبث

آوارگی میں موت کو بھونچال ہو گیا
ہر دم لرز لرز کے برا حال ہو گیا
راہ گریز آئینہ تمثال ہو گیا
اشکال میں تداخل اشکال ہو گیا
نقطے پہ تنگ اپنے محیطِ فلک ہوا
ہر بار خط جدی[2] پہ سرطاں کا شک ہوا

---

۱ - متمرد : بہ کسر رائے مشدد ہے بہ معنی نافرمان اور باغی اور سر کش [فرہنگ عمید ص ۱۰۴۹] لیکن قلق نے ضرورت شعری سے تائے متحرک کو ساکن کر لیا ہے - (مرتب)

۲ - اصل متن (ص ۲۸۴) میں 'خط جادی' ہے 'خط جدی' تصحیح قیاسی ہے (خط جدی وہ خط جو خط استوا سے ۲۳½ درجہ

(باقی حاشیہ صفحہ ۴۴۳ پر)

اُلٹے گرے نشان ، پھریرے سمٹ گئے
سر پر چڑھے ھی آتے تھے ، آخر اُلٹ گئے
گاجر کی طرح خنجر و شمشیر کٹ گئے
سب ٹکڑے ٹکڑے ھو گئے ذروں میں بٹ گئے
پامال ھو کے کوہِ ستم ، گرد ھوگیا
دیکھی زمیں جو سرخ ، فلک زرد ھوگیا

ھر چند عرصہ گاہِ وغا ، صاف ھو گیا
اعدا دو نیم ھو گئے ، انصاف ھو گیا
ظلمت کدہ جہان کا شفاف ھو گیا
میدان صاف قاف سے تا قاف ھو گیا
لیکن رضا نے شاہ کو تسلیم جھک کے کی
تعظیم اس ظفر کی مشیت نے رک کے کی

(گذشتہ صفحے کا باقی حاشیہ)
جانب جنوب واقع ھے۔ جب آفتاب پر پہنچتا ھے تو شمال کی طرف بڑا، رات چھوٹی ھوتی ھے اور وھاں سردی پڑنے لگتی ھے ، جنوب کی طرف خط جدی اور شمال کی طرف خط سرطان سے آفتاب آگے نہیں بڑھتا - [فرھنگ آصفیہ ج ۲ ، ص ۱۹۹]

تغییر چہرہ ہوگیا عالی جناب کا
اور یاد آیا حکم رسالت مآب کا
حملہ ہوا حواس پہ یہ اضطراب کا
رستہ لیا سرادقِ[1] عصمت قباب[2] کا
خیمے پہ آ کے آخری صورت دکھا گئے
جولاں کیا وہاں سے تو دریا پہ آ گئے

دریا کی رہ پہ تھام لیا شہ نے راھوار
حجت تمام کرنے لگے ہو کے استوار
سن لو جو کچھ میں کہتا ہوں ، ہو جاؤ ہوشیار
جو کار بد ھے اس کا برا ھے مآلِ کار
اس حبِ جاہ و مال کا انجام کچھ نہیں
ناکام خود کو کرتے ھو ، یہ کام کچھ نہیں

دنیا ھے بے ثبات ، تماشاے خواب ھے
جو سامنے ھے وہ ھی نظر پر حجاب ھے
آفت میں صبح ماہ ھے شام آفتاب ھے
ھر ذرہ دست بردۂ صد انقلاب ھے
ھر قصرِ سیم ذروں میں تقسیم ھو گیا
ھر نقد ریگ زار میں ھاتھوں سے کھو گیا

۱- سرادق : ع - (بہ ضم سین و کسر دال) سراپردہ ، خیمہ (فرھنگ عمید ، ص ۷۰۲)
۲- قبہ : ع - (بہ ضم قاف و فتح باے مشدد) گنبد - قباب و قبب جمع (فرھنگ عمید ، ص ۸۹۲)

کل جن کے در پہ نوبت و کوس[1] و نشان تھے
آج اُن کی گور کے بھی نہ قائم نشان تھے
ہمسایۂ سپہر جو عالی مکان تھے
ایسے مٹے کہ گردِ پسِ کاروان تھے
جو شہسوار تھے وہی ریگِ رواں بنے
جن کے چلے دماغ وہ اڑ کر دھواں بنے

اقبال و جاہ و دولت و حشمت کی اصل کیا
کبر و غرور و نخوت و ثروت کی اصل کیا
اس زور و زر کی، قوت و طاقت کی اصل کیا
جو بےوفا ہو اس کی رفاقت کی اصل کیا
گزرا نہ ایک دن کہ ہزاروں گذر گئے
پوچھا نہ یہ کسی نے کدھر تھے کدھر گئے

جس گھر میں گام گام پہ دولت کا ڈھیر تھا
ہر ہر قدم پہ گوہرِ راحت کا ڈھیر تھا
عشرت کا، خوابِ ناز کا، نعمت کا ڈھیر تھا
آخر اُسی مقام پہ حسرت کا ڈھیر تھا
گر شہ نشیں میں صبح ہوئی، شام گور میں
لاکھوں گڑھے میں گر گئے، اپنے ہی زور میں

۱- کوس : ۱- طبل بزرگ ، د- ہل - (فرہنگ عمید، ص۹٦٦)

پست و بلند دھر سے ، ھر دم عیاں ھے گور
جز مشت خاک کچھ نہیں ، سب کا نشاں ھے گور
گر یاد کوئی رکھے تو یادِ جہاں ھے گور
جو لامکاں پہ رھتے تھے اُن کا مکاں ھے گور
باقی آسی کا نام ھے ھر شے ھلاک ھے
کیا زور و زر کہ خاک کی سوغات خاک ھے

یہ جاہ و مال و دولت و اقبال تا کجا
خوبیِ شکل و زشتیِ اعمال تا کجا
صیدِ زبونِ خلق کا پامال تا کجا
میرے ستانے سے کوئی خوش حال تا کجا
آنے کو صبح و شام میں یاں رستخیز[1] ھے
لازم ھے در گذر یہ مقام گریز ھے

ھے عمرِ خضر خیر سے لر ایک دن ٹلا[2]
بغض و حسد ھے قہر ، غنیمت خلا ملا
خواب و خیال ھو گیا آنکھوں سے جو ٹلا
ھ پر مصیبت آج ھے ، اُس پر ھے کل بلا
پندارِ زندگی پہ کوئی بد گماں نہ ھو
ممکن کہ مجھ سے پہلے عدو کا نشاں نہ ھو

۱- رستخیز (رستاخیز) بہ معنی روز حشر و قیامت ۔
(فرھنگ عمید ، ص ۶۲۹)
۲- اس بند کے پہلے اور تیسرے مصرع میں ایطاے خفی ھے - پہلا ' ٹلا ' بہ معنی گزرا اور دوسرا بہ معنی دور ھوا ھے ۔
(مرتب)

اب بھی ڈرو خدا سے جو ہونا تھا ہو چکا
حیلے سے یا دغا سے ، جو ہونا تھا ہو چکا
تقصیر سے خطا سے ، جو ہونا تھا ہو چکا
حق پر رہو ، بلا سے جو ہونا تھا ہو چکا
اللہ سے ڈرو ، جو عدو مصطفٰی کے ہو
کیا سطوتِ یزید کہ بندے خدا کے ہو

کیا لو گے مار کر مجھے اے دشمنانِ دیں
نے بازؤوں میں زور ، نہ زر درمیانِ زیں
اک جان رہ گئی ہے بہت خستہ و حزیں
وہ بعد ازیں نہ ہوگی کہ باقی ہی کچھ نہیں
للہ جانے دو کہ نکل جاؤں گا کہیں
کیا بات ہے جو ٹال دو ، ٹل جاؤں گا کہیں

ٹھیرے لبِ فرات جو شاہنشہِ اُمم
چاروں طرف سے ٹوٹ کے اعدا ہوئے بہم
کہتے تھے تشنگی میں تو یہ کچھ کیا ستم
سیراب ہوتے ہی غضب آوے گا ایک دم
ہے زندگی عزیز تو اب سر اُتار لو
پیاسا ہے مار لو اسے ، پیاسا ہے مار لو

زرعہ[1] نے دستِ چپ کو کیا تیغ سے جدا
اور تیر ابوالحنوق کا ماتھے میں جا کھبا
کاھل نے پاش پاش کلیجے کو کر دیا
ابن انس کا تیر قفا دوز ہو گیا
تھرّا کے شاہ کہتے تھے اے ربِ ذوالجلال
دنیا سنان و تیغ ہے ، تو ہی ہے سب کی ڈھال

غش کھا کے ذوالجناح سے ناچار گر پڑے
شہ کیا گرے کہ حیدر کرار گر پڑے
لغزش سے حق کے احمدِ مختار گر پڑے
حمّالِ عرش فرش پہ اک بار گر پڑے
دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا
قرآن ٹکڑے ہو کے سرِ فرش گر پڑا

۱۔ شہادت امام میں جو لوگ شریک تھے قلق نے آن کے نام اور کام کی تفصیل بیان کی ہے ۔ زرعہ ، ابوالحنوق ، کاھل ، ابن انس ، خولی ، قیس بن اشعث ، اسحاق بن حضرمی ، بحر بن کعب اس واقعے میں شریک تھے ۔ (مرتب)

سینے پہ چڑھ کے خولی نے پھر سر جدا کیا
اور قیس نے قطیفۂ[1] اطہر جدا کیا
اسحاق نے قمیصِ منور جدا کیا
لو ستر فرض بحر نے آ کر جدا کیا
نوکِ سناں پہ فرقِ مبارک چڑھا لیا
نیزے پہ آفتابِ قیامت اٹھا لیا

خیمے کے در پہ زینبِ بےکس تھی انتظار
ناگاہ سامنے سے نظر آیا راہوار
سوچی کہ غش ہوے جو گرے شاہِ ذوالفقار
بولی کہ اے رفیق کہاں ہے ترا سوار؟
کہتی ہوئی نکل پڑی اے بھائی دیکھنا
آئی ہے صدقے ہونے کو ماں جائی دیکھنا

بھیا کدھر ہو، تم پہ یہ بہنا نثار ہے
بیوں کے چین کا تو تمھیں پر مدار ہے
چلایا شمرِ خوک یہ کیسی پکار ہے
دُلدُل سوار تیرا یہ نیزہ سوار ہے
زینب کے ساتھ ساتھ تھا بیوں کا اژدحام
خیمے میں آگ دے کے نکالے حرم تمام

۱- اصل متن میں (ص ۲۸۸) 'فطیفہ' غلط ہے، صحیح 'قطیفہ' ہے، بہ معنی چادر پیچیدہ وغیرہ۔
(فرہنگ عمیہ ص ۹۰۴، غیاث اللغات ص ۳۴۲)

یہ بین زیرِ نیزہ لگی کرنے برملا
کس کا بھروسا اب ہمیں اور کس کا آسرا
پورا ہمارا ہوئے گا کیوں کر لکھا ہوا
سیدانیوں کا غول ہے یہ ننگے سر کھڑا
پابند سخت ہو گئے کھپ کر کہاں مریں
دکھڑا بھی ہم کو کر نہیں آتا ہے، کیا کریں

زہرا رض کا باغ کٹ کے گلوں تک ہوا قلم
سب کا عوض میں جانتی تھی تیرا اک قدم
چادر تو خیر سر پہ تھی لو آنکھ میں تھا نم
میں آنے ہی نہ پائی، یہ کیا ہو گیا ستم
واری، ترے گذرتے ہی دنیا گذر گئی
سب کی بلائیں لے کے یہ رنڈیا نہ مر گئی

سیدانیوں کو لوٹتے پھرتے ہیں بدمعاش
نیزے پہ سر الگ ہے، الگ جسم پاش پاش
سر لے چلے کہیں کو، کہیں ریزہ ریزہ لاش
ہے اور ظلم تازہ کی باقی مگر تلاش
پرسا کہاں پہ بیٹھ کے لوں تیری موت کا
رستہ کوئی بتا دے مجھے میری موت کا

خود دیکھتی ہوں صورتِ جلاد ، کیا کروں
سنتا ہے کون بیوہ کی فریاد ، کیا کروں
میں لٹ گئی ، جہان ہے آباد ، کیا کروں
بھولی تھی تجھ پہ سب کو ، تری یاد کیا کروں
اٹھتّی نہ میں جہان سے اور سب ہوئے ہلاک
مٹّی" ہی میری بھاری ہے ، پڑ جائے مجھ پہ خاک

نیزے پہ ہے حرم کی سپر وا مصیبتا !
زہرا کا پاش پاش جگر وا مصیبتا !
اب جائیے کمک کو کدھر وا مصیبتا !
رفقا کے ساتھ ساتھ ہیں سر وا مصیبتا !
ایسا زمانہ تنگ غریبوں پہ ہوگیا
ہرگز نہیں سوائے سرِ نیزہ کوئی جا

بے یار و بے دیار سے اور یہ دغا ، دریغ
ان دشمنوں میں کوئی نہ تھا آشنا ، دریغ
گم نام گھر نبی و علی کا کیا ، دریغ
ایسا پھرا زمانہ ، ہوا کیا سے کیا ، دریغ
ڈرتے ہیں اب یزید سے سب وا مصیبتا !
انصاف ہو گا دیکھیے کب وا مصیبتا !

آغوشِ فاطمہ کی کمائی ، ہزار حیف
جنگل میں دشمنوں نے لٹائی ، ہزار حیف
دکھیا بہن بھی آنے نہ پائی ، ہزار حیف
لکھا مرے نصیب کا بھائی ، ہزار حیف
اے شمر انس و جان کی تصویر کٹ گئی
سر کاٹتے ہوئے تری چھاتی نہ پھٹ گئی

کنبے قبیلے والے ہو ، خوفِ خدا نہیں
بھائی کسی بہن سے تو ایسا چھٹا نہیں
میری طرح کلیجہ کسی کا پھٹا نہیں
سب جھیل لوں گی جان پہ کیا کچھ سہا نہیں
کچھ رنج لٹنے کا ہے نہ صدمہ لڑائی کا
دے دو خدا کے واسطے سر میرے بھائی کا

مدفن بناؤں گی یہیں تکیہ بناؤں گی
دوں گی سبیل، میوے کے پودے لگاؤں گی
پیاسا جو آئے گا اسے پانی پلاؤں گی
میں چلتے ہاتھ پاؤں یونہی جاں گنواؤں گی
میرا تو ڈھیر ہو گا پیاروں[1] کے ڈھیر پر
بس پڑ رہوں گی مشہدِ غازی دلیر پر

۱- ''پیار'' بر وزن فعول استعمال کیا ہے ورنہ عام طور پر بر وزن قاع آتا ہے - (مرتب)

بانو[1] کی تھی فغاں ، میں کسے منہ دکھاؤں اب
پتھر پڑے وہ کوکھ پہ ، یہ مانگ پر غضب
لوکا لگے عجم میں ، پڑو بھاڑ میں عرب
جینے کا یاں ٹھکانا نہ مرنے کا واں ہے ڈھب
یا شاہ دشمنوں میں نہ عزت گنواؤں گی
دیکھوں گی منہ کسی کا ، نہ اپنا دکھاؤں گی

لونڈی بنوں گی کس کی کہ سردار مر گئے
جا کر بکوں کہاں کہ خریدار مر گئے
اپنے پرائے سارے ہی دلدار مر گئے
اب کس سے کہیے حیدرِ کرار مر گئے
پوتی طمانچے کھاتی ہے ، سر ننگے ہے بہو
اور بیٹیوں کو کھینچتے پھرتے ہیں کو بہ کو

اس دشتِ پر عذاب سے یا شاہ الوداع
ماتم تمہارا ہے مرے ہمراہ الوداع
ہے ساتھ ساتھ صدمۂ جاں کاہ الوداع
پر آس میری ٹوٹ گئی آہ الوداع
جانوں کو لے کے بس نہ کیا سر بھی لے گئے
رنڈسالے[2] کے عوض مری چادر بھی لے گئے

۱- زوجۂ امام حسین علیہ السلام ۔
۲- رنڈ سالا : (ہ) مذکر ۔ وہ لباس جو عورت کو بیوہ ہونے پر شوہر کے ماتم میں پہناتے ہیں ۔ ہندوستان کی رسم ہے

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

فریاد تھی رباب[1] کی لوگو میں لٹ گئی
گھر سے وطن سے اپنے پرائے سے چھٹ گئی
روتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں جی ہی میں گھٹ گئی
شرم و حیا کے ساتھ جہاں سے نہ اٹھ گئی
کیسی ذلیل ہو گئی لٹتے ہی راج ہائے
میری سکینہ[2] پٹتی ہے بن باپ آج ہائے

کھا کر طمانچہ ہول سے صورت ہوئی ہوا
رخسار سرخ ہو گئے اور نیل پڑ گیا
کانوں سے خون بہنے لگا دُر جدا ہوا
کہتی تھی بار بار کہ ابا کو دو بلا
کیا اس نے میرے باپ کو دیکھا نہیں کہیں
فضہ[3] پکاری زور سے ہوں گے یہیں کہیں

(گزشتہ صفحے کا باقی حاشیہ)

کہ جب عورت بیوہ ہو جاتی ہے، تمام کنبے کی عورتیں جمع ہو کر سفید جوڑا پہناتی ہیں اور چوڑیاں وغیرہ جو سہاگ کی چیزیں کہلاتی ہیں ، توڑ ڈالتی ہیں - (نوراللغات ج ۳ ، ص ۸۲)

۱- زوجۂ امام حسین علیہ السلام -

۲- دختر امام حسین علیہ السلام -

۳- کنیز اہل بیت -

کس کو بلاؤں باپ تو جم جم هی آئیں گے
اکبر نہیں جو دوڑ کے تم کو چھڑائیں گے
عباس بھی نہیں جو گلے سے لگائیں گے
واری نہ روؤ چیخ کے ، دونا ستائیں گے
بی بی ہمارے سارے خریدار مر گئے
کس کو پکارتی ہو کہ غم‌خوار مر گئے

راوی کا ھے بیاں کہ حرم سر بہ سر تمام
جب قید ہو کے آئے درِ کوفہ پر تمام
مخلوق کا ھجوم تھا اور نوحہ‌گر تمام
ڈالے سروں میں خاک ، رہے بے خبر تمام
کہتے تھے ھائے ھائے ہمارا حسین ھائے
ھم پیٹنے کو رہ گئے مارا حسین ھائے

زینب نے سن کے شور یہ سجاد[1] سے کہا
ھے ھے انھیں خبر نہ ھوئی وا مصیبتا!
کیا کیا تڑپ رہے ھیں بڑا سانحہ ھوا
بولے اگر یہ دوست تھے ، قاتل وہ کون تھا
یہ دشمنِ قدیم منافق ھیں اے پھپھی
باھم مخالفت میں موافق ھیں اے پھپھی

۱۔ امام زین‌العابدین علیہ السلام ۔

قبرِ نبیؐ میں نقب کیا اور رو دیے
خلفاؓ کے خونِ دل کو پیا اور رو دیے
کوفے میں سر علیؑ کا لیا اور رو دیے
زہرِ اجل حسنؑ کو دیا اور رو دیے
پھر آج کیوں نہ مکر و خداعت کریں گے یہ
تفضیح تا بہ روزِ قیامت کریں گے یہ

یہ ھی تو اھلِ بیت کی نقلیں بناتے ھیں
یہ ھی تو خاکِ آلِ عبا کی اڑاتے ھیں
یہ ھی تو گھر علی کا ستم سے جلاتے ھیں
یہ ھی تو مصطفیٰ کو بھی تہمت لگاتے ھیں
یہ دوست ھیں تو دشمنِ دیں اور کون ھے
یہ ھیں محب تو خصمِ لعین اور کون ھے

بس اے قلق خموش ، نہیں طاقتِ کلام
حق گوئی تیرا کام ھے ، حق تجھ پہ اختتام
جلتے ھیں جو حریف انھیں کی ھے اصل خام
اھلِ حسد سے ڈر نہیں سنتے ھیں خود امام
تو شاعروں میں مستحقِ یاد ھو گیا
عرضی تری قبول ھوئی ، صاد ھو گیا

حصة قصائد

۱۔ قصیدہ در مدح نواب مصطفی خاں شیفتہ

کدھر ہے اے قلمِ واسطی طویل نجاد
کہاں ہے اے منشِ سوختہ کثیر رماد
یہ عزم ہے کہ لکھوں وہ قصیدۂ روشن
کہ جس کو دیکھ کے کھل جائے چشمِ کور سواد
شکستہ خامے سے کرسی نشیں وہ لکھوں حرف
کہ خوش نویسِ قدر کا ہو جس پہ چشم سے صاد
وہ حرف حرف سے پیدا ہو فیضِ روح القدس
عقیم طبع کو دوں جس سے مژدۂ اولاد
سوادِ نقطہ سے وہ سرخوشی ہو موج فزا
نثارِ صفحہ کرے جامِ جم خطِ بغداد
یہ جدولوں پہ ہو انبارِ معنیِ نازک
کہ خطِ جوہری ہو جائے قابلِ ابعاد
یہ رمزہائے متیں سے لطیف طبع ہو خلق
کہ انبساط کا دامن ہو انقباضِ جہاد
یہ حلِ شعر میں ہوں نکتہ‌ہائے لاینحل
کہ نو نیاز طلب آئے شخصِ استعداد
بناؤں معنیِ رنگیں ادا کی اک جنت
کہ خارِ خاطرِ گل چیں ہو، حسرتِ ''شداد''
جو زلفِ حور ہو جاروب کش ہر اک در پر
تو پاسبان ہوں، خوبانِ ''خلخ'' و ''نوشاد''

گریز

قسم ہے حکمتِ یزدانِ اہرمن کُش کی
کہ ہے وہ جزوِ بزرگِ توافق اضداد

قسم ہے حضرتِ مرسل کی پیشوائی کی
کہ گام تنگ ہے پیرو کا جس کے دشتِ معاد

قسم ہے حضرتِ "مریم" کی شرمساری کی
کہ جس کے چھپتے ہی کیا کیا کھلی زبانِ عباد

قسم ہے ایسے مسافر ندیدہ غربت کی
کہ آیا خلد سے دنیا میں بے رفیق و زاد

قسم ہے عجز ادب کوش ان مریدوں کی
کہ جس دیار میں ہو عشق صاحبِ ارشاد

قسم ہے شیخ کے دعوائے خرقِ عادت کی
ثبوت جس کا نہیں جز عمامۂ پر باد

قسم ہے رنگِ گنہگار کی دمِ پرسش
اور اس پہ تیغ کشیدہ ہو رو برو جلاد

قسم ہے شہرتِ شہرِ بہشت منظر کی
کہ جس میں کوچہ بہ کوچہ اجاڑ ہے آباد

قسم ہے بادِ مخالف کی وقتِ غرقِ حجاز
کہ لائے سب کی زبانوں پہ ہرچہ بادا باد

قسم ہے اس نگہِ سادہ پر شرارت کی
بنی حلاوتِ جاں جس سے تلخیِ بیداد

قسم ہے اس نمِ افسردہ و برشتہ کی
سرشتگی سے بنا جس کی یہ دلِ ناشاد

قسم ہے قصہ بڑھانے کی ''ابنِ مریم'' کے
فلک پہ لے گیا اہلِ زمیں کا شور و فساد
قسم ہے جرأتِ رستم کی وقتِ قتلِ پسر
دیا ہے جس کے عوض آسماں نے چاہِ شغاد
قسم ہے مشکلِ طفلِ سبق گرفتہ کی
کہ جس کو یاد نہ ہو جز طپانچۂ اُستاد
قسم ہے منصبِ نا اہل و قدرِ دوراں کی
اور اُس سے اہلِ ہنر کو ہو چشمِ استمداد
قسم ہے ضبطِ دلِ نا شکیبِ عاشق کی
کہ زیرِ تیغ نہ دیویں اجازتِ فریاد
قسم ہے چارۂ تکلیف و درد افزا کی
کہ عین زخم فروشی ہے چارۂ فصّاد
قسم ہے تلخیِ شیریں فریبِ الفت کی
کہ جس سے سیر نہیں روحِ خسرو[۱] و فرہاد
قسم ہے یاسِ اسیری و بغض حاکم کی
نہ جستجوے رہائی، نہ قید کی میعاد
قسم ہے قلقلِ میناے مے کی گر زاہد
دو قل سنے تو کبھی چار قل نہ رکھے یاد
قسم ہے بے خودیِ اشکِ نا شکیبا کی
کہ جس کا جادۂ خشکی ہے دجلۂ بغداد
قسم ہے اپنی زباں کی کہ غرقِ خوں ہو جائے
جولب تک آئے کبھی بھول کر بھی حرفِ مراد

---

۱ - اصل متن (ص ۲۹۵) میں 'خسروِ فرہاد' صحیح نہیں، 'خسرو و فرہاد' تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

میں بوالفضول نہیں اور زیادہ سنج نہیں
کہ میرے دیں میں عبادت ہے قتلِ ''ابنِ زیاد''[1]
ابھی جو منھ سے نکالوں میں حرفِ جاں پرور
تو روح زار بنے دشت ہائے خاک و باد
جہاں میں روشنیِ طبع کا کروں اظہار
وہاں کے ذروں میں ہو مہر، اصغر الافراد
جو مدعی ہے وہ آئے پڑھے قصیدے کو
کیا ہے ہم نے حکم داورِ سخن بنیاد
جنابِ شیفتہ[2] ''نواب خواجہ تاشِ کلام''
کہ جس کے وصف میں مطلع ہے یہ طلسمِ داد
شمارِ وصف میں گر تیرے خرچ ہوں اعداد
تو مختصر نظر آویں ''الوف'' جائے ''احاد''
عیارِ جوہرِ برہاں کو تیرا ذہن ''محک''
سلامتیِ عقل کو [ہے[3]] تیرا علم اسناد
جو فرقِ کوہ پہ ڈالے وقارِ حلم کو تو
تو حشر تک بھی نہ ہووے تمایز ''ابعاد''[4]

---

۱ - عبیداللہ ابن زیاد ابن ابیہ - (مرتب)

۲ - نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ شاگرد مومن، رئیس جہانگیر آباد (بلند شہر) وفات ۱۲۸٦ھ - (مرتب)

۳ - مصرع ناموزوں اصل متن (ص ۲۹٦) میں ہے، اس لیے 'عقل کو' کے بعد 'ہے' اضافہ کیا اور 'عقل' کو 'متحرک' مان کر مصرع موزوں ہوا - (مرتب)

۴ - ابعاد: ع - (بہ فتح همزہ) جمع بُعد (بہ ضم) بہ معنی دور - ابعاد ثلاثہ: ابعاد سہ گانہ، در اصطلاح هندسہ عبارت است از طول عرض، عمق - [فرہنگ عمید ص ۸۳]

بٹھایا چرخِ نہم عرشیوں نے کرسی[1] پر
کہ تاکہ آئے نظر تیرا عالمِ میلاد
رہے گا کیوں کہ سلامت خزانۂ قارون
کلیدِ بابِ کرم اور تیرا دستِ راد[2]
دمِ سخا تو اگر جوش میں آلٹ دے فرش
تو زر گرفتہ ہو تا عرش جرمِ خاک و باد
ترے کرم کو تلاش آز و حرص کی یاں تک
کہ جیبِ صبر ہے اور تیرا دستِ استبداد
زر و گہر کو قدم میں بھی جا نہیں ملتی
کہ ضرفِ کیسۂ مفلس ہے تیرا دستِ جواد
کہیں ہو پورِ جہاں خانہ زاد ہے تیرا
کہ تو عروسِ جہاں کا ہے نوجوان داماد

ق

جو تو فشردہ جہاں معرکے میں ہو جائے
اور آئے پاؤں کے نیچے غبارِ پوچ نہاد
تو یہ غبار کو تمکین ترے قدم سے ہو
ذرا نہ ہلنے دے ہرگز دبا کے دامنِ باد

۱۔ کرسی : ع۔ (مونث) ، ۱ ۔ چھوٹا تخت جس کو فارسی میں صندلی کہتے ہیں ۔ ۲ ۔ خدائے تعالٰی کا ملک اس کی قدرت اور تدبیر ، آٹھواں آسماں......ناسخ :

او ملک صورت نہ ہو کیوں عرش پر تیرا دماغ
چرخ ہفتم تیری کرسی نے کیا ہے بام کو

۲ ۔ راد : بہ معنی بخشندہ ۔

جہادِ دیں کے لیے تیرا دست جہدِ عمود[1]
نمازِ خانۂ کعبہ کو تیری ذات عماد[2]
ترے عدو کو جو پستی سین یک نظر دیکھیں
تو سر کے بل ہی ہوں تحت الثریٰ میں سبع[3] شداد
ورم جگر میں گر اعدا کے ہو حسد سے عیاں
کرے آبِ تیغ سے الماس ریزہ گھس کے ضماد

وصف تیغ

جو تیری تیغ نکل آئے فرقِ دشمن پر
تو جرمِ نالہ سے ہو لخت لخت صد فریاد
صبا جو لگ کے نکل جائے اُس کے دامن سے
تو باغ و راغ سترده ہو مثلِ نقشِ مراد

---

۱ - عمود : (ع - ستون خانہ) مذکر ۱ - ستون - ۲ - (علم هندسه) وہ خط مستقیم جو دوسرے خط مستقیم پر قائم ہو کر دو زاویہ متصلہ برابر کے پیدا کرے - ۳ - گرز - [نوراللغات ج ۳ ص ۵۲۲]

۲ - عماد : (ع - مذکر) ستون اور اونچے مکان - یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے -

۳ - سبع : ع - (بہ فتح سین و سکون با) هفت - شدید - ع، (بہ فتح شین) سخت ، قوی ، جمع شداد غالباً سبع شداد سے مراد سبعہ سیارہ هین - (مرتب)

تعریفِ اسپ

ترا سمند جو کاوے پہ آئے میداں میں
تو آسماں کو غبارہ بنائے لطمۂ باد
جب آیا ذہن میں قدرت کے اُس کا پیکرِ نقش
تھی اپنی جودتِ فطرت پہ غش دمِ ایجاد
نہ پوچھ اُس کے قدم کو دمِ عناں تازی
زمیں پہ قہر ہے اور آسماں پر بیداد
صہیل[1] سم ہے اگر استعارتاً دم رعد
تو سایہ برق سے ہے کچھ کنایتاً ایراد[2]

توصیفِ فیل

جو تیرا فیل دمِ معرکہ ہوا میں بھرے
طبق زمین کا اُڑ جائے مثلِ کاغذِ باد
وہ دل فریب ہیں خرطوم اور دو دانت سپید
کہ اک الف کے دو پہلو میں ہیں دو دامنِ صاد
قیاس یہ بھی غلط ہے جو غور سے دیکھا
تو جوے شیر دو لایا ہے طور سے فرہاد

۱۔ صہیل : بہ فتح اول و یائے معروف آواز اسپ، ازمنتخب (غیاث اللغات ص ۲۶۶ مطبع منشی گلاب سنگھ لکھنؤ مع چراغ ہدایت)

۲۔ ایراد : (ع۔ بالکسر ۔ وارد کرنا ۔ لانا) مذکر ۔ اعتراض (کرنا ، ہونا کے ساتھ) ۔ (نوراللغات ج ص ۳۵۴)

وقاے[1] قہر میں اُس کے دو گوش کی حرکت
لگائے کشتیِ گردوں کے گر طپانچۂ باد
پلک کے مارتے یوں زیر خاک جا بیٹھے
کہ جس طرح تہہِ دریا حبابِ بے بنیاد

اظہار حال

تو دل لگا کے سنے تو میں اپنے جی کی کہوں
وگرنہ مجھ کو نہیں شوقِ نالہ و فریاد
یہ امر سچ ہے نہیں اس میں شاعری کہ ترا
نہ جاہ میں کوئی ثانی نہ جود میں ہمزاد
فلک جو تیرے مقاصد میں ہو بطی السیر[2]
تو پائمال کرے اُس کو جوشِ صرصرِ عاد
صبا جو تیری خوشی کے خلاف چل نکلے
تو بیمِ خوف سے رہوے حصار بندِ جہاد
جو ابر میکدے پر آئے اور نہ تو جائے
تو برق خون ہو اور رعد نالۂ ناشاد
یہ سب صحیح و بجا ہے نہیں خلاف کہ تو
زمینیوں کا مآب[3] آسمانیوں کا معاد[4]

۱- وقا (بالکسر والفتح) آنچہ بدآں چیزے نگاہ دارند و سپر
(شمس اللغات ج ۲ ، ص ۳۳۵)
۲- سست رفتار ۔ ۳- مآب : جاے آرام اور قرار گاہ ۔
(شمس اللغات ج ۲ ، ص ۲۰۸)
۴- معاد : (بالفتح) جائے باز گشتن و عالم آخرت و جاے
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرماویں)

مگر **قلق** سا سخن سنج ، مدح گو تیرا
اٹھائے چرخِ بریں کے اور اس قدر بیداد
ارم نہیں ہے یہ دنیائے چند روزہ کچھ
عوض میں جس کو ہو ہر سانس حسرت شداد[1]
ظریف طبع ہے ، شاعر ہے ، مردِ خوش خو ہے
بلا کے اس کو سوے محفلِ ابد آباد
رہائی چرخ کی دے گوشمال سے اس کو
کہ تیرا حلقہ بگوش اور پھر نہ ہو آزاد
غزل بھی لکھتا ہوں بہرِ تمیزِ طرزِ سخن
کہ اہلِ ذوق کو ہوئے مرا ترانہ یاد

غزل

نہ دے فریبِ اثر مجھ کو نالۂ ناشاد
کہ یار حیلہ طلب ، بخت بد ، فلک بیداد
شبِ فراق سے کچھ صبحِ وصل دور نہ تھی
مگر ہے حشر ، دمِ شوق جلوے کی میعاد

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)
بازداشتن و رفتن و در اصطلاح متصوفہ اسمائے کلی اللہی را گویند و اسمائے کلی کونی را نامند و آمدن سالک از راہ اسمائے کلی کونی بود۔
(شمس اللغات ج ۲ ، ص ۲۴۸)

۱ ۔ شداد : (بالفتح) نام بادشاہے کہ دعوی خدائی کردہ بہشت در دنیا راست کرد ، آخر دراں مجالِ آمدن نیافت ۔
(شمس اللغات ج ۲ ص ۱۱)

نہ پوچھ چرخ سے تقریبِ حشر و نشر نہ پوچھ
کہ میری خاک کو کرنا ہے عاقبت برباد

میں تجھ سے شکوہ تغافل کا کس طرح سے کروں
جو غیر دل سے ترے جائے، آئے میری یاد

یہاں تو سر کو جھکائے بنے گی مستوں کو
کہ فرشِ کعبہ کبھی بتکدے کی تھی بنیاد

بلائے بازوے قاتل مری شہادت ہے
کہ بعدِ قتل بھی بر خود غضب رہا جلاد

تجھے بھی روئے بنے، بات بات پر ظالم
تری زبان ہو اور کاش ہو مری روداد

شبِ فراق میں یک بار مجھ پہ ٹوٹ پڑا
خدا ہی جانے کہ تھی آسماں پہ کیا افتاد

کہاں یہ مطرب و مے اور عنایتِ ساقی
سہی کہ خلد میں بھی ہوگا سایۂ شمشاد

قلق زباں ہے جو منہ میں تو حالِ دل کے لیے
پر اب خموش ہو اور کر دعا کہ ربِ عباد

دعائیہ

رہے جہان میں جب تک علاقہ و پیوند
مہمِ چاکر و شہ چاہیں باہم استمداد

جو جاں سپاریِ خدمت سے شاہ ہو خوش دل
تو قدر دانیِ منصب سے ہو ملازم شاد

جلو میں دولت و اقبال تیرے ہو ہر وقت
کنیزِ خاص ہے یہ، وہ غلامِ خانہ زاد

۲۔ قصیدہ در مدح لالہ نرائن داس

لبوں تک آ کے پھری حیف آہِ بے تاثیر
غضب ہوا فلکِ بدگماں ہے دامن گیر
جو چشمِ غور سے دیکھا تو طشتِ پر خوں ہے
وہ آفتاب سمجھتا تھا جس کو جامِ شیر
زمیں پہ جادہ سلاسل فلک پہ کاہ کشاں
کدھر کو آفتِ زنداں سے جائے چھٹ[۱] کے اسیر
فریب خوردۂ دوراں ہوں مجھ سے پوچھیے قدر
کہ کیا ہے آبِ خضر کس کو کہتے ہیں اکسیر
میں وہ شہیدِ وفا ہوں کہ خاک سے میری
اٹھے گا یاد میں قاتل کی نعرۂ تکبیر
کہیں میں ہی ہوں نشانہ مرادِ دوراں کا
کہ سانس سانس سے لگتا ہے بر میں تیر پہ تیر
خصوصیت مری رنجش کو ایک شے کب ہے
میں حرفِ رنج ہوں گویا کہ در حدِ تنکیر
ہوائے دھر وہ ناساز ہے کہ غنچہ بنے
قلم سے نیم شگفتہ ہو گر گلِ تصویر
ہر ایک معنیِ رنگیں سے خونِ دل ٹپکا
مری زباں ہے مرے قتل کے لیے شمشیر
دیا کمال مجھے چرخ نے بدیں تقریب
علی الدوام رہے تا زوال دامن گیر

۱۔ اصل متن (ص ۳۰۲) میں 'جھپٹ' ہے۔

عجب نہیں کہ بنے آبلہ تنورِ فلک
کہ ہے تراوشِ دل سے سرشتہ میرا خمیر
مرے مزار سے دامن بچا کے چل اے حشر
کہ اک طرف کو پڑی ہے یہ خاکِ دامن گیر
کیا ہے میں نے ہی بالا رویِ شعر میں پست
ہوا ہوں آپ ہی صیادِ چرخ کا نخچیر
مری بہار خزاں ہے وہ نخلِ ماتم ہوں
کہ جس کو دیکھ کے بھر آئے چشمِ ابرِ مطیر
نہ کیوں کر شعلہ دبے میری خاک سے پسِ مرگ
دم فسردہ میں خفیہ ہے مایہائے سعیر

گریز

شبِ گزشتہ مری طبع میری بالیں پر
کھڑی تھی سکتے میں اور زیرِ لب تھی یہ تقریر
اگر زمیں پہ فلک ہے تو عرش پر میں ہوں
وہ میرا مثل نہ رفعت میں نے علو میں نظیر
جو خبثِ چرخ بنا میرا اخترِ قسمت
تو میری خانہ خرابی سپہر کی تقدیر
مگر ستاتا ہے وہ اور میں چپ ہوں جان لیا
کہ گویا نالۂ دل میں ذرا نہیں تاثیر
ابھی جو قہر میں آؤں تو عرش سے ہو ندا
تو نوجوان ہے بس بس یہ پیر ہے بے پیر
کہو تو لاؤں کہاں سے دل و جگر ایسے
کہ خوں ہو ضبط سے اور جور کا نہ ہووے اخیر
وفا کرے گا کہاں تک معاشِ غم پر دل
رہے گی تا بہ کجا غرقِ خون جانِ اسیر

وہ ڈھونڈے کوئی ملجا کہ جس کی ہیبت سے
اس اپنے مکر سے باز آئے چرخِ پر تزویر
میں سن کے چونک پڑا اور کہا کہ اے ناکام
لبوں پہ بارِ دگر پھر نہ لائیو یہ نفیر
جو یہ ہی ڈھنگ ہیں تیرے تو ہے سلام مرا
کہ خاتمہ ہوا ہمت کا حوصلے کا اخیر
نہ عندلیبِ قفس ہوں کہ آب و دانہ پر
کروں ترانۂ دل کش کو بادکوبِ صفیر
نہ شمع ہوں کہ پھروں بزم بزم میں روتا
مآلِ کار بنوں خاکِ دیدۂ تاثیر
نہ وہ مژہ ہوں کہ شوخی و بے حیائی سے
ہر ایک گوشۂ دل میں ہوں خارِ دامن گیر
نہ رازِ عاشقِ ناکامِ مدعا ہوں میں
کہ بزم بزم میں ہوں صرفِ بیہدہ تقریر
یہ دور دور ہوا و ہوس سے ہوں کوسوں
کہ تشنہ لب رہوں جنت میں فرقِ جوے شیر
اگرچہ خاک پہ آبِ حیات بھی برسے
کبھی بھی گوشۂ داماں مرا نہ ہو نم گیر
ہزار سنبلہ بن جائیں گو بروجِ فلک
میں ایک دانہ نہ مانگوں اگرچہ ہوں میں فقیر
عبث ہے قحطِ رجالی میں آبرو کھونی
کہ مال مال ہیں چشمِ ہنر میں آپ حقیر
جواہراتِ عقولی نہ دوں کسی کو کہ چرخ
فریبِ قدر میں چھینے ہے گوہرِ توقیر

بنا بھی گر مین مگس سفرۂ زمانہ کا
تو گوشِ قدر مین طنین ہے صداے صفیر
کبھی میں آبِ ہوس سے نہ ہوں گا تر دامن
کہ موجِ حلۂ خارا ہے مجھ کو نقشِ حصیر
یہ ترّہات سنے جب کہ طبع نے میری
کہا کہ حیف تری عقل کیا ہوئی دلگیر
چلا ہوا تھا جہاں نقشۂ شکوہ ترا
مٹایا چرخِ بریں نے وہ عالمِ تصویر
کنویں میں حسن گرا عشق دشت کو بھاگا
نہ وہ خدنگِ مژہ اور نہ وہ دلِ نخچیر
ملا ہے خاک میں وہ کاروانِ یوسف خیز
کہ نورِ چشمِ حقیقت سدا رہے گا بصیر
نہ اب وہ خندۂ پر گل نہ عطر ریز وہ رخ
نسیم لائے گی کس جا سے مایۂ تعطیر
نہ وہ مکانِ مشرف نہ وہ مکینِ شریف
نہ دست گیریِ درماندگان نہ پاے سریر
وہاں کی بزم ہوئی پائمالِ رزمِ قضا
چراغ داغ ہے اور فرش گردشِ تقدیر
فلک نے اُن کو دیے حلہ ہاے استبرق
کہ جن کے واسطے تھا چرمِ خام تازہ حریر
جہاں تھے فرش پہ انبارِ گل، خس و خاشاک
اب اس مکاں میں ہے صد تودہ آہنی زنجیر
جہاں کا بادشہِ بزم نغمۂ تر تھا
ولیِ عہد وہاں کا ہے نالۂ شب گیر

جس آستانے پہ تعمیرِ خلد تھی قرباں
اب اُس کے دوش پہ ویرانگی ہوئی جا گیر

وہ قصرِ نور ہوا وقفِ غار و غارتِ غور
کہ جس کی خاک میں تھی ایک کشیف' گرد اکسیر

وہ لوگ جنبشِ مژگاں تھی جن کو رنجِ سفر
برہنہ پا ہیں مسافت میں پاؤں میں زنجیر

ڈبائے چرخِ تنک آب نے وہ دریا دل
کہ برسوں خاک پہ روئے گا جن کی ابرِ مطیر

وہ بزم درہم و برہم ہوئی کہ خون ہے دل کا
رخِ طرب نے ملا ہے غبار جاے عبیر

وہ زلف ہاے معنبر ہوئی ہیں رزقِ زمیں
رہے گی خاک سے تا حشر، مشک کی تبخیر

اب اُس جناب پہ ہے چار بالشِ جہّال
کہ ذرّہ ذرّہ جہاں کا تھا عقلِ کل کا مشیر

تھی جس حریم میں سرگرمِ درس عقل وہاں
نہ گوشِ رمز شنووا ہے نے لبِ تفسیر

اُنھیں کی نعش کو کھچوایا شوم قسمت نے
جو پرِ مور میں کھینچے تھے چرخ کی تصویر

سخن وروں کے ہیں ماتم میں لفظ و معنی خوں
ہر اک کشش ہے ہر اک حرف کی لیے شمشیر

ہر ایک سطر ہے صد پیچ و تاب میں درہم
سیاہ خامہ ہے ہر صفحہ نقش ہے دل گیر

اصل متن (ص ۴۰۳) میں 'کسیف' ہے - (مرتب)

هر ایک حرف گرہ بن گیا سینے میں
وفورِ رنج سے در خود گرفتہ ہے تقریر

گریز

میں روؤں تجھ سے کہاں تک وبالِ گردوں کو
نہ آہ میں ہے اثر اور نہ ضبط میں تاثیر
گیا وہ وقت کہ ہر شام صبحِ جنت تھی
غنیمت اُس کو سمجھ اب بھی اور نہ کر تاخیر
چل اُس جناب پہ ہے جو کہ قبلۂ اُمید
درِ کریم سے زیبا نہیں ہے عارِ فقیر
تو داغِ دل کو دکھا جاکے اُس کی حضرت میں
کہ جس کا ذرۂ عتبہ ہے ماہِ پر تنویر
سخیِ ابن سخی لالۂ نرائن داس
عطا معاش و کرم خو امیر ابنِ امیر

مطلع

یہ سنتے ہی میں اُٹھا اور لکھا یہ مطلعِ صاف
کیا ہے بیتِ مقدس کو ہند میں تعمیر
حسابِ فیض میں ہے تیرے ذرہ مہرِ منیر
جو کوئی جمع کرے پائے ایسی کسرِ کثیر
وہ تو نے مایۂ دریا و کاں لٹایا ہے
کہ آفتاب ہے خوں آب آب ابرِ مطیر
لبِ سوال کے ہلتے ہی سیر ہے سائل
عجب نہیں ہے جو شاید خرید لیویں فقیر

اگر ہے مایۂ دولت کا بحر و کاں میں گزار
تو بحر و کاں کو ترے جود سے نہیں ہے گزیر
سخا میں تو نے یہ دریاے زر بہایا ہے
کنارِ سیل کا ہے مہر ذرۂ نم گیر
اُدھار پیتے ہیں مے رند تیری دولت پر
مغاں پلاتا ہے اور بس سے ہے بہت دل گیر

ق

کہاں تلک میں تری گنج بخشیاں لکھوں
مٹائے حاتم و قاروں کے جاہ کی تشہیر
نہیں خزانۂ قاروں میں اب بجز حسرت
لحد میں خفتہ ہے حاتم کی جاے پر تشویر
جو سوے چرخ ہوا تیرا دستِ داد بلند
فروتنی سے ہوا آب آب ابرِ مطیر
تری غنا سے ہوا کائنات کو وہ قرار
نہیں ہے اب حرکت سے لبِ عنا[1] خو گیر
نہیں ہے تیرا اگر روز صرفِ بالائی
پھر آسماں پہ ہے مامورِ کار کس کا دبیر
میں تیرے خلق کی کیا عطر سائیاں لکھوں
ہر اک قدم پہ ہے گلزارِ خطۂ کشمیر
تری صفائیِ باطن وہ نورِ روشن ہے
کہ تیرے دل کا سویدا ہے مہرِ پر تنویر

---

۱ - رنج ، سختی ، تعب ، (فرہنگ عمید ص ۸۳۳)

ترے زمانے کے ہیں روز و شب صباحِ خلد
ہر ایک جاں ہے مبشّر ہر ایک دل ہے بشیر
نہیں ہے کوئی پریشاں مگر دلِ دشمن
نہیں ہے رنج میں کوئی پہ حاسدِ بے پیر

ق

گرہ کشا ہے جبینِ کرم تری ایسی
کہ رشک سے ہے خراشیدہ ناخنِ تدبیر
وہ کونسی ہے گرہ جو نہیں کھلی لیکن
ہے تیرا بندِ قبا میرا عقدۂ تدبیر
تری نشاط میں کیوں کر نہیں ضیافتِ عام
کہ ہم مزاج ہیں اس عہد میں صغیر و کبیر
یوں ہی جو بزم سے تیری بلند ہوگی نشاط
تو کیا عجب ہے جواں ہووے پھر بھی چرخِ پیر
نہ ہو قدر جو ہوا خواہ تیری الفت کی
تو آب و آتش و خاک[1] ہوں نہ اتصال پذیر
عدو کی نیستی ہستی نہ کس طرح سے ہو ایک
کہ خود قضا ہے خلا و ملا میں تیری مشیر
نماز میری پرستش ہے تیری صورت کی
قبول ہے مجھے فتوائے مفتیِ تکفیر
طبیعتوں سے اٹھے ضد تری محبت میں
شراب پیتے ہیں صوفی بجائے آبِ شعیر

۱- اصل متن (ص۳۰۷) میں 'خاک' اسی طرح ہے ، مصرع میں 'خاک' نہیں آتا ، 'خکِ' آتا ہے ۔

ق

ترے عدو کو چڑھایا زمانے نے اتنا
کہ اُس کے تحتِ ثریٰ میں تھا آسماں کا مصیر
مگر یہ شعبدہ تمہیدِ بازگشت کا تھا
گرایا سر کے بل انجامِ کار مثلِ تیر
وہ زہرِ مرگ میں ہے جوہرِ گدازشِ جاں
بنا ہے جس سے ترا مدعیِ بے توقیر
ترے حسود کی دولت میں گر ترقی آئے
اور اُس کی حرص سے بڑھ جائے اُس کا زرِّ کثیر
نیت سے اُس کی ہے لیکن حساب اتنا تنگ
رقم کی جائے پہ ہو جائیں گے صفر جا گیر

تعریف فیل

جو تیرے پیلِ سبک سیر کا میں لکھوں وصف
تو پائے خامہ کا ہو ماہ کی جبیں پہ مسیر
وہ کوہِ طور ہے اور تو ہے موسیِ ثانی
تو گردِ راہ تری سرمہ ہے برائے بصیر
تو اپنے عہد کا خسرو ہے کوہکن خرطوم
کہ دونو پہلو میں بہتی ہے اُس کے جوئے شیر
جو دانت غور سے دیکھے دو دستِ عذرا ہیں
شبِ فراقِ سیہ کے ہوئے ہیں دامن گیر
جو یہ زمیں پہ نہ ہووے تو زلزلہ آ جائے
کہ زورِ آب ہے ہو وقفِ سیل مثلِ حصیر

لحد سے مردۂ صد سالہ چونک اُٹھتے ہیں
کہ شورِ صور ہے البتہ پاؤں کی زنجیر
سپہر ہے ناصیہ پہ اُس کے اس صفائی سے
کہ مہرِ چرخ ہے غرقابِ چشمۂ تنویر
قدم سے اُس کے دماغِ زمیں ہے عرش پہ اب
کہ پائے بوس ہیں ہر گام چار بدرِ منیر
قیاس میں نہیں آتی سبک روی اُس کی
کہ ابتدائے قدم میں ہے منزلوں کا اخیر

تعریف اسپ

ترا سمندِ صبا سیر برق ہے گویا
کہ تازیانہ ہے اس کو دمِ عرق تقطیر
نہ ابر و باد رہیں پائمال اس سے کیوں
کہ اُس کے سایے سے کھنچتی ہے برق کی تصویر
نظر غلط ہے منجم کی کہکشاں کب ہے
غبارِ راہ کی ہے اُس کے چرخ پر تحریر
خیال گرد رہ اس کی تو سایہ عنقا ہے
بس اُس کا مثل ہے بے مثل ، بے نظیر نظیر
محلِ دید ہے رکھتا قدم ہے نظروں پر
مقامِ فکر ہے عقل و خرد ہے اس کا مسیر[1]

۱- چاے سیر

توصیف تیغ

میں تیری تیغ کے اوصاف کس طرح لکھوں
زبانِ خامہ بریدہ ہے کیا کروں تحریر
صبا جو لگ کے چلے مرگِ ناگہاں بن جائے
بجھی ہے زہرِ اجل میں مگر تری شمشیر
جو اس کی آب میں آ جائے جوشِ طغیانی
تو موج موج سے ہو پائے مرگ میں زنجیر
جو یادِ تیغ میں چارآئنہ عدو پہنے
ہر آئنے میں عیاں نیم زج[1] ہوں دو تصویر
ہے تیری دست گرفتہ عدو کی افسرِ فرق
حشم تیول[2] ہے اس کا تو فتح ہے جاگیر
دلِ حسود میں ہے یہ عصائے موسائی
کہ ایک لقمہ ہے اس اژدھا کا جمِّ غفیر

قطعہ

مدیح جیسا ہوں میں ویسا ہی ہے تو ممدوح
کہ دو جہاں کی ہیں وابستہ ہم میں داروگیر
ترے قدم کا سہارا نہ ہو زمیں لرزے
جو میں نہ ہوں تو پھرے کاہے کو یہ چرخِ شریر

---

۱ - زج : ع ، (به ضم زا و تشدید جیم) آهن نوک تیز که در ته نیزه نصب کنند ، و به معنی پیکان - زجاج و بکسر زا جمع ، در فارسی به معنی تیر کوتاه گفته شده - زچ هم گفته اند ۔
(فرهنگ عمید ص ٦٥٦)

۲ - تیول : ت ، (به ضم تا و یا) ملک و آب و زمینے که سابقاً بادشاه به کسے وا گذار می کرد که از درآمد آں زندگانی کند ۔
(فرهنگ عمید ص ۳۳٦)

اگر چہ صاف زبانی ہے نذر کیا کیجے
پر ارمغاں ہے غنی کے لیے دعاے فقیر

معما بہ اسم نرائن داس ممدوح

سرِ ہراس نہ رکھ قلب ہو دلِ دنیا
کہ نقدِ نام ہے تیرا عیارِ عالم گیر

دعا

رہے یہ عالمِ اسباب جب تلک یعنی
نیازِ فقر سے ہو نازِ جاہ کی تشہیر
قیودِ فکر نہ وا چاہیں تا دلِ منعم
اسیر ہو دلِ مفلس میں رنجِ عالم گیر
نگاہِ یار میں جب تک ہو صف شکن غمزہ
ہوس شکست اٹھائے کہ عشق رہوے نفیر
رہے درونۂ عاشق میں تا فشارِ غم
اخیر گوشۂ داماں پہ لائے دل کا عصیر
نثار آپ سے پروانہ تا کرے خود کو
اور اس بہانے سے سر ہووے شمع کی گل گیر
فلک کی سمت رہیں وا دو چشم نرگس کی
اور اس کو خوابِ تخیل سے تا کریں تعبیر
قلق ثنا گرِ ہشیارَ نغمہ آرا ہو
سیاہ مست رہے تیری بزمِ خلد نظیر

۳ ۔ قصیدہ در مدح حیات خاں گرداور

شب رفتہ میں مری طبع کو تھا نظم پہ ناز
لفظ الہام تھا ہر ایک، تو معنی اعجاز
فکر گر طبع پہ غش تھا تو رسائی اس پر
میں فدا ذہن پہ اور ذہن پہ جودت جاں باز

تھا ہر اک حرف زباں پر مری حسن بلقیس
اور ہر معنی نازک تھا سلیماں انداز
ہر ارادہ تھا مرے دل میں عجب دور اندیش
ہر ادا تھی مری نظروں میں غضب صبر گداز

کون سی تھی وہ ادا جو کہ نہ تھی وقف مکیں
کون انداز تھا جاں پر کہ نہ تھا صرف نیاز
جو کھنچی صفحے پہ مد کھنچنے لگے ابرو سے
جو لکھا حرف ہوا تنکے جوان طناز

نقطے نقطے سے اناالشرق کا تھا جوش و خروش
گریۂ خامہ سے تھا صفحے پہ صد خندۂ ناز
ایسا کچھ بندھ گیا شیرازہ سخن سنجی کا
کہ مرا کلبۂ تاریک تھا شہر شیراز

گریز

سچ تو یہ ہے کہ طبیعت نے کیا حیلۂ نظم
ورنہ لاریب مرا خامہ تھا اک وحی طراز
یعنی الطاف شیم خلق اتم جان جہاں
جس کے مخیم سے ہوا بلدۂ میرٹھ ممتاز

نام کا اُس کے ہے وہ طرفہ معما کہ نہ پوچھ
دونو اجزا سے ہے اک اُس کے نمایاں اعجاز
یعنی تصحیف[1]، و 'ترادف' ہے فقط جاں سے اُسے
اس لیے تار ہے ہستیِ ابد سے دم ساز
اُس کی مدحت کو لکھا ہے بصد اندازِ غریب
جس کو پڑھتا ہوا آیا ہوں سوے حجلۂ ناز

مطلع ثانی

گرچہ عالم کے لیے عید ہے صد مایۂ ناز
پر ترے خوان پہ خود عید ہے مہمانِ نیاز
بس کہ تقریب ہوئی تیری ہم آغوشی کی
اہلِ عالم کا یہی حیلہ ہوا پیش نماز
عید گہ میں ہے ترا ایسا خوش انداز قیام
جیسے سروِ لبِ جو باغ میں سب سے ممتاز
طوفِ در تیرا ہے احرام مرادِ دل و جاں
کیا عجب ہند میں آ جائیں اگر اہلِ حجاز
عام مہمانی تری بزم میں ہے روزِ عید
زاہد و رند کی ہم کاسگی ہے آج جواز
اللہ اللہ رے ترا نورِ صفاے باطن
بزمِ عرفاں میں تری سب کا نمایاں ہے راز

---

۱ - اسم ممدوح حیات خان است فلہٰذا بہ اعتبار تصحیف از 'خان' 'جان' خواستہ و باز از جان بہ اختیار ترادف حیات پیدا کردہ حیات خان محصل نمود - (منقول از حاشیہ اصل متن ص ۳۱۰)

تیری پیشانی پہ وہ کھلتا ہے نورِ عرفاں
کہ صفاے احدی کا ہے تو ہی آئنہ ساز
حرفِ منصور تو کہہ، دعوی فرعون سے نہ ڈر
تا کجا پاسِ شریعت کہ نہیں میں غماز
تجھ کو رعشہ نہیں یہ جودتِ ہمت سے تری
ہر رگ و پے سے ہے تحریک کہ دے دے انداز
تیرے ہر روز میں ہنگامۂ صد عید ہے صرف
جشن ہاے سلف اب چرخ کرے گا احراز
ضبط ہر چند کیا تیری محبّت نہ چھپی
نغمہ عریاں ہی رہا گو ہے پسِ پردۂ ساز
لب پہ ہیں خلق کے تیرے وہ سخن ہاے طویل
کہ صفاتِ ارمی اُس کا ہے جزوِ ایجاز
کس طرح سے ترا افسانۂ بخشش نہ سنوں
کہ مرے بخت کو درکار ہے اک خوابِ ناز
غور سے دیکھ کہ ہے گورِ عدو کا ساماں
عہد میں تیرے جو باقی ہے نشیب اور فراز
جس طرح سے ترے اقبال کی دولت ہمدم
اس طرح سے ترے اعدا کی اجل ہے دم ساز
تیرے حاسد کو اگر مادرِ ایّام جنے
حشر تک رہوے تاَلم سے گرفتارِ کراز[1]

۱۔ اصل متن (ص ۳۱۱) کے حاشیے پر معنی درد زہ لکھے ہیں۔
فرہنگ عمیدہ (ص ۹۳۳) میں کراز بہ فتح کے معنی ہیں:
"تبے کہ ہنگام زائیدن بہ زنان عارض می شود۔"

کیا بھلی ہے دلِ دو رو (کذا) میں محبت تیری
جیسے آیات سے قرآن کی آرائشِ کاز[1]
تیرے ہر عزم کے تائیدِ الٰہی ہمراہ
تیری ہر رائے کے نہ(۹) چرخ شریک و انباز

۱- اصل متن (ص ۳۱۱) کے حاشیے پر 'کاز' کے معنی 'گرجا' لکھے ہیں جو مفہوم شعر کے خلاف ہیں۔ دوسرے لغات میں معانی مختصراً لکھے ہیں البتہ برہان قاطع (ص ۲۸۹) میں معانی تفصیلی لکھے ہیں ملاحظہ ہوں :-

'کاز' به سکون زاے نقطه دار خانه را گویند از چوب و نے و علف مانند خانه که مزارعان و پالیزبانان بر کنار زراعت و پالیز سازند و بعضے جاے را گفته اند که در کوه و بیابان در زیر زمین به جهت گوسفند و خر و گاو وغیره بکنند و آن را به عربی 'مغاره' خوانند - و بعضے گویند صومعه باشد که بر سر کوه ساخته باشند و به این معنی با کاف فارسی هم آمده است و اصح این است - و صومعه در عربی خلوت خانۀ نصاریٰ را گویند که سرِ آن را بلند و باریک سازند- و آلتے باشد که باغبانان درخت را بداں پیرائش دهند یعنی شاخ هائے زیادتی آن را به آن ببرند و درخت صنوبرِ صغار را نیز گویند و به این معنی با زاے فارسی هم آمده است و سیلی و قفا زدن و گردنی را نیزگفته اند و شاخ هائے باشند ازدرخت که صیادانِ کهنه و لته و چیز ها را بر آن آویزند و بریک طرف دام زمین نصب کنند ، تا جانوران ازاں رمیده به جانب دام و دانه آیند - و به معنی باد پیچ هم آمده است و آن ریسمانے باشد که در ایام عید و نوروز از شاخِ درخت و امثال آن آویزند وزنان و کودکان برآں نشینند و در هوا آیندو روند-

منتظم تیری اگر رائے رزیں یاں پہ نہ ہو
تو نہ پاویں کبھی یاں اربع عناصر انداز

ق

دل میں کچھ تو ہی سمجھ لے مین کہوں یا نہ کہوں
لب پہ کیا لاؤں کہ صد خوں ہے مرا حرفِ راز
اتنا تقدیر نے ہی مجھ کو کیا کوتہ دست
حق نے بخشش میں کیا جتنا تجھے دست دراز
قطرۂ دل میں تمنا سی تمنا ہے بھری
گر شناگر[1] نہ ہو تو، تو میں ڈبو دوں یہ جہاز[2]
در پہ جمشید ترے کاسہ بکف اک درویش
اور سکندر ترے خدام کا اک آئنہ ساز
کھینچ کر کیوں کہ نہ لاتی کششِ دل تجھ تک
کہ ٹپکتا ہے تری وضع سے میرا انداز
دست زر ریز ترا، طبع گہر خیز مری
فرق اتنا ہی ہے لیکن وہ حقیقت یہ مجاز
کیا عجب ہے جو ہو لغزش تری مدحت میں مجھے
ہے یہ نغمہ سبب وجد عراق و اہواز

۱- تیراک -

۲- اصل متن (ص ۳۱۲) میں 'حجاز' ہے، اس کے معنی یہاں منطبق نہیں اس لیے ' جہاز ' تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

تعریف اسپ

سایہ کوڑے کا اگر اسپ پہ تیرے پھر جائے
اثر سم سے بنے چرخ بریں سینۂ باز
چوکڑی چرخ یہ بھولے کہ گرے پاؤں میں
گردم جست ، سر معرکہ تو دے آواز
حشر اٹھے گردِ سے جولاں پہ یہ آجائے اگر
پھر کسی کو نظر آوے نہ کچھ انجام ، آغاز
تری شمشیر عدو کی ہے مگر کچھ حامی
خود بہ خود آپ کو کرتا ہے وہ دو چند انداز
ایسا ہے ہجو عدو سے ترے خامہ بدنام
جیسے ہوں مدح سے تیری مین جہاں میں ممتاز
گرم بازاری حساد رہے یوں ہی سرد
روز و شب گو کہ ملے جائے جہاں روغن قاز

ق

تیری بخشش سے زمانہ یہ ہوا مستغنی
نہ کسی سر مین ہوس ہے ، نہ کسی دل میں آز
اب کوئی پاؤں کسی کے نہیں پڑتا لیکن
یا سر دشمن بد خو ، کہ سر زلف دراز
چل گیا خاطر عالم پہ فریب الفت
ہوگیا کون و مکاں صید ترا بے تگ و تاز
نہ چھپی پر نہ چھپی تیری محبت آخر
بت پرستی تھی صنم خانے میں کعبے میں نماز

یہ جو کچھ مدح لکھی ہے تو محبت کے سبب
نہ مجھے حرص کسی شے کی ، نہ دولت کی آز
تنگیِ بخت سے خوش ہوں کہ صلے کو لے کر
کیجے مقدارِ گرو ، کیوں کرم بے انداز
کیوں کہ تقدیر سے امید بھی میں رکھوں
کہ بنی نوع کو جب میرے دیا سیر[1] و پیاز
تجھ سے نسبت ہے جو حاتم کو تو جزو کل کی
وہ عرب کے لیے فیاض تھا ، تو خلق نواز
تو نے دولت کا جو در کھول رکھا ہے شب و روز
ہوگیا غم میں بخیلوں کا درِ رزق ، فراز
کیوں کہ ہو میرا سخن تیرے سخن پر سرسبز
ہے محالات سے جب سحر کا ہونا اعجاز
نکتہ در تو بھی ہے ،کیا ھدیہ ترا میرے نکات
نالۂ زاغ کے سنتا نہیں ، بلبل آواز

دعا

جب تلک روزِ نعم فاقہ کش و مفلس کو
سوے نعمت ہو نظر شوق میں با حرص و آز
چرخ نا اھلوں کو تا خلعتِ زیبا بخشے
شاھراھوں میں لٹے مفت متاعِ بزّاز

۱- لہسن -

عید کا جشن ہو جب تک کہ ہر اک دل کی نوید
جلِ[1] نو پہنے گدا ، شاہ قصب[2] ہائے طراز
تا کہ ہر سالہ رہے عید کا چرچا گھر گھر
دلِ ہر شخص ہو درخورد فراغ ، عشرت ساز
انجمن ہو تری آباد مے و ساقی سے
قلقِ شوخ طبیعت ہو وہاں نغمہ نواز

۱- جل : (بالضم) پوشش ستور و بسیارے از ہر چیز -
(شمس اللغات ج ۱ ص ۲۵۴)

۲- قصب : ع (بہ فتح قاف و صاد) نے و ہر گیاہے کہ ساقۂ آن مانند نے میان تہی باشد و نیز بہ معنی استخوان دست یا پا و مروارید آبدار و نوعے پارچۂ ظریف کہ در قدیم از کتان می بافتہ اند۔
(فرہنگ عمید ص ۹۰۱)

۴۔ قصیدہ در مدح مشفق فرخندہ سیر حافظ محمد اکبر ضلع دار نہر گنگ

صباحِ عید ہے اور بادہائے رنگا رنگ
ہر اک کسی کو نہ کیوں کر ہو مے کدے کی امنگ

حکیم آئے ادھر سے اٹھائے جامِ جم
ادھر سے مست چلے لے کے عود و بربط و چنگ

اُچکتا جاتا ہے کیا تیز تیز شیخِ حریص
اُچھلتا چلتا ہے کیا جلد جلد زاھدِ لنگ

فلک سے ابر اٹھا اور غبارِ غم بیٹھا
کشادہ دل ہے جہاں توبہ پر ہے، عرصہ تنگ

اب اھلِ میکدہ ھرگز سیاہ کار نہیں
کہ شیشے شیشے سے ہے جلوہ ریز حسنِ فرنگ

شراب و ساقی و مطرب ہیں جمع خاطر سب
فلک کو اڑ گئی لے کر بلندیِ آھنگ

تمام گردشِ گیتی ھوئی ہے صرفِ جام
کہ سر پہ بے حرکت آسماں کھڑا ہے دنگ

کچھ ایسے ابر اٹھے جھوم جھوم کعبے سے
کہ زھرہ چرخ سے اتری بغل میں لے کر چنگ

حکیم نکتہ کشا مغلطے[1] میں ہے مے سے
کہ آتش آب ھوئی، یا ہے آب آتش رنگ

۱۔ مغلطہ : ع (بہ فتح میم و لام و طا) سخنے کہ کسے را بہ غلط بیندازد، مغالیط جمع۔ (فرھنگ عمید ص ۱۱۱۷)

کس اعتدال سے اٹھتی ہے موج ساغر میں
نہ چابکیِ شتاب اور نہ کاہلیِ درنگ
غریب جوہرِ صہبا ہے بے کثافتِ غش[1]
عجیب جام ہے آئینہ بے کدورتِ زنگ
جواں ہیں بادہ گسار اور رسیدہ بنتِ رز
عجب نہیں کہ اٹھے درمیاں سے پردۂ ننگ
حکیم تنگ ہیں رندوں کی فیلسوفی سے
کہ گام گام پہ ہے فرشِ دانش و فرہنگ
ہر ایک منتظرِ حکم و نقد توبہ بہ کف
بھرا ہے مے کدہ، 'میر بساط' ہے اب تنگ
رسیدنی ہے حرم گاہِ ساقی و صہبا
شنیدنی ہے حریفانِ بادہ کش کی ترنگ
لبوں پہ نغمہ ہے اور ساغروں میں صہبا ہے
بغل میں ساقی ہے اور محتسب ہے صد فرسنگ[2]
دلِ غمیں کی تواضع ہے ختم میکدے پر
کہ پائے بوس ہے مے اور خمیدہ پشتِ چنگ
کشادہ ہے درِ دل اور بستہ دستِ فلک
کشیدہ ہے سر مطرب، بلند ہے آہنگ
اڑی ہے گردِ کدورت زمیں سے اس درجے
خمیدہ پشت ہوا آسمانِ نیلی رنگ

۱- غش: ع - (بہ کسر عین و تشدید شین) خیانت، حقد کینہ، آلودگی، و چیزے کم بہا کہ در چیز گراں بہا مخلوط کنند (فرہنگ عمید ص ۸۴۶)

۲- اصل متن (ص ۳۱۴) میں 'فرہنگ' غلط ہے 'فرسنگ' تصحیح قیاسی ہے - (مرتب)

تمام صرف ہوئی چیں جو موجِ ساغر میں
نہ خم ہے زلف میں ، نے جبہ بخل میں آژنگ
خمیرِ مایۂ جنت جو یہ ہی ہو ، تو ہو
کہ خاکِ میکدہ میں ہیں ہزارہا نیرنگ
عجب نہیں کہ ملائک بھی ہوئیں تر دامن
کہ جوشِ عالمِ آب اور فلک ہے چقرِ تنگ
تو احتشام کو مے خانے کے نہ مست سے پوچھ
فلک پیالہ ہے اک اور زمین ہے نارنگ
رہے گی تا بہ کجا توبہ سدِ راہِ دیر
چلے گا تا بہ کجا ساتھ عذرِ لنگ
ستم ہے تازہ جوانانِ پارسا پر اب
کہ دل میں جوش مے اور آنکھ میں حیا و ننگ
عجب ضعیف مزاجوں میں تقویت آئی
کہ توڑتی ہے بطِ مے کی صوت کیدِ[1] پلنگ

۱۔ اصل متن (ص ۳۱۵) میں 'کیر' ہے جس کا مفہوم واضح نہیں ۔ 'کید' تصحیح قیاسی ہے ۔ شمس اللغات جلد دوم ص ۱۸۷ میں اس کے یہ معنی لکھے ہیں :
کید : (بالفتح) بد اندیشیدن و قے و درماں کردن و بانگ کردن کلاغ و دویدن آں و حائض شدن زن و کارزار نمودن ۔ و در فارسی نام رائے کنوج باشد کہ معاصر سکندر ذوالقرنین بودہ ، و دختر او را اسکندر بہ حبالۂ نکاح در آوردہ ۔ حکیم فردوسی فرماید :
یکے شاہ بد ہند را نام کید
نہ کردے جز از دانش و رائے صید

کسی سے کیوں کہ ہو تمکینِ دیر سنجیدہ
فلک ہے رطلِ گراں کے مقابل اک پاسنگ
غزل پڑھوں میں اب ایسی کہ چشمِ ساقی سے
کنایہ خیز زیادہ ہو اور سیر آہنگ

غزل

زمیں سے جھگڑا ہے اے دل تو آسماں سے جنگ
خراب ہیں ترے اے خانماں خراب یہ ڈھنگ
نظیر گلشنِ مے خانہ اور سبزۂ خلد
حریف مستیِ پیمانہ اور سیر[۱] و بنگ[۲]
یہ کم نگاہیِ پنہاں ہے کس کی دشنہ گزار
بہت ہی غور طلب ہے جو دل کا روزنِ تنگ
فلک کے ناز آٹھانے پڑے شبِ ہجراں
نہ دل میں طاقتِ نالہ نہ نالے میں آہنگ
تری نگہ پہ چڑھا ہے عدو جو جھکتی ہے
وگرنہ تجھ سے ستمگر میں یہ حیا و ننگ
گرائے دیتا ہوں عشق و ہوس کو نظروں سے
آٹھائے لیتا ہوں اس عرصہ گہ سے صلح و جنگ
زہے وہ خورد کہ لقمہ جگر ہو خوں ہو آب
زہے وہ خواب کہ بستر ہو خاک بالش سنگ

۱- سیر : لہسن - (نوراللغات ج ۳ ص ۳۳۸)
۲- بنگ : بھنگ - (نوراللغات ج ۱ ص ٦٨٢)

ق

قلق یہ ڈھنگ ہے نا آشنائیوں کا
غیور ہو کے نہ کر خونِ **دانش** و فرہنگ
غزل سرائی میں کیوں دل کو خون کرتا ہے
کسی کی مدح طرازی کا کرتو اب آہنگ
اگرچہ مدح **طرازی** میں اب ہے ذلتِ فقر
ولیک اُن کے لیے جو حریص ہیں بے ننگ
نہ تجھ کو خواہش دولت نہ اُس کو ہے نخوت
ہزار شکر کہ ممدوح یار ہے ہم رنگ
عروجِ نشۂ ہستی محمدِ اکبر
فروغِ جوہرِ اول ذخیرۂ فرہنگ

مطلع ثانی

محل جاہ کا تیرے فلک ہو جب ہم سنگ
جو ہو برابرِ اورنگ سایۂ اورنگ
کشیدہ سر ہو اگر گرمیِ **غضب** تیری
تو کوہ آب ہو اور موجِ آب تختۂ سنگ

ق

وہ کیا ہے جو کہ تری شان پر نثار نہیں
وہ کون ہے جو تری وضع پر نہیں ہے دنگ
تہی ہلال ہوا بہرِ زینتِ تہِ نعل
ہے چرخِ کج شدہ کو پائے بوس کا آہنگ
زمیں وقار میں اب آسماں کو کیا سمجھے
کہ ہے وہ تیری گراں سائگی سے ہم پاسنگ

ق

نہ پوچھ قدرتِ دستِ سخا کو تو اپنے
نہ بحر ہی ہے برابر نہ کان ہے ہم سنگ
کہ نقشِ کف ہے ترا آفتابِ کیمیا ساز
اور انگلیوں کا تری عکس شعبہ ہاے گنگ
وہ تو نے مایۂ دریا کیا ہے گردا باد
کہ قطرہ قطرہ نظر آیا صورتِ دل تنگ
اٹھائے خلق سے تیرے بہار نے صدمے
گرائے نرگسِ فتاں سے اشکِ رنگ برنگ
لگائے کان ہے بخشش پہ تیری کانوں کو
بچھائے بحر ہے دامن کو اپنے صد فرسنگ
چمن میں گر تری شیریں کلامیاں چھیڑوں
حبابِ شہد نظر آئیں باغباں کو شرنگ[1]
ترے سخن سے زبانِ خدا ہے ہم نغمہ
تری زباں سے کلام خدا ہے ہم آہنگ
تو سادگی ہی کو لے دے عدو کو آرائش
غلافِ کعبہ ہے یہ وہ ہے پارۂ ارژنگ[2]

---

۱ - شرنگ : ۱ ، (بہ فتح شین و را) زہر ، ہر چیز تلخ ، کبست ، حنظل - (فرہنگ عمید ص ۷۶۹)
۲ - ارژنگ : ۱ (بہ فتح اول و سوم) نام کتاب 'مانی' کہ دارای اشکال و تصاویر گونا گوں بودہ ، و آں چہ را کہ دارای نقش و نگار زیبا باشد بہ آں تشبیہ می کنند - ارثنگ و ارسنگ و ارتنگ ہم گفتہ شدہ و نیز ارژنگ یا ارتنگ در داستان ہاے شاہ نامہ نام پہلوانے و نام دیوے ہم بودہ - (فرہنگ عمید ص ۱۰۹)

عدو ہے خوش کہ برابر ہے حلم و قہر ترا
پہ بے خبر ہے کہ ہو جائے گا اسے ادھرنگ[1]

اگر ترے دلِ روشن سے حسن لیوے فیض
کرے عذار کو تعلیم کاکلِ شب رنگ

ہوا ہے تازہ و تر خانہ خانہ کشتِ امید
کہ کوچے کوچے نکالی ہے تو نے نہرِ گنگ

اگر مزاج میں آئے ترے حمایتِ صلح
خمیدہ ہو سرِ فتنہ شکستہ پائے جنگ

جو تو کمند کشائی پہ آئے میداں میں
تو ہو حرون[2] فلک پائے بند پالاھنگ[3]

۱۔ اصل متن میں (ص ۳۱۷) اورنگ ہے جس کے معنی فرھنگ عمید (ص ۲۰۷) میں تخت پادشاھی ، سریر ، عقل اور دانش فر اور زیبائی ، جاہ و جلال اور آب و رنگ کے لکھے ھیں - یہاں یہ معانی منطبق نہیں ھوتے - یہاں کتابت کی غلطی ہے - بہ قول محترمی سیذ عابد علی عابد صاحب 'ادھرنگ' ہے یعنی فالج کا مرض جس سے مریض کا آدھا جسم رہ جاتا ہے- یہ تصحیح قیاسی درست ہے (مرتب)

نوٹ حاشیہ ۱: ادرنک (س مذکر) راجہ هریش چندر کا هوائی شہر - (جامع اللغات ج ۱ ص ۱۵۲) ؟

۲- حرون : ع (بہ فتح حا وضم را) توسن سرکش ، اسب یا استر کہ اطاعت نہ کند - (فرھنگ عمید ص ۵۰۰)

۳- پالاھنگ (پالہنگ) : (ف - بہ فتح سوم و چہارم و نون پنجم و ششم) شکار بند ، پالا ، کوتل گھوڑا ، آھنگ ، قصد کرنا ، کھینچنا ، مؤنث ، باگ ڈور ، وہ رسی جو گھوڑے کی لگام میں باندھتے ھیں - (فرھنگ عمید ص ۳۱۱ ، نوراللغات ج ۲ ص ۱۵)

تعریفِ اسپ

تو عرش جاہ اب اہلِ زمیں میں کیوں کہ نہ ہو
کہ زیرِ ران ہے ترے آسماں شتاب[1] کرنگ[2]

جو اس کے نعل سے کوئی بنائے آئینہ
تو کیا مجال کہ پھر پاس آئے گردِ زنگ

قدم یہ رکھتا ہے اب عرصہ گہِ وہم سے دور
کہ طولِ کون تو اس کے ہوا ہے صرف تنگ

فقط یہ وہم ہے گل گوں جو اس کو کہتے ہیں
کہ ہے محال جو پیکر ہو اس کی قیدیِ رنگ

عرق جو آئے دم کاوہ قطرے قطرے سے
رواں ہو دجلۂ سیماب ہے یہ شوخ و شنگ

سموں کی مجھ کو سبک خیزیوں سے ہے حیرت
یہ طرفہ ہے کہ کرے ہم رہیِ آتش سنگ

یہ گرد آئے اگر دائرے کے جوں پرکار
محال نقطے پہ ہو احتمالِ وقف و درنگ

قدم اگر یہ رکھے کوہ پر دمِ گرمی
نظر سے دیکھ لے اعمیٰ تحرکِ رگِ سنگ

۱۔ شتاپ اصل متن (ص ۳۱۷) غلط ، 'شتاب' تصحیح قیاسی ۔ (مرتب)

۲۔ کرنگ : فرہنگ عمید ص ۹۳۸ میں ہے کہ گہرا زرد رنگ یا حنائی رنگ گھوڑا ۔ اس کے مختلف تلفظ ہیں : کرند ، کورنگ کران ، کرن ۔

تعریف شمشیر

نہ پوچھ تیغ کی جولانیوں کا کچھ تو حال
یہ اژدھائے سیہ سر ہے آسماں آھنگ
جو جا چھپے کوئی زخمی پہاڑ میں اس کا
تو اس کے سہم سے ہو کوھسار مرداسنگ[1]
پڑے جو اُس کی سمندر[2] میں آتش لمعاں
تو بچہ ھائے سمندر دے مادۂ خرچنگ[3]
جولونِ[4] اطلس افلاک سے یہ ھووے دوچار
زمین خون میں ڈوبے کٹے یہ اُس کا رنگ
نہیں ہے تیغ مگر ہے عصائے موسائی
کہ لقمہ اس کا ہے اک اژدھائے توپ و تفنگ
جہاں میں اس لیے آتی ھیں چار فصل جدا
کہ کاٹتی ہے یہ یک دست بیشتر چورنگ[5]

۱- مرداسنگ ، مردارسنگ : (ف مذکر) ایک قسم کی دوا کا نام جو پتھر کی مانند ھوتی ہے - (نوراللغات ج ۴ ص ۳۳٦)

۲- سمندر : ۱ (بہ فتح سین و میم و دال) جانوریست شبیہ چلپاسہ کہ در آب و خشکی ھر دو زندگی می کند و ھرگاہ بہ آتش برسد مادہ ای از خود افراز می کند کہ آتش را خاموش می سازد و ازیں رو گفتہ اند جانورے است کہ در آتش نمی سوزد - (فرھنگ عمید ص ۷۲۹)

۳- خرچنگ : کیکڑا ، سرطان - (نوراللغات ج ۲ ص ٦۳۳)

۴- لون : بہ معنی رنگ (فرھنگ عمید ص ۱۰۲۲)

۵- چورنگ کاٹنا : تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کرنا - تلوار کے ایک ھاتھ میں چار ٹکڑے کرنا - (عزیزاللغات ص ۲۹۳ از عزیز لکھنوی)

دعا

دُعا کو ہاتھ اُٹھاتا ہوں عاقبت میں بھی
کہ اس زمین مین عرفی کا قافیہ ہے تنگ

رہینِ کوتہیِ صرف تا ہو دستِ فراخ
اسیرِ طولِ امل جب تلک کہ ہو دلِ تنگ

غنی کی تا کہ ہو طینت میں ذلتِ درویش
گدا کے دل مین رہے جامِ جم سے جب تک ننگ

فلک نگینَ ہو اور نقش ہو ترا اقبال
خنک ہو عیش میں تو اور قلق ہو گرم آہنگ

۵- قصیدہ[1] در مدحِ نواب کلبِ علی خاں والیِ ریاست رام پور

تیغِ خورشید حمائل کیے بیٹھا ہے حمل[2]
خیمہ گاہ دے[3] و بہمن[4] میں پڑی ہے ہلچل
دوشِ صرصر پہ اڑا دیکھ کے قزاقِ خزاں
شاہِ گل عرصۂ گلشن میں جو آیا ہے نکل
ہوگیا وتنا[5] ہی مفقود سوادِ دیدہ
چشمِ شب جتنی تکبر میں ہوئی تھی احول

۱- اس قصیدے کا عنوان مطبوعہ کلیات میں 'قصیدۂ بہاریہ' ہے- نواب کلب علی خاں کا انتقال مارچ ۱۸۸۷ع میں ہوا (مرتب)

۲- حمل : ع (بہ فتح حا و میم) برہ ، و نامِ برجِ اول از دوازدہ برج فلکی - (فرہنگ عمید ص ۵۰۹)

۳- دے : ۱- (بہ فتح دال) ماہ دھم از سال خورشیدی ، ماہ اول زمستان - (فرہنگ عمید ص ۶۰۲)

۴- بہمن : ۱- (بہ فتح با و میم) ماہ یازدھم از سال خورشیدی و نام روز دوم از ہر ماہ خورشیدی - (فرہنگ عمید ص ۲۹۲)

۵- وتنا : (بالکسر دھلی) - اُتنا مذکر کے لیے -
(نور اللغات ج ۴ ص ۴۷۷)

جبهٔ روز سے وتنے ہے مفصل دیکھے
جتنے مجمل تھے سنے معنیِ ما قل و دل
کاکلِ شب کی درازی ہوئی چینِ ابرو
طرۂ روز سے جب کھل گیا بے ساختہ بل
روز نے ہاتھ بڑھایا جو مثالِ مجنوں
لیلیِ شب نے بہ صد غصہ سمیٹا آنچل
شبِ سودا زدہ کو جتنا ہوا استفراغ
ہوگیا روز کے وہ مایۂ تحلیل کا بدل
للہ الحمد کہ اب وقتِ بہار آ پہنچا
دستِ ہر ذرہ میں ہے خلد کا نقشہ مجمل
ہو گیا مے کدے میں بادہ گساروں کا ہجوم
آ گیا جوشِ بہاراں سے دماغوں میں خلل
فتنہ نرگس کی نگاہوں سے لگا اٹھنے پھر
خنجرِ بید کے پھر تیز نظر آئے پھل
لالہ و گل کے یہ ہے دورِ تسلسل کی دلیل
کہ نہایت بھی ہے اس فصل کی مثلِ اول
یوں نسیمِ سحر اٹھکھیلیاں کرتی نکلی
صحنِ مےخانہ میں جوں مست کوئی جائے مچل
سایۂ خار رگِ گل پہ اگر پڑ جائے
خون یہ امڈے کہ ہوجائے لبالب جل تھل
کیا نمو بیل میں ہے تاک کی اللہ اللہ
ہیں تماشائی کی ہر تارِ نگہ پر سو بل
لڑکھڑائی ہوئی پھرتی ہے صبا مستانہ
رکھتے رکھتے ہی قدم جائے ہے ہر گل سے پھسل

گویا سبزهائِ زدهٔ رنگِ زمرد ہے غبار
دامنِ بادِ سحر تک ہے دو خوابہ[1] مخمل
جوششِ رنگ ہے اب یوں رگِ گل سے ظاہر
موج زن خون ہو جیسے دم فصدِ اکحل[2]
دشت در دشت اُڑے پھرتے ہیں صد ہا گلشن
شاخِ ہر آہو میں پھوٹ آئی ہیں لاکھوں کوپل
کیسا ہی زاہدِ خود بیں رکھے بچ بچ کے قدم
ڈوب جائے گل و لالہ میں مگر تا بہ بغل
شادیِ گل میں یہ بیدار ہے نرگس شب و روز
فرصتِ چشم زدن پائے تو سوئے دو پل
چشمِ مےخوار کے لڑتے ہی کچھ آتا ہے یہ جوش
بنتِ رز پردۂ انگور سے آتی ہے نکل
گلِ سرمستِ خودیِ حسن میں ہے کیا خوددار
بلبلِ وقفِ فنا عشق میں ہے کیا بیکل
دیدِ گلشن کو اُڑے پھرتے ہیں کیا کیا مہ و مہر
بس کہ چھایا ہوا ہر وقت رہے ہے بادل
دیکھے گو بھول کے صوفی بچہ سنبل کی طرف
بن لگائے لگے آنکھوں میں یکایک کاجل

۱۔ مخمل دو خوابہ : (ف) مذکر ۔ ایک خاص قسم کی مخمل جس کی دونوں طرفیں یکساں ہوتی ہیں ۔ (نوراللغات ج ۴ ص ۳۲۰)

۲۔ اکحل : ع (بہ فتح ہمزہ و حا) چشم سرمہ کشیدہ و مردے کہ مژگاں سیاہ دارد و نام رگے است در ذراع کہ آں را فصد می کنند ، بہ فارسی رگ چہار اندام می گویند ۔
(فرہنگ عمید ص ۱۷۱)

برهمن زادوں نے ماتھے پہ لگایا ہے غبار
یعنی اب سطحِ زمیں ہو گیا لوحِ صندل
ہے مگر تیشہ بہ کف کوہ کنِ خوں آلود
کب ہے یہ لالۂ خوں بار سرِ سطحِ جبل
خطبہ خوانانِ چمن میں ہے عجب کج بحثی
طرحِ ریزیِ سخن میں ہوئے سامانِ جدل
گل ہنسے دیتے ہیں اور غنچے کھلے پڑتے ہیں
ہے نیا بلبلِ نالاں کا کچھ اندازِ غزل
اب طلسماتِ جہاں دیکھ کے جاتی ہے عقل
آتی ہے بیضۂ بلبل سے نواہاے غزل
کھل گئیں نرگسِ بیمار کی آنکھیں یعنی
معتدل رات ہے اس فصل میں اور دن اعدل
غنچوں نے لال کیا پیٹ کے منھ کو اپنے
سوسنِ تیز زباں کے گیا کینا لب سے نکل
منتظرِ شیشہ ہے استادہ چلے جلدی جام
کہ صبا آتے ہی ہاتھوں سے گئی یار نکل
کس قدر چٹکیاں لیتی ہے خوشی جس تس کی
گرتے ہی جام میں مے پڑتی ہے اک بار اچھل
شیخ ثابت قدم آتا ہے سوے میکدہ یوں
ہوش کہتا ہے تو آہستہ مرے پیچھے چل
توڑ کر سطحِ زمیں کو گئے شعبے باہر
پھوڑ کر سقفِ فلک کو گئے اشجار نکل
یہ نمو ہے کہ خجل قاتلِ اشجار ہوا
زخم تیشہ نہیں کھلتا کہ کہاں تھا اول

بس کہ اب شانہ صنوبر کا ہے شعبہ انگیز
عقدۂ طرۂ طرار ہے مالاینحل

بس کہ ہر شئے میں رطوبت ہے بھری کیا ڈر ہے
شیشۂ مے مرے ہاتھوں سے اگر جائے نکل

لاکھ جلوے ہوئے اک فیضِ ہوا میں پیدا
شجرِ طور ہے جلتی ہے سپند منقل

سادگی سے ہی گرے سب کی نظر سے پر اب
اطلسِ چرخ نے پھولوں سے بھری جیب و بغل

در و دیوار سے بت خانے کی برسے ہے نور
جلوہ آرائے صفا بس کہ ہوئے لات و ہبل

جوشِ فوارہ سے ہیں رونگٹے سبزے کے کھڑے
کوہا (کذا) دیکھے تو رگِ سنگ سے خوں آئے ابل

بے خودی حسنِ خداداد نے بخشی سب کو
لیتی ہے بوسے اب آپ اپنے لبوں کے جدول

سایۂ زلف ہے اب تازگیوں سے سنبل
کاسۂ آب ہے طغیانیوں میں اب چنبل[1]

گلِ نسریں پہ جو پڑ جائے ہے بھولے سے پاؤں
چشمۂ شیر امنڈ آئے ہے سانتھل[2] سانتھل

قطرہ قطرہ درِ غلطاں ہے مگر شبنم کا
کہ نظر پڑتی ہے جس قطرے پہ جاتا ہے پھسل

۱۔ نام دریا۔
۲۔ سانتھل : (ہ) اسم مؤنث (ہندو) ران ، زانو ، جانگھ۔
(فرہنگ آصفیہ ج ۳ ص ۱۶)

گر کوئی سنگِ شرر خیز تراشے معمار
ہر خطِ کف پہ گل و لالہ وہیں آئیں نکل
اب زمیں قاسمِ مقسومِ فلک ہے یعنی
چرخ پر چرنے لگے سبزۂ تر جدی[1] و حمل[2]
صبح کا خیمہ ہے کس درجہ فراخی منزل
شام کا چار حدِ کون سے باہر ہے محل
چھوڑتا ہے کوئی گل ریز اگر آتش باز
نخلۂ طور بھی جاتا ہے طراوت سے جل
کان و گلشن میں اک انداز ہوا ہے پیدا
کہ ہے گلچیں سے سدا جوہری کو رد و بدل
بلبلوں کی ہے زباں پر ہمہ نغماتِ زبور
سر بسر ہر ورقِ گل ہے کتابِ منزل
اب سفینوں پہ اڑے پھرتے ہیں وہ شعلہ عذار
آب میں مچھلیاں تک عکس سے جاتی ہیں جل
سوے گلشن دف و نے لے کے چلے پیر و جواں
بے خودی کہتی ہے اے شیخ کہیں تو بھی چل

۱- جدی : ع - (اسم مذکر ، لغوی معنی بکرا ، بزغالہ) اصطلاحی وہ آسمانی برج جو بزغالے کی شکل کا ہے جسے ہندی میں مکر کہتے ہیں اور نیز ایک سیارے کا نام جو قطب شمالی کے قریب ہے - (فرہنگ آصفیہ ج ۲ ص ۳۹)

۲- حمل : آسمان کا پہلا برج جو مینڈھے کی شکل کا ہے - 'میکھ' - (فرہنگ آصفیہ ج ۲ ص ۱۷۰)

پند آموز کا معلوم مداواے جنوں
کہ فلاطوں تو اڑا پھرتا ہے جنگل جنگل
جھوکے جھوکے میں صبا کے ہے ترقیِ وجد
زاہد اب بادہ گساری میں ہوا ضربِ مثل

ق

انبساط اب وہ ہوا میں ہے سمائی آ کر
کہ ہر اک عقدے کے ہے ساتھ لگا ناخنِ حل
خود بہ خود غنچہ نمط مہرۂ ناقوس کھلا
دانۂ سبح یہ چٹکے کہ پڑا شیخ اچھل
شعلۂ شمع سے ٹپکے ہے تری ہاے دماغ
آب و آتش کا اس ایام میں ہے ایک محل
کر کے معشوق سے پیماں کو پشیماں ہوں میں
یعنی ہر عقدے کو اس وقت میں لازم ہے حل
سبحۂ شیخ پہ گلدستے کا ہے سب کو گماں
گلِ صد برگ جو ہر دانے سے آیا ہے نکل
شیشۂ سرو سے چمکے ہے شرابِ ریحاں
نغمۂ دل کشِ ساقی ہے نواے صلصل[1]
خوانِ رحمت ہے کشیدہ دہ و وادی میں اب
گل ہے مہماں خرابے سے لگا تا بہ محل

۱- صلصل : (بہ ضم ہر دو صاد) فاختہ -
(فرہنگ عمید ص ۸۰۰)

چیں زدہ کوئی نہیں اب پہ نہالیِ وصال
تنگ کوئی نہیں ہے اب مگر عاشق کی بغل
گرمیِ حشر میں تر دامنی ہے آسائش
توبہ اب جام سے صوفی بھی سمجھتا ہے زلل
لا تو اے ساقیِ بدمست سبو عید ہے آج
الوداعِ رمضاں ہے کہ میں پڑھتا ہوں غزل
پہلے ارمان سے اے جانِ جفا کش نہ نکل
ہر نفس لب پہ یہ کیا ہوش میں آ مجھ سے نہ چل
اس گراں باریِ حسرت کا ٹھکانا کیا ہے
گور تک لایا بہ صد عجز مجھے دوشِ اجل
پوچھتے کیا ہو محبت نہیں تازہ آزار
جو دم نزع ہے عالم تھا وہی روزِ ازل
جادہ پاؤں میں لپٹتا ہے سلاسل بن کر
کس طرف چلتی ہے اے وحشتِ دل آگے چل
زہے وہ دل جو اک انداز ہی میں خوں ہوجائے
ہائے وہ جان جو اک بات ہی میں جائے نکل
داغ پیشانیِ زاہد پہ سیہ سا ہے سیہ
بحرِ رحمت کو کیا چاہتا ہے مستعمل
مجھ سے الجھیں گے وہ سلجھیں گے عدو سے جتنے
رشتۂ جان میں رہنے دو پڑے بل پر بل
کیا بلا صحبتِ اغیار کا ہے تجھ میں اثر
جب سے تو دل میں بسا دل بھی ہوا یارِ دغل
رخ پہ آ چمکا جو پنہاں تھا ترے دل میں غبار
ہے غلط جو یہ سمجھتے ہیں خط آیا ہے نکل

اب بنا چاھتا ہے ہم دم و ہم راز نیا
اب ھوا چاھتا ہے ناصحِ مشفق مختل

اے قلق سخت ستایا ہے فلک نے تجھ کو
داد چاہے ہے تو چل روبروے میرِ اجل

محورِ عدل و کرم کلبِ علی خان[1] داور
مرکزِ فضل و شرف دائرۂ علم و عمل

اُس کی گر روشنیِ راے نہ ہوتی بالا
کیوں کہ مہتابِ شباں گاہ جلاتا مشعل

لمعہ[2] ہے روشنیِ راے سے اک اُس کی برق
قطرہ ہے اک عرقِ جہدِ سخا سے بادل

۱- نواب کلب علی خاں (خلف نواب یوسف علی خاں ناظم متوفی اپریل ۱۸۶۵ع) اپنے والد کی وفات پر اپریل ۱۸۶۵ع میں مسند نشین ریاست رام پور ھوے - ناظم نے جو حکما اور علما اور شعرا وغیرہ کی ادبی محفل رام پور میں قائم کی تھی اسے کلب علی خاں نے ترقی دی - نواب تخلص کرتے تھے اور فن شعر میں امیر مینائی سے تلمذ تھا - اردو اور فارسی کے دواوین مطبوعہ ان کی علمی یادگار ھیں - بعض اور نثری تالیفات بھی ان کی متنوع طبیعت کی ترجمان ھیں - لکھنوی اور دھلوی شعرا کے ملاپ نے جس طرح زبان کو سنوارا اور شاعری میں طرز جدید کی بنیاد ڈالی اس کا سہرا انھیں کے سر ہے - مارچ ۱۸۸۷ع میں ان کی وفات نے اس محفل کے چراغ کو گل کر دیا - قلق نے یہ قصیدہ خود رام‌پور جا کر پیش کیا یا ڈاک سے بھیجا اس کا علم نہ ھو سکا - (فائق)

۲- اصل متن (ص ۳۲۳) میں لمع ہے جمع لمعہ کی جس کے معنی روشنی اور چمک کے ھیں - دوسرے قطرہ بھی

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

چند تا چند پسِ پردہ ثنا پردازی
اب تو اے شوق یہ پڑھتا ہوا اُس در ہی پہ چل

مطلع ثانی

پستیِ فکر سے ہے دور ترا اوج محل
آسماں خشت ہے اک اُس کی یہ مردود عمل
جو ترے لطف پہ مرتا ہے، نہیں فکرِ حیات
جو ترے خلق سے جیتا ہے نہیں خوفِ اجل
پیش و پس ایک سا عالم ہے تری خوبی کا
ذات ہے تیری مگر ظلِ خداوندِ اجل
ترے اخلاق سے حاسد کا نہ جائے گا رنج
نکہتِ گل نہیں کر سکتی مداوائے جعل[1]
گر ترے خلق میں لکھوں میں صحیفہ کوئی
سب کو ہو جائے یقیں ہے یہ کتابِ منزل

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)

اکلیل : ع (بہ کسر اول و سوم) مذکر۔ تاج، مرصع جواہرات کا سرپیچ۔ (نوراللغات ج ۱ ص ۳۶۳)

۴۔ شراک نعلین : تسمۂ نعلین (شراک ف بالکسر بند دوال نعلین کہ بر عرض آں باشد و دو دوال دیگر کہ بر طول آں می باشد۔ (شمس اللغات ج ۲ ص ۱۲)

۱۔ جعل : ع (بہ ضم جیم و فتح عین) حشرہ ای است۔ سیاہ و پردار کہ روے سرگین حیوانات می نشیند و آں را سرگین غلتاں و سرگین گرداں ہم می گویند۔ (فرہنگ عمید ص ۴۵۲)

ہو جو کشتی میں تری روشنیِ طبع کا ذکر
درِ بےآب بنے سیپ[1] میں چشمِ[2] اشہل
کیا لٹایا ہے کفِ راد نے تیرے زر کو
کہ ہے خورشید کو اب کیمیا سازی اسہل
تیری زر ریزی کی گر اہلِ چمن کو ہو خبر
دامنِ کوہ سے دامانِ صبا ہو اثقل
رنگ آمیزیِ حسرت سے بہت ہے ہمرنگ
تیرے اعدا کا ہے گلزار مقرر مقتل
قہر کب تیرا آسے امن عدم میں دیتا
ہاتھ رکھتی نہ اگر پشتِ معاند پہ اجل
تیرے دشمن کی گرانیِ تمنا ہے غضب
کوکبِ بخت کو ہے روز ہبوطِ اسفل
لوحِ محفوظ کو دیکھا ہے مفصل جس نے
تیرے اوصاف کو اب مجھ سے سنے وہ مجمل
داد خاطر میں تری آب و گہر کی ہے مثال
ذات میں عدل تری روشنی و شمع مثل

قطعہ

تاب کیا ہے جو کوئی ظلم کسی پر کر جائے
کہ سیاست سے تری جائے کوئی کیوں کہ نکل
شعلہ گر خس کو فنا کرکے گریزاں ہووے
ہو عرق ریزیِ خجلت سے ہوا میں دلدل

۱- اصل متن (ص ۳۲۵) میں 'سیب' غلط ہے۔ (مرتب)
۲- چشمِ اشہل : کرنجی آنکھ - (مرتب)

غل و غش[1] عہد میں تیرے نہیں چھپتا ہرگز
آب اگر شیر میں ڈالیں تو معاً جائے آبل

مدح شمشیر

گر تری تیغ کو آ جائے سرِ قطعِ نور
چشمۂ مہرِ ضیا خیز ہو کالا بادل
سینۂ گاوِ زمیں اس کا نیامِ کہنہ
زنگ آلود ہلالِ فلک اس کا مصقل
امتحاں کس نے کیا تھا دمِ ایجاد اس کا
کہ فلک کے ہوئے طبقات جدا مثلِ بصل[2]
ہے یہ وہ حجتِ قاطع کہ نہیں اس کا جواب
خون ہو جاتی ہیں ذہنوں میں براہین و علل
یہ جو ظاہر ہو تو یک لخت چھپے ایک میں ایک
عاقبت آ رہے اک وضع پہ اضدادِ ملل
کفر و اسلام کا جھگڑا نہ کبھی ہوگا طے
جب تلک اس کو نہ گردانیں گے قولِ فیصل
صاف ایسی تنِ دشمن سے نکل جاتی ہے
بخیہ گر ڈھونڈتا پھرتا ہے نشانِ مفصل[3]

---

۱ - کھوٹ ، آمیزش ، (غش و غل ہر دو بہ کسر غین و تشدید حرف دوم) - (فرہنگ عمید ص ۸۴۶ - ۸۴۷)
۲ - بصل : (مذکر) پیاز - (نوراللغات ج ۱ ص ۶۴۱)
۳ - مفصل : ع (بہ فتح میم و کسر صاد) بند ، بند استخوان محل اتصال دو استخوان در بدن - مفاصل جمع -
(فرہنگ عمید ص ۱۱۲۰)

تعریف اسپ

گر ترا اسپ ہو جولانِ گر ادوارِ زمان
سیرِ امروزہ میں جائے پسِ فردا سے نکل
جو بیاں کرتے ہیں کچھ گام کشائی اس کی
دور آخر پہ نشاں دیتے ہیں گامِ اول
شرق میں نکلے اگر 'چے' تو سرِ مغرب 'لام'
باگ کو چھیڑ کے اس کی تو اگر کہوے چل
ہے چھلاوہ یہ زمیں پر تو فرشتہ سرِ چرخ
جوش دریا میں ہے اور برق سرِ تل[1] و جبل
گل میں بو، نور میں ضو آب میں ہے طغیانی
قہر میں نعرہ غضب جنگ میں اعدا میں اجل
اس کی تعریف کے حملے سے ہے پامال خیال
بے مثالی ہے غرض اس کے لیے کہنہ مثل
ہو تو کس طرح سے ہو حصر، شتابی اس کی
معنیِ چست مری طبع سے جاتے ہیں نکل

تعریف فیل

پشت پر فیل کی جلوہ ترا یوں نورِ نظر
چرخ پر چودھویں شب ماہ کی جیسے مشعل
اس کی خرطوم شبِ تارِ دراز ایمن
اس کے دو دانت دو دستِ یدِ بیضا بہ مثل

---

۱ - تل : ع (بہ فتح تا و تشدید لام) تپہ، پشتہ، تودۂ بزرگ خاک - تلال و تلول جمع - (فرہنگ عمید ص ۳۰۸)

کوہ کن کہیے جو خرطوم کو اس کی ہے بجا
دونوں آغوش میں دو شیر کی جاری جدول
گو سواری سے تری ہے وہ فلک پر اسوار
پر ہے فطرت کی بلندی سے بھی مسجودِ رجل

قطعہ

ہے یہ سرمست کہ آنکس نہ ہو گر رعب ترا
نیم جنبش سے جہاں میں ہو یہ برپا ہل چل
دم خرطوم سے جوں ریگ زمیں اڑ جائے
آسماں پاؤں میں چیونٹی کی طرح جائے مسل

قطعہ

داورا فخر سخن ہیچ ، میں کیا تجھ سے کہوں
جزو کش ہیں مرے دفتر میں جریر[1] و اخطل[2]
مبہم غیب وہ کیا ہے کہ نہیں مجھ پہ کھلا
چاشت گہ ہے مرے کلبے میں شبان گاہِ ازل
پر بیاں کیجیے کیا تلخیِ کامِ امید
کاسۂ زہر بنے دیکھ لوں گر شانِ عسل
کھینچتے کھینچتے صدموں کو ہوئی پشت دوتا
دیکھتے دیکھتے گردوں کو ہوئی چشم احول

---

۱ - جریر : (بہ فتح و ہر دو راے مہملہ) بر وزن فعیل - نام شاعر عظیم الشان از شعرائے عرب - (غیاث اللغات مع چراغ ہدایت ص ۱۱۹ مطبوعہ لکھنؤ)

۲ - اخطل : (بالفتح و طاء مہملہ مفتوح) نام شاعرے مشہور از عرب - منتخب - (غیاث اللغات ص ۱۶)

جب نظر اٹھتی ہے پاؤں ہی پہ آپڑتی ہے
جب قدم بڑھتے ہیں پیچھے ہی کو جاتے ہیں نکل
ہم نشیں اپنا نہیں کوئی مگر شومیِ بخت
ہم سفر اپنا نہیں کوئی ولیکن جنگل
اس تفِ ضبط کو گر خلد میں لے کر جاؤں
کوثرِ تشنہ طلب دیکھتے ہی جائے جل
عاقبت اب وہ ہوا قانعِ راحت دشمن
سیبِ جنت کو مرے خوان پہ ہے عجزِ حنظل
کم نگاہی سے مری داغ ہے چشم کمخواب
میری بے مہریوں سے زرد ہے رنگِ مخمل
نہ تو موجود کا کچھ شکر نہ مفقود کی فکر
حال و ماضی کی خوشی ہے نہ غمِ مستقبل
دل پہ جب ہاتھ رکھا ہو گئی پامال ہوس
نہ زمیں سے مجھے شکوہ نہ فلک ہی سے جدل
توشۂ ناز و نعم ہے مجھے خونابۂ دل
گوشۂ برگ و نوا ہے مجھے وادی و جبل
جس جگہ بیٹھ گیا شوکتِ جم سمجھا فرش
جو ہے تقدیر کو اشکال مجھے ہے اسہل
خارِ دل ہو گئی یک لخت بہارِ امید
چینِ پیشانیِ ژولیدہ ہوئیِ طولِ امل
اب جو کچھ آرزو باقی ہے تو خدمت کی تری
اور جو کچھ اور ہے دل میں تو تمنائے اجل
بہ خدا سچ ہے یہ اور سچ ہی سمجھنا اس کو
مجھ میں اور تجھ میں نہیں لابہ گری کا مدخل

کشتۂ جورِ شکم اور ہیں وہ یاوہ بیاں
صنمِ قبلہ فروش اور ہیں وہ اہلِ دول
نہ تو یک جو تجھے درکار کسادِ بازار
اور نہ میں بیچتا ہوں بہرِ شکم علم و عمل
رائگاں ہوں میں ترے وقت میں جنسِ نایاب
مشتری ہے تو مرے دور میں برجیس محل
کوئی دلال نہیں جو ترے در تک ہو دلیل
کوئی گوہر نہیں ہے جو ہری مقبولِ اول
متصل ایک اشارے سے ترا عتبۂ فیض
مختصر ایک نظارے میں مرا طولِ امل
زیست اس کشتۂ دوری کی حضوری ہے تری
دل میں جلوہ ترا ہر دم نہ سہی طوفِ محل
شوق جس سر میں نہیں تیرا وہ ہے بارِ دوش
یاد جس دل میں نہیں تیری وہ ہے سنگِ بغل
سحرِ عید سے ہر شام تری ہے بہتر
روزِ نو روز سے ہر رات تری ہے افضل
تہنیت عید کی ہر وقت تجھے ہے لیکن
اک دعا کے لیے ہیں سب یہ طبیعت کے حیل

دعا

جب تلک غرۂ شوال سے توبہ ٹوٹے
بزمِ سرخوش ہو خرابے سے لگا تا بہ محل
تا مہِ عید سے ایمائے ہم آغوشی ہو
اور حریفوں میں ہو ساغر کے لیے جنگ و جدل
تو سرِ مسندِ عزت ہو مثالِ جمشید
محفلِ جشن میں میں جا کے پڑھوں مدح و غزل

۶- در مدح محمد حیات خاں صاحب مغفور گرداور پرمٹ

یہ کس کا آستانِ بریں ہے فلک مقام
کرتا ہے عرش دور سے جھک کر جسے سلام
اللہ رے بلندیِ محرابِ پیش طاق
قاضیِ چرخ دیکھتا ہے شملہ تھام تھام
اس طرح سربلند ہے ہفت آسماں سے
جس طرح سرکشیدہ ہے مایوسیوں سے کام
گر اس کے نیم پایے کا اندازہ کیجیے
ہو طائرِ قیاس کا صد مرحلہ مقام
ضبطِ حدود سے نہیں نسبت ذرا اسے
بیرونِ در ابد ہے پسِ خانہ ہے دوام
ایسی ہے اس کے وصف میں تقریر لامکاں
جس طرح بعد نامے کے تحریر و السلام
اس کے چمن کے رو برو یوں ہے تریِ خلد
پانی ہو خوانِ فیض پہ جوں خستِ لیام
آرائشِ ارم کا یہاں ہے یہ اقتدار
جس طرح ماہتاب میں افزائشِ غمام
اس کی بلند پائگیوں کا ہے اک غبار
صد جرأتِ جوانی و کیفیتِ مدام

فرقِ ستوں پہ پہنچ گئی تھی کسی طرح
آخر نگاہ رہتی ہے اب مرتعش دوام
گستاخ اُس کے بام پہ شاید یہ جا چڑھے
صد لغزشیں ہیں بادِ سحرگہ میں گام گام
چارہ بازگشت میں فرسودہ ہو سفیر
تا حجرہ صحن گاہ سے بھیجیں اگر پیام
آئی ندا کہ کس لیے حیرت میں اے **قلق**
دیکھے مقیم کو تو کھلے تنگیِ مقام
روحِ تنِ زمانہ محمد حیات خاں
با جان و دل یگانہ مجسم بہ خلقِ عام
ہے اس کے مہرِ فیض کو ہر وقت نیم روز
نے کچھ تلاشِ صبح نہ کچھ انتظارِ شام
عطسہ پہ عطسہ آئے فرشتوں کو خلد میں
ہو اُس کا خلق واں جو مہیائے ابتسام
یا بوئے خلق چشمِ کواکب میں نور ہے
یا ہیں دماغِ چرخِ بریں کے کھلے مسام
صد مایۂ نشاط ہے اک بوئے خلق میں
کاکل ہے مشک فام تو ہے خندہ ریز جام
گر خندۂ نشاط ترا عرضِ دھر ہو
زخمِ دلِ عدو کو نہ ہرگز ہو التیام
آسودگی کو تو نے کیا عام اس لیے
بختِ عدوے سوگ نشیں تا رہے منام
شکلِ عدو سے تھی یہ مشابہ تو چرخ نے
پیرایۂ شفق میں بہایا ہے خونِ شام

گر دست تو دراز کرے بہرِ زر دہی
جیبِ[1] ابل[2] میں پھر نہ رہے کوتہی کام
گر تو عطا سے ڈھیر کرے زر کو خاک پر
گلوِ زمیں کو دوڑ کے قارون کرے لگام
بھر دے تو آسماں کو گھرہائے فیض سے
ہے کاسۂ گداگریِ حسرتِ لیام
کب ہیں گہر کہ صورتِ نوعی بدل بدل
ہاتھوں کو تیرے چومتے ہیں حاتم و نظام
حاتم کا ذکر آج زمانہ تو بھول جائے
تجھ کو نہیں پسند مٹانا کسی کا نام
گر تو سبیلِ عام مے عیش کی لگائے
کشتی کو لائے خضر تو جمشید لائے جام
زلفِ دراز سلسلۂ پائے یار ہو
لے حسن سے جو عشق کی خاطر تو انتقام
ہو خوابِ غرق دامنِ دریا پہ شعلے کو
گر تیری رائے پہ ہو زمانے کا انتظام
جس بزم میں رواج ہو تعظیم کا تری
اٹھے نگینِ مہرِ سلیماں سے نقشِ نام

۱- جیب : (بالفتح) گریبان و پیرهن و سینه و دل ازمنتخب ومجازاً به معنی کیسۂ که زیرگریبان می دوختند ، حالا بر کیسۂ دامن اطلاق کنند و ایں مجاز در مجاز است چناں که فتیلۂ شحمی را شمع گفتن - (غیاث‌اللغات مع‌چراغ هدایت ص ۱۳۱ مطبوعه لکھنؤ)

۲- ابل : (بکسرتین و به کسر اول و سکون دوم) شتران و ایں جمعیست که واحد ندارد - (ایضاً ص ۱۱)

طرزِ حیا جو دیدۂ نرگس میں تیری آئے
پھر بنتِ رز پہ صحبتِ انگور ہو حرام

ق

ہے تیرے جشنِ عید کی ہر سر مین یہ نشاط
مجھ سے لیا ہے چرخ نے نقدِ شباب وام
کیا دور ہے نشاط طبائع کے فیض سے
نکلے رحم[1] سے طفل تو لے کر رباب و جام

قطعه

وقفِ فغاں رہے تو رہے نغمۂ طرب
گو پیچ و تاب میں ہے تو ہو زلفِ مشک فام
تیری نویدِ عام ہے بہرِ نشاطِ خاص
تیری نشاط خاص ہے بہرِ صلائے عام
کیا حوصلہ ہے جو مے وحدت تری پیے
وہ شمس جو کہ ڈھونڈتا پھرتا تھا شیرِ خام
پائے جو دخل تیری حرم گاہِ راز میں
اول قدم پہ ختم ہوں شبلی کے سب مقام

تعریف اسپ

اللہ رے تیرے جاہ کی تقسیم سلطنت
مشہور تیرا اسپِ سواری ہے شاہ گام
پائے رواج اس کی اگر نرم پوئگی
ہو خار پائے کبک دری میں تگِ خرام

---

۱ - رحم : ع ، (به فتح را و کسر حا) زهدان زن ، جاے بچه در شکم ، بچه دان و نیز به معنی خویشی و خویشاوندی ، ارحام جمع - (فرهنگ عمید ص ۶۲۵)

ہو جرعہ بھر نہ خوں اجلِ تشنہ کو نصیب
ہر چند اس کی عمر کا لبریز رہوے جام

تعریف شمشیر

دریائے بے کنار لقب فتح کا ہوا
ہے موج خیز جب سے ترا جوہر حسام[1]
ہو جائے قطع رشتۂ ادوار دہر سے
ہل جائے اس سیاہ بلا کا اگر نیام
ہو استخوانِ حوتِ[2] زمین شانہ یک بہ یک
رکھے قدم جو فرقِ عدو پر یہ تہام تہام
آمین گو فلک ہے زمین سجدہ ریز ہے
اے طبعِ ہوشیار دعا کا ہے اب مقام

دعا

جب تک کہ آئے روزِ خوشی شامِ غم کے بعد
اور شاعروں کو مدح گری کا ہو اہتمام
جب تک کہ نظم تہنیتِ عید کی ہو بزم
اور اس میں نغمہ ہائے طرب کا ہو التزام
ہو انعقادِ بزم ترے در پہ روزِ عید
ہو اس میں نغمہ ساز **قلق** تو ہو شاد کام

---

۱ ۔ حسام : شمشیر تیز ۔
۲ ۔ حوت : بڑی مچھلی اور بارھویں برج فلکی کا نام ۔

۷ - قصیدہ در مدح رابرٹ جارج گری

کیوں نہ ہو اقبال و دولت تاجدارِ سروری
ہیں غلامِ خیلِ تاشِ رابرٹ جارج گری

سایۂ انور سے تیرے مہر نورانی جبیں
پایۂ عالی سے تیرے پست چرخِ چنبری

چوب‌داروں کے ترے سر پر کلاہِ کسروی
تیرے فراشوں کے زیرِ پا بساطِ قیصری

تیرے دربانوں میں دارا داربانِ بے وقار
تیرے خداموں میں کسریٰ راندۂ خدمت‌گری

ذروۂ ایواں سے تیرے آسماں کو صد عروج
ذرۂ در سے ترے خورشید کو روشن گری

دے جسے جا اپنے در پہ دیں اُسے صدرِ قبول
لے زباں سے نام جس کا اُس کی ہو نام آوری

راے روشن سے تری وہ روشنیِ کائنات
آستاں دایم ترا مسجودِ میرِ خاوری

اعتبارِ فہم و دانش ذہنِ صافی سے ترے
انتخابِ عقلِ اول تیری راے سرسری

تیری خلوت گہ رازِ مصلحت وہ تنگ باز
جستجوے در میں حیراں گنبدِ نیلوفری

تا ابد یہ معجزہ رہوے گا تیرا یادگار
انتظامِ دھر میں کی تونے وہ جادوگری

دامنِ زر ریگ زارِ خاک تو نے کر دیا
رائے روشن کی تری روشن ہے روشن گوہری

جب ہوا معلوم اندازہ تری تجویز کا
کھل گئی سب پر جہانِ تنگ کی پہناوری

تارو تیرہ کس قدر تھا[1] ظلمتِ کیواں[2] سے ہند
جب سے تو آیا یہاں آیا ہے دورِ مشتری

بس کہ تیرے وقت میں حیلوں کا چلنا ہے محال
گرگ تک پہ بھی نہیں اب تہمتِ یوسف دری

تیری گرمیِ حمایت سے ہوا یہ ظلم سرد
شعلے کی کیا تاب گر خس سے کرے خیرہ سری

عہد میں تیرے ضعیفوں کی ہوئی یہ تقویت
موم سے چاہے تو لے تو خدمتِ آہن گری

خلق کی نکہت تری از بس کہ ہے نافہ کشا
کارواں در کارواں ہے موجِ گردِ عنبری

گر تری بے اعتنائی ہے سخاوت میں تو یہ
نام حاتم کا مٹاتی ہے تری زرگستری

تیرے حرب میں گر آوے دشمنِ حربا[3] سگال
کون ہو اس کی سپر جز داغِ واژوں اختری

۱- اصل متن (ص ۳۳۴) 'تھی'؛ تصحیح قیاسی کی گئی۔ (مرتب)

۲- زحل۔

۳ - ''حربا شگال'' اصل متن (ص ۳۳۴) میں ہے۔ شگال اور شغال گیدڑ کو کہتے ہیں، حربا گرگٹ کو، اس طرح حربا شگال کے لفظی معنی صحیح نہیں۔ 'سگال' سگالیدن سے

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

تیری تیغِ تیز کی لمعاں چراغِ تاب آب (کذا)
تیرے خنگِ گرم رو کی گرد نورِ آذری
تیرے فیلِ مست کی آواز وہ اندیشہ گاہ
کرتی ہے خوں ذہن میں چالاکی و چالش گری[1]

قطعہ

جائے عرضی عرض ہے یہ قطعہ سنیے حرف حرف
اے فروغِ برتری و اے فراغِ سروری!
داورا! اس مدح سے میری غرض اخلاص ہے
سر پہ خونِ حق ہے گر ہوں کشتۂ لابہ گری
نے خوشامد ہے تری اس میں نہ میری شاعری
ہے محیطِ تر زبانی طرز بندہ پروری
فرض ہر بندے پہ شکرِ بندہ پرور ہے ضرور
ورنہ ہے کفرانِ نعمت شاہدِ صد مدبری
کیا عجب گر مدح لکھی کمترینِ بندہ ہوں
اصطلاحِ شکر میں ہے تو خدائے سروری
تیرے جو انعام ہیں وہ خارجِ امکانِ شکر
تیرے جو اکرام ہیں وہ فارغِ مدحت گری

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)

امر کا صیغہ ہے جس کے معنی سوچنا ، فکر کرنا اور رائے دینا بھی ہیں ۔ اس طرح 'حربا سگال' دشمن کی صفت ٹھہرائی جاسکتی ہے ۔ تصحیح قیاسی کی گئی ۔ (مرتب)

۱- چالش گری بہ معنی جنگ جوئی اور خود نمائی ۔ (مرتب)

وہ کمندِ خلق سے تو نے کیا مجھ کو شکار
فربہیِ فکر بھی ہے جس سے صیدِ لاغری
میں کہاں اور میری قسمت تو کہاں اور تیرا فیض
لیک ہے خورشید خود مشتاقِ ذرہ پروری
بن کہے حالِ زبوں میرا تجھے معلوم ہے
ہے فلاطونی تری آئینۂ اسکندری
گو کہ باطن میں ترے درپہ ہوں، ظاہر میں مگر
ہوں ترے دیدار سے محصورِ تیرہ اختری
اس لیے ارزانیِ دربار ہیں میری دو چشم
تا کہ نورِ فیض سے ہوں ناظرِ بہرہ وری
یعنی افضال الحق و شمس الحق آتے ہیں وہاں
جس جگہ ہے خیمۂ دولت کی سایہ گستری
جاتے ہیں بہرِ شرف اندوزیِ الطافِ خاص
آتے ہیں حاضر غلامی میں نہ بہرِ چاکری
پرورش کی جو نظر مجھ پر ہے وہ ان پر رہے
ان کے حق میں چاہتا ہوں ایسی بندہ پروری
شیوۂ اخلاق سے محجوب ہو لطفِ پدر
طرزِ دلداری سے شرمندہ ہو مہرِ مادری
سجدے میں خامہ ہے اور دستِ دعا ہے اب بلند
نعمتِ صاحب کی واجب ہے دعاے برتری

قطعۂ دعائیہ

جب تلک ہے کام جو کا دیدۂ امید وا
جب تلک خورشید پر لازم ہے ذرہ پروری

جب تلک در اہل ثروت کا ہے مسجودِ مراد
جب تلک ہے آستانِ جاہ پر گرد آوری

جب تلک ہے شادی و اندوہ لحوے عزل و نصب
جب تلک خدمت کا شیوہ ہے حضیض و برتری

ہو سرِ مسند ترا اوجِ حکومت پر بلند
دولت و اقبال کو ہو تیرے در پر سروری

قطعات و مسدسِ مدحیه

قطعہ (۱) در تہنیتِ عید در مدح منشی برکت علی صاحب

حریفِ خام یہ شیوہ ترا نہیں بہتر
کہ لافِ صلح ہے لب پر تو دل میں جوشِ فساد
لے آج عید ہے ، ملتا ھوں تجھ سے ھو کر صاف
اور اُس پہ کھاتا ھوں سوگندھاے صدق ایجاد
قسم ہے نغمۂ بیت الصنم کی وقتِ سحر
کہ جس کو سن کے کریں سہو لاالٰہ عباد
قسم ہے سیر نگاھان بزمِ وحدت کی
کہ جن کی چشم سے ناآشنا ہے بست و کشاد
قسم ہے سرخوشیِ بادِ دشتِ ایمن کی
گرایا ھاتھ سے موسیٰ کے جس نے جامِ سداد
قسم ہے غیرتِ شرک اُس حریف کی مجھ کو
دمِ نظارہ نہ چاھے جو چشمِ سے امداد
قسم ہے لرزۂ عاشق کی وقتِ کشتنِ یار
کہ جس کو دیکھ کے ھل جائیں چرخ کے اوتاد
قسم ہے شعلہ افسردگیِ دل کی جو
بجھاے آتشِ خورشید و کورۂ حداد
قسم ہے تشنگیِ جانِ ناشکیبا کی
کہ چشمہ سار نظر آئے خنجرِ فولاد
قسم ہے مژدہ رسانیِ قتلِ عاشق کی
کہ خیرباد کہے جاں تو دل مبارکباد

قسم ہے سادگیِ فرقۂ مسلماں کی
دو خشتِ کہنۂ مسجد پہ یہ غزا و جہاد
قسم ہے ہیچیِ اشعار کی مرے اُس پر
کہ جس دماغ میں ہو دودِ بوے استعداد
تو میرے ملنے کو گنجِ خرد کا ملنا جان
ہے ورنہ راندۂ درگاہ فرقۂ حسّاد
دلیل چرخ کو ہے میری دشمنی کی بھی
کہ نقشِ ناصیہ ہے دامِ اسمک اسناد ؟
ولیک مجھ کو نہیں ڈر کہ میرا حامی ہے
جناب سید برکت علی سپہر مراد
تری سخا سے نہ کیوں کر ہو بحر خاک نشیں
کہ تو نے آبِ گہر کو کیا ہے گرد آباد
کمال و فضل کو فضل و کمال تیری ذات
شرف کو عزّ و شرف ہے تری خجستہ نہاد
ترا جمال زوالِ نظر ہے حاسد کا
ترے فروغ سے خورشید تک بھی مستسعاد
زہے خجستہ بیانی عیارِ منطقِ نطق
خہے شگفتہ نگاری بہارِ باغِ مراد
وہ حرفِ فتنہ کو کاٹا ہے تیغِ انشا سے
کہ تیرے خامے سے شرمندہ خنجرِ فولاد

ق

تری متانتِ انشا خلاصۂ فطرت
تری بدیہ نگاری بدائعِ ایجاد

نہیں ہے سہو تری یاد میں کسی صورت
ترے غلط پہ بھی صحت کا چشم سے ہے صاد
اگر ہے عادتِ خلقی سے سہو تجھ میں تو بس
نہ مدعی کی خطا اور نہ اپنا احساں یاد
سرشتہ داری ہے ہر چند شغلِ آبائی
مگر ہے تیری غرض اس سے انتظامِ بلاد

ق

پے ثواب تو قانع اسی پہ ہے ورنہ
ٹھکانا کیا ہے ترقی کا کچھ نہیں تعداد
ترے شمارِ مراتب عقول سے خارج
تری بدایتِ منصب نہایتِ اعداد

ق

میں خانداں کا ترے وصف کس پہ ختم کروں
ازل سے تا بہ ابد ہے تسلسلِ امجاد
مثال فضل میں رکھتے نہیں ترے اسلاف
شرف میں اپنی نظیر آپ ہے تری اولاد
وہی تو ہے تری تدبیر جو مشیت ہے
اسی سے ہے متاثر نظامِ کون و فساد
اگر تو چاہے بدل دے ابھی مری تقدیر
ہے تیرے ہاتھ میں اصلاحِ خوب و زشتِ عباد

روائے کارِ دو عالم تری قلم رو میں
خراب خطۂ فتنہ و[1] ملکِ امن آباد

ترے عدو کو نہیں جاہ و سروری زیبا
ہوا ہے ظل ہما بھی کہیں نشیمنِ حاد[2]

ترا زہیرِ[3] عداوت زمیں کا پیوند
ترا اسیرِ محبت زمانے سے آزاد

بہارِ خلق سے تیری ارم کو کیا نسبت
شرارِ خشم سے تیرے فلک کی کیا بنیاد

۱- واو عاطفہ یہاں فتنہ کے ساتھ ملا کر نہیں پڑھا جائے گا علٰحدہ پڑھیں گے۔ (مرتب)

۲- فرہنگ عمید ص ۴۹۳ میں حاد کے معنی تند، برندہ اور تیز کے ہیں اور غیاث اللغات میں بھی یہی معنی ہیں۔ صراح جلد اول ص ۲۲۶ میں ہے:-

"حداد: بالکسر جامہ ہائے سوگ سیاہ و کبود و جامۂ سوگ پوشیدن فہی حاد۔۔۔

قولہ تعالٰی: ان اللذین یحادون اللہ و رسولہ ای یخالفون۔"

عربی فیروز اللغات مطبوعہ ۱۹۱۸ء ص ۱۰۰ پر اس کے معنی تیز اور تنگ لکھے ہیں۔

مولف شمس اللغات (ج ا ص ۳۶۵) بہ معنی تیز و سخت اور نام پسر حضرت یعقوب علیہ السلام بھی لکھتے ہیں۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ تیرے دشمن کو جاہ اور سروری کہیں موزوں نہیں، جس طرح ظل ہما 'نشیمن حاد' نہیں بن سکتا۔ (مرتب)

۳- زہیر: کھلا ہوا، تابان، روشن، درخت کلیوں سے لدا ہوا۔ (لغات کشوری ص ۲۳۳)

لیکن یہاں مفہوم شعر کا واضح نہیں۔ 'زحیر' مریض پیچش ہے۔ لغات اس سلسلے میں خموش ہیں۔ (مرتب)

ق

وہی ہے قبلہ گہِ جاہ جس سے تو ہے خوش
وہی ہے راندۂ درگہ جس سے تو ناشاد
یہ کیا غضب ہے کہ تو مہربان ہے جس پر
فلک ہے مجھ پہ غضب ناک اور سرِ بیداد
بھلا دیا منطق و حکمت کو جورِ فاقہ سے
بجز تصورِ نان اور کچھ نہیں اب یاد
یہ وقتِ لطف ہے کر لطف ورنہ پھر میں کہاں
کرے جو رحم تو صد شکر ورنہ صد فریاد

قطعہ

طریقِ دھر ہو، تا رسمِ شادی و ماتم
رہیں زمانے میں جب تک کہ شاد اور ناشاد
ترے حضور میں دایم ہو عیدِ شادی خیز
ترے عدو کے رہے ساتھ مرگِ ماتم زاد

قطعہ (۲) در مدح ملکۂ انگلستن (وکٹوریہ) فرمان روائے ہند

حاکمِ ہر دو جہاں یعنی خداوندِ ازل
عرض جس جائے پہ وہ کرتا ہے اپنے انعام
مرکزِ جاہ و حشم ایسے کو واں کرتا ہے
جس کی تدبیر سے حیران ہوں عقول و افہام
اُس کو دیتا ہے وہ سرمایۂ علم و حکمت
کل طلسماتِ جہاں کا ہو وہی مظہرِ تام

پھر تو مقبول مشیت کو ہے اُس کا مقبول
اُس کا مردود ہے ہر طرح سے مردودِ انام
نظرِ لطف سے ذرے کو اگر وہ دیکھے
آسماں چشمِ کواکب سے کرے استیلام[1]
عرش پر فرش کو رکھے تو جبیں پر رکھ لے
جس طرح چاہے کرے رائے پہ اپنی وہ نظام
لیک با ایں همه اقبال و شکوه و حشمت
داد کی اُس کو رہے فکر، رکھے عدل سے کام
للہ الحمد ہے اب ہند پہ بھی لطفِ الٰہ
شاہِ عادل کو کیا وارثِ ناموس و نام
ملکۂ مہر نگیں، کرسی نشیں، عرش مکیں
یعنی وکٹوریہ انصاف منش عدل پیام
اُس کا مبرم[2] ہے ہر اک رزم میں الزامِ ننگ
اُس کا ملزم ہے ہر اک بزم میں ننگِ الزام

۱- ''استلام: (بالکسر از باب افتعال) سودن سنگ را به دست یا به لب، از منتخب و صراح و ایں کنایه است از بوسیدن و ثلاثی مجرد آں سلم است که به فتحتین باشد به معنی گردن نهادن - ظاهرا چوں به سودن سنگ به دست یا به لب از لوازم گردن نهادن است به معنی مزید مجازاست از معنی مجرد و کسانے که استیلام به زیادت یاے تحتانی خوانند غلط است از کنز۔'' (غیاث اللغات مع چراغ هدایت ص ۲۶ مطبوعه لکھنؤ)

۲ - مبرم : (ع) ـ محکم، ثابت، استوار شده ـ
(فرهنگ عمید ص ۱۰۳۹)

اُس کی جس ذرے پہ اک بار نظر پڑ جائے
دور سے جھک کے کرے عرش اُسے لاکھ سلام
آلِ تمغائے [1]حشم اس کا کمینہ چاکر
درۃالتاجِ شہی اُس کا اک ادنٰی سا غلام
وہ اگر دوسروں کا آئے اُٹھانے پہ عمل
دخل کیا ہے جو رہے ثبتِ نگیں نقشِ نام
ایسا آسودہ نشینی کو دیا اُس نے رواج
نہ کسی فکر کی اب فکر نہ کچھ کام سے کام
جو اُٹھا اُس کے درِ جاہ سے بیٹھے بیٹھے
اُٹھ گیا اُس کا زمانے ھی سے ماوا و مقام
سلطنت ھائے گذشتہ کا فسانہ ہے یاد
وقتِ جمشید سے اس وقت تلک نام بہ نام
یہ عجب عہد ہے افسوس ہے کوتاھیِ عمر
سحر آسودگی کہیے کہ طلسمِ آرام
کسکا یہ دور تھا روشن کہ ہے اک بزمِ عروس
روز سے کم نہیں ہر شب تو سحر سے ہر شام
تار برقی کو ادھر دیکھ اُدھر دیکھ تو ریل
وہ سواریِ تصور، یہ پیامِ الہام

---

۱ - ''آل تمغا : ت - (بہ سکون لام و فتح تا) مہر سرخ، مہر سلاطین مغول کہ با مرکب سرخ روے نامہ ھا و فرمان ھا می زدند -'' (فرہنگ عمید ص ٦۵)
اصل متن (ص ۳۳۲) میں املا 'آل طمغا' غلط تھا، تصحیح کی گئی - (مرتب)

الغرض نطق سے باہر ہے ہر اک شے کا بیان
ہے دعا وردِ زباں مختصر اے طولِ کلام

قطعہ

رہوے جب تک کہ سلاطین کو ہوس دولت کی
رہوے جب تک کہ خسک ریز طلب جوشِ مہام
اُس کی دولت کی ھدایت ہو نہایت سے پرے
اُس کے حسّاد کا اول ھی سے ہو کام تمام

قطعہ (۳) در طلب چار روپیہ بہ خدمت محمد حیت خان

اے خانِ حیات خانِ فرخ
اے ذرہ نواز، مہر کردار
سرکار کو اتنی چشم پوشی
کیا بخت ہے میرا واں بھی مختار
پر بخت کی میرے کیا برائی
جب تُو ہے تو اس سے کیا سروکار
کاٹے ھیں عجب طرح سے یہ دن
میں جان سے، جان مجھ سے بیزار
جیتا رہا یوں بھی کام ناکام
دلوائیے اب کے 'چار' ناچار

قطعہ (۴)

لائقِ شکر ہے وہ واہبِ بے ضنت و بخل
جس نے شاہی کو دیا ناز ، گدائی کو نیاز
ابر کو تازگی اور باد کو نزہت بخشی
رنگ و بو گل کو دیا ، شمع کو صد سوز و گداز
دلِ عاشق کو فغاں ، خاطرِ جاناں کو فراغ
تکیۂ فقر کو چیں ، مسندِ دولت کو طراز
الغرض حصر سے باہر ہے شمارِ انعام
کون کر سکتا ہے ایثار کا اُس کے انداز
پر یہ کیا سمجھا ہے اُس نے جو دیا ہے مجھ کو
طالعِ دشمنِ جاہ و دلِ عشرت پرداز

قطعہ (۵) بہ خدمت سید احمد حسن فرقی

اے محبت پناہ "فرقانی"
مختصر عرض ہے بہ صد آداب
کیا کہوں کیوں نہ ہو سکا حاضر
کیا کہوں کیوں ہوں مستحقِ عتاب
ایسے ایسے اُٹھائے ہیں صدمے
اب ہوں ہر طرح بارِ دوشِ عذاب
دور ازیں حال میرا حالِ تباہ
گھر کا گھر ہے مریض ، خانہ خراب

روز و شب سال و ماہ زندانی
دن کو ہے چین اور نہ رات کو خواب
کوئی مر جائے تو کفن معلوم
اور جیے تو بغیرِ دانہ و آب
خونِ دل اشکِ دیدہ با صد رنج
بہر بیمار شربت و کشکاب[1]
یا تہی کیسہ ہے پر ارمان دل
یا تہی کاسہ جوشِ چشمِ پر آب
ایسی حالت میں حاضری مشکل
ہو عبادت تو ہے قصورِ ثواب
کون جائے کہیں بجز اُمید
کون بیٹھے بجز دلِ بے تاب

قطعہ (۶) بہ محبی شیخ عبدالصمد فوق بہ استعفے شکر رنجی

اے فوق[1] آشنا ہے قلق غیر تو نہیں
عمداً نہ کچھ کہا ہے نہ سہواً خفا نہ ہو
نادر ہیں تیرے لفظ تو معنی ترے غریب
یہ ہرزہ فہم گر نہ ہوا آشنا نہ ہو

۱- کشکاب : بر وزن مہتاب ' آلش جو ' را گویند کہ بہ جہت بیمار پزند (برہان قاطع ، صفحہ ۴۰۳ ، مطبع علوی)

۱- فوق تخلص شیخ عبدالصمد ، باشندہ میرٹھ ، شاگرد مظفرخاں گرم (شیفتہ کے گرم مصاحب اور ذوق کے شاگرد تھے -)

میں دوستوں کا دوست ہوں یاروں کا یار ہوں
دشمن خدا کے واسطے انصاف کا نہ ہو
جائے سخن نہیں ہے تو لڑنے سے فائدہ
گر تجھ کو بھی کلام ہے بے خود سرا نہ ہو
سرقہ[1] گمانِ بد ہے، توارد[2] ہے سوے ظن
خورشید اقتباسیِ نورِ سہا نہ ہو
ہم طرز و ہم کلام مرا تو ہے خوش ہوں میں
حیف اُس کی زیست جس کا کوئی آشنا نہ ہو
کیسا کلام مجھ کو بھی گر قتل کیجیے
ہرگز کسی طرح طلبِ خوں بہا نہ ہو
شکوے کی تھی بنا پئے دعواے دوستی
دعواے شاعری تجھے گا ہے ہو، نہ ہو

---

۱ - سرقہ : کسی شاعر کا شعر اپنی طرف منسوب کرنا ۔ اگر کسی گزرے ہوئے شاعر کا شعر مابعد کا شاعر بہ تغیر الفاظ اپنی طرف منسوب کرے تب بھی اسے سرقہ ہی کہا جائے گا ۔ فارسی اشعار کا اردو میں ترجمہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے ۔ خان آرزو نے قدسی کے فارسی شعر کے ترجمے پر سودا پر یہی اعتراض کیا تھا ۔ ''انیس'' اور ''دبیر'' کے درمیان معانی اور مضامین کے سرقے پر نوک جھوک ہوئی ہے ۔ قلق اور فوق میں بھی یہی صورت پیش آئی ہوگی ۔ (مرتب)

۲ - توارد - (ع) مذکر (لغوی) باھم ایک جگہ اترنا ۔ (اصطلاحی) ایک ہی مضمون دو شخصوں کے ذھن میں آنا ۔ ایک بیت یا مصرع کا دو شخصوں کے ذھن مین آنا (تسلیم) :

قدِ موزوں کی صفت میں ہم نے جو مصرع کہا
مصرعِ سروِ گلستاں سے توارد ہو گیا

[نوراللغات ج ۲ ص ۳۰۹]

ک شکوہ کیا کہ عشوۂ صحبت ہزار ہیں
اتنی ذرا سی بات پہ اتنا خفا نہ ہو
بے لطف ہے خروش صدائے دھل نہ بن
بے فائدہ ہے جوش مرا ماجرا نہ ہو

قطعہ (۷)

کٹ گیا آدھ پا جو تنباکو
پی گئے ہم بھی دیکھ کر نیت
دل میں ہے چھوڑ دیجیے حقہ
جی میں ہے ترک کیجیے عادت
پیٹ پھولے تو قدر دانی کے
ماریے منہ پہ گوز بے منت

قطعہ (۸)

سبھی اجاڑ کچیسر بلا سے جی نہ لگے[1]
نہیں مشاہرہ کچھ سو سے کم جو ہوں سی بیست (۵۰)
یہیں کا پانی ہے، لکھا ہے جس کو سعدی نے
کہ آبِ چشمۂ حیوان درونِ تاریکیست
سبھی کو لطف ہے عشرت ہے شاہد و مے ہے
فقط **قلق** ہی ہے اک بے نصیب و بدحظ زیست

۱- 'جی لگو' اصل متن (ص ۳۴۵) میں غیر موزوں ہے 'جی نہ لگے' ہوگا - **تصحیح** قیاسی کی گئی - (مرتب)

قطعہ (۹) بہ سرکار کچیسر

مانس بن ہے رسوئی اپنی بھنڈ
دال اور ہم ہری ہری مہراج[1]
دال دیجے گئو کے جایوں کو
دانہ خوری کا بیل ہے محتاج

قطعہ (۱۰) در تسکین افلاس

مفلس کو اے قلق نہیں تشویشِ عاقبت
آفت زدہ کو کچھ نہیں آفات سے گزند
اہلِ دول کا حصہ ہے انجامِ بد ضرور
ہے ممتلی کے واسطے فاقہ ہی سودمند

قطعہ (۱۱) در پند بخل

صرفہ نہ کر قلق تو اگر مردِ شرع ہے
یہ رندِ پاک باز کا ہے قولِ دل نشیں
مت سر بہ جیب مالِ تلف پر ہو اے لئیم
سجدہ نمازِ مردہ کا ہے کافریِ دیں

۱۔ اصل متن (ص ۳۴۵) میں مہاراج غلط ہے ۔ (مرتب)

قطعہ (۱۲) شکریہ عطیۂ حافظ محمد اکبر صاحب سلمہ

انگرکھا مجھ کو بھیجی ہے اکبر نے سوزنی
بخیے کا جس کے تار ہے باریکیِ نگاہ
ملبوسِ خلد کا ہے تکلف میں نورِ چشم
تشریفِ خسروی کا ہے عظمت میں قبلہ گاہ

قطعہ (۱۳)

حیف یارانِ میرٹھی کا نفاق
ایسے غیبت پسند ہیں خود رائے
مل کے اُن سے خدا نہ کردہ خدا
عذرِ ابلیس سے بہت شرمائے

ایضاً (۱۴)

قلق مت بخل کر دے گا وہ جس نے
تہی دستوں کو فیاضی سکھائی
امیری کا وظیفہ ہے خساست
کہ قارونی کا حاصل ہے گدائی

---

(۱۵) قطعہ

یہ ہندو زاد کا غل ہے **قلق** میرے محلے میں
زمیں ٹھوکر سے ہلتی ہے تو گردوں ڈگمگاتا ہے
غرض مندر سے کچھ ایسے مسلماں کش نکلتے ہیں
کہ توبہ منہ کی کھاتی ہے اور ایماں بم مچاتا ہے

---

(۱۶) قطعۂ تاریخ وفات منشی منیر علی

چو یافت مدفن منشی منیر علی تعمیہ
کہ رفت جان گرامیِ شاں بہ باغ بہشت
قلق بدیہہ پےِ یادِ سال تاریخش
'شبیہ نور رواق منیر علی' بنوشت

مسدس (در مدح منشی برکت علی صاحب سلمہ ربہ)

ماہِ صیام کب ہے میرا ہی[1] مدعا ہے
روزِ ازل سے اب تک مشتاق و مبتلا ہے
پر راہِ کامیابی دربستہ ہو رہا ہے
ناچار تنگ ہو کر الٹے قدم پھرا ہے
ہاں دیکھنے تماشا آیا تھا ماہِ رمضاں
برکت علی کے در پر ہوتی ہے عیدِ قرباں

اے سید السیادت اے مظہر الکرامت
اے مصدر الفراست اے کیّس الکیاست
اے منبع السخاوت اے مجمع الشرافت
اے معدن المحبت اے مخزن المودت
کب شاعری سے میری رسمِ ثنا گری ہے
کچھ کوٹ کوٹ مجھ میں الفت تری بھری ہے

میں ہوش اور تو خبرت میں ذہن اور تو جودت
میں صبر اور تو طاقت میں شوق اور تو جرأت
میں حرص اور تو دولت میں سعی اور تو راحت
میں آز اور تو نعمت میں فقر اور تو ثروت
تو اور مری ارادت تصویر و رنگ توام
میں اور تری محبت معنی و لفظ باہم

۱- 'ہوی' اصل متن (ص ۳۳۷) میں صحیح نہیں ، 'ہی' تصحیح قیاسی کی گئی - (مرتب)

گر درِ کان ہوتا تجھ پر نثار ہوتا
گر جاہ و شان ہوتا تجھ پر نثار ہوتا
گر آسمان ہوتا تجھ پر نثار ہوتا
گر دو جہان ہوتا تجھ پر نثار ہوتا
اے رنگ و بوے اُلفت تو گل تو میں صبا ہوں
اے رائحہ محبت تو بو تو میں ہوا ہوں
تو اور تیز رائی میں اور نکتہ رانی
تو اور دل‌ربائی میں اور جاں فشانی
تو اور بذلہ زائی میں اور خوش بیانی
تو اور میرزائی میں اور مدح خوانی
میں اور تیری مدحت اللہ رے شان میری
لیتی ہے لب کے بوسے کیا کیا زبان میری
بے خویش و بے محابا ہوں گفتگو میں تیری
وقفِ زباں سراپا ہوں گفتگو میں تیری
ہنگامۂ تماشا ہوں گفتگو میں تیری
شورِ نشور گویا ہوں گفتگو میں تیری
جز شورِ مدح سنجی کھلتا نہیں کہ کیا ہوں
مبہم دقیقہ ہو کر وقفِ لبِ ثنا ہوں
گو لخت لخت دل ہوں صد دردِ متصل ہوں
اور جزو جزو جاں سے تاب و تواں گسل ہوں
جرأت سے زندگی کی شرمندہ و خجل ہوں
صد زخم و یک جگر ہوں صد نیش اور ایک دل ہوں
لیکن تری ثنا سے غافل نہیں ہوں تو بھی
ہوں نالہ گو سراپا پر دل نشیں ہوں تو بھی

صحبت فراہم اپنی اس طرح آسماں سے
آوارہ جیسے بلبل بیدادِ باغباں سے
گہ زندگی سے برہم گہ بد دماغ جاں سے
کچھ منہ سے کہہ رہا ہوں نکلے ہے کچھ زباں سے
اے کاش میرے دل کا یا تو فراغ ہوتا
یا چرخِ پست فطرت عالی دماغ ہوتا
لیکن زمانہ مجھ کو میٹے گا یوں کہاں تک
ہو کر غبار بھی میں پہنچا ہوں آسماں تک
یعنی کہ آ گیا ہوں اب تیرے آستاں تک
بے دست و پا نہیں ہوں میں جنبشِ زباں تک
جو مدعی ہے سن لے آ کر سخن سرا ہوں
تیری ستائشوں سے میں خویشتن ستا ہوں
وہ قبلۂ بلندی ہے تیرا آستانہ
واجب فلک پہ جس کا ہے طوفِ جاودانہ
طوبیٰ کی طرح اُس کا سایہ ہے خانہ خانہ
واں دخلِ عقلِ کل کا چلتا نہیں بہانہ
گر رفعتِ فلک بھی پابوسیوں کو آئے
لو سر کے بل ہی آخر تحت الثریٰ کو جائے
جس ذرے پر نظر تو ڈالے دمِ سخاوت
سرمایہ بحر و کاں کا اُس کی کرے زیارت
آب گہر سے بھڑکے مانندِ شعلہ غیرت
لمعاں میں اپنی جل کر ہو تودۂ ملامت
تسخیر پھر نہ ہرگز نقشِ درم میں رہوے
در لعل ریزہ ہو کر خاکِ قدم میں رہوے

فضلہ ترے کرم کا دریا و کاں کی دولت
دو مشتِ فیض تیری ہر دو جہاں کی دولت
فخر آسماں کا تیرے ظلِ مکاں کی دولت
سر خاک کا فلک پر اس آستاں کی دولت
پرتوے در سے تیرے سایہ نشیں بلندی
عز و حشم سے تیرے مغرور ارجمندی
ازبس تری طبیعت ہے خوگرِ عدالت
غلبے سے عشق کے ہو گر حسن کو شکایت
افسردہ خاطری کی بر رو نہ ہو شرارت
نیچی نظر سے فتنے اٹھ کر نہ ہوں قیامت
ناز و نیاز میں اب پیدا ہے وہ صفائی
شکوہ ہے دل دہی سے انصاف سے لڑائی
بے باکیوں سے اب وہ جوشِ شہال کب ہے
بادِ صبا سے سبزہ اب پائمال کب ہے
گل چیں سے زخم خوردہ شاخِ نہال کب ہے
سنبل کشاکشی سے وہ خستہ حال کب ہے
اب گلشنِ جہاں کو ہرگز خزاں نہ ہوگی
بوڑھی صبا نہ ہو گی، صرصر جواں نہ ہوگی
مفہومِ مہر و کیں کا فہمِ بلند تو ہے
سررشتۂ ہنر کا شیرازہ بند تو ہے
ہموار ساز راہِ پست و بلند تو ہے
معیارِ اعتبارِ رد و پسند تو ہے
ہے قبلۂ مشیت جو مدعا ہے تیرا
سر موجۂ حقیقت ہر ماجرا ہے تیرا

ہے خوش نگار جیسا ویسا ہی نغزگو تو
تحریر میں عطارد تقریر میں ارسطو
ہر حرف جاں فزا ہے ہر لفظ تیرا دل جو
دفتر میں تیرے سحباں بہرِ ادب دو زانو
طرز ادا میں تیری حور و پری کا شیوہ
ہے جاں نثار تجھ پہ منشی گری کا شیوہ
ہیبت سے تیری گردوں رہتا ہے بس کہ لرزاں
اعدا پہ ہیں حوادث نازل مثالِ باراں
تیرِ فلک کماں میں ہے خوف سے پر افشاں
واقع میں نسرِ طائر بھولا ہے رسمِ طیراں
یاں تک سپہرِ سرکش سر دادہ ہے رضا پر
حاضر ہلال و خور سے ہے طشت و تیغ لے کر
گر ہو دمِ شجاعت تو عازمِ دلیری
لابہ کناں ہو ہر سو صد روبہی سے شیری
جب تیغ تیز نکلے بن کر زبان میری
بل بے عدو کی وحشت، اللہ رے دھاک تیری
ہو جائیں بند رستے یک بارگی عدم کے
جب تک نہ یہ سیہ سر، فرقِ عدو پہ چمکے
جو تیغ آشنا ہو یک دم تری کمر سے
دشمن جو اس کو دیکھے میداں میں یک نظر سے
اول تو چشم اس کی، ہو منقطع بصر سے
پھر لخت لخت تارک درہم ہو دردِ سر سے
گر اپنا حال دیکھے تو سینہ اس کا پھٹ جائے
سایہ بھی ہمرہی سے مجروح ہو کے کٹ جائے

جز قطعِ سر نہ آئے کوئی حضور اس کے
پاؤں میں دم بہ خود ہو شورِ نشور اس کے
کب سامنے پڑے ہے نزدیک و دور اس کے
آئے اگر مقابل فوجِ شہور اس کے

سنوات ریزہ ریزہ ہوں اس قدر فزوں تر
عمرِ عدو کا کٹنا ہو صد جہاں برابر
یہ اور ٹھہر جانا آتش کا سنگ ہونا
یہ اور دم کا لینا ، محشر کا تھک کے سونا
یہ اور رک کے چلنا ، بجلی کا بند ہونا
یہ اور صلح پانا ، جوہر ظفر کا کھونا

گر اس کو روک لیجے ہو زخم بار یاں تک
بسمل ہو زیرِ بسمل ذرے سے آسماں تک
اعدا کا سر اتارے گر گھاٹ کو دکھائے
غرقابِ دو جہاں ہوں گر پاٹ کو دکھائے
ہوں نُقل کوہ و صحرا ، گر چاٹ کود کھائے
سایہ ہو نور فق سے گر کاٹ کو دکھائے

اندھیر ہو جہاں میں گر ہو چمک کے روشن
سیفی بھی اس کے آگے لیوے نہ نامِ جوشن
تیرے سمند کا گر نقشہ کوئی اڑائے
وہ برق کی سیاہی ، شعلے کا خامہ لائے
جتنا کہ کھنچتا جائے اتنا ہی اڑتا جائے
شوخی سے تنگ ہو کر جب کچھ بھی بن نہ آئے
یوں اپنا رنگِ دعویٰ قرطاس پر جا دے
برق نظر ہے دیکھو ، ہر ایک کو دکھا دے

نکلے اگر کبھی تو ، اس پر سوار ہو کر
ہو اور نظر نہ آئے بادِ بہار ہو کر
دریا و دشت و ہاموں اور کوہسار ہو کر
آئے جو سوے گلشن ہنگامہ بار ہو کر
گرمی سے اس کی گلشن یک بارگی دھک جاے
ہر گل میں رنگ ہو کر خورشید سا چمک جاے
گر ہو وغا میں گاہے یک لحظہ آرمیدہ
ور لشکرِ عدو ہو چاروں طرف تنیدہ[1]
مایوسیوں سے رہوے جوں گام[2] سر کشیدہ
مژگاں سے صاف نکلے مانندِ نورِ دیدہ
نورِ نظر کی مانند اڑ کر نظر نہ آئے
ہرگز غبارِ ہالہ اس ماہ پر نہ آئے
ظاہر ہے صاف اس کی مطلق عنانیوں سے
ہے صد ہزار فرسخ یہ نکتہ رانیوں سے
شوخیِ گام باہر آتش بیانیوں سے
رفتار اس کی ظاہر فتنہ نشانیوں سے
بے قید ہے یہ بے شک ہر بندشِ بیاں سے
کچھ وصف اس کا پوچھو وحدت کے رازداں سے

۱- تنیدن : بننا ، بل دینا ، مکڑی کا جالا پورنا ۔ تنودن بھی آیا ہے ۔ تنیدہ بہ معنی بافیدہ ۔ (مرتب)
۲- 'کام' اصل متن (ص ۳۴۲) میں معنی واضح نہیں ، چوں کہ پہلے بند میں گھوڑے کا ذکر ہے اسی مناسبت سے 'گام' تصحیح قیاسی ہے ۔ (مرتب)

شوخیِ طبع میری ہو مدح سنج کب تک
حسنِ بیاں سے حاسد تیغ و ترنج کب تک
تیری سخا کے بررو ، ایثار گنج کب تک
پیشانیِ ادب میں چین و شکنج[1] کب تک
سر منزلِ خموشی اب حدِ مدّعا ہے
لیکن صلائے آخر یہ نغمۂ دعا ہے

بند دعائیہ

ہو جشنِ عید جب تک عالم میں عشرت آرا
شاہ و گدا کی صورت ہو دل کشِ تماشا
انبوہِ شادمانی ہر سو ہو عیش پیرا
مستی و بے خودی سے ہو ہم بغل تمنا
سرخوش ہو جلوہ فرما تو مسند غنا پر
اقبال ہو نوا زن اور میں ہوں تہنیت گر

۱- شکنج : شکن ، پیچ و تاب پیچ و خمِ زلف -
(فرہنگ عمید ص ۷۷۵)

حصۂ رقعات منظوم ، تقریظاتِ و قطعات تاریخ

منظوم مسودۂ رقعہ

فصلِ گل آئی ، آیا ابرِ بہار
چشمِ نرگس ہے رات دن بیدار

دھوم ہے شورشِ عنادل کی
ہے صبا رازدار ہر دل کی

شورِ شادی ہے جوشِ مستی ہے
آسماں سے خوشی برستی ہے

یہ دلوں میں بھرا ہے جوش خروش
جز لبِ فرش اب نہیں خاموش

کیوں نہ خورم ہو محفلِ شادی
کہ ہے تصویرِ خانہ آبادی

ہے جگن ناتھ کی عروسی اب
بزمِ احباب ہے مہیا سب

رقص و نغمہ ہے نقشِ طوبیٰ لکم
ششمِ جون سے ہے تا ہشتم

ہے یہ امید دوست داروں سے
لطف فرما کرم شعاروں سے

روز تشریف لائیں بہرِ کرم
تین دن تک رہیں خوش و خورم

منظوم رقعہ شادی برخوردار عنایت احمد خلف صدق قاضی فضل احمد صاحب تحصیل‌دار

شکرِ ہر گونہ ہے خدا کے لیے
مژدہ احبابِ با صفا کے لیے

شاد[1] شادی و مست مستی ہے
آسماں سے خوشی برستی ہے

جھوم کر ابرِ عیش آ پہنچا
جوشِ عشرت میں ہے مے و مینا

وجد فرما ہے نغمۂ بلبل
باہر اپنی ہوا قبا سے گل

مشک بو ہے نسیم عنبر بار
شبنمِ عطر سے ہے نم گلزار

دہنِ گل ہے خندہ سے گل ریز
شیشۂ سرو تک ہے قلقل ریز

رات دن بس کہ رہتی ہے بیدار
چشمِ نرگس ہے خواب سے سرشار

مجمعِ شاد و شادمانی ہے
سرخوشی مفت زندگانی ہے

ہے لبِ فرش تک بھی نغمہ سرا
بلکہ ہر تار ہے نشید آرا

۱- یہی شعر بہ تغیر مصرع اول پہلے منظوم رقعے میں بھی ہے۔ (مرتب)

گلِ قالیں سے باغ باغ ہے باغ
بھول جائے بہار اپنا سراغ
جم بھی آئے تو دیکھ کر جاجم
مثلِ نقش مراد جائے جم
شمعِ محفل سے پھول جھڑتے ہیں
بے تعظیم پاؤں پڑتے ہیں
مشعلِ بزم برق خرمن نور
رونقِ خانہ کحلِ دیدۂ حور
یعنی ہے بزمِ خانہ آبادی
جس کی شادی سے شاد ہے شادی
نورِ عینی[1] عنایتِ احمد
طال اللہ عمرہ بہ ابد
ہے سرِ جلوۂ عروسی پر (کذا)
ہے یہ تقریب تین روز مگر
محفلِ رقص و نغمہ عیش افروز
ہفدہم ہژدہم رجب کے دو روز
منعقد شام سے ہے تا بہ صباح
اور انیسویں کو عقدِ نکاح
اہلِ لطف و کرم سے ہے امید
صاحبانِ حشم سے ہے امید

۱۔ 'عین' اصل متن (ص ۳۴۸) میں بے معنی ہے، اس لیے 'عینی' تصحیح قیاسی ہے۔ (مرتب)

روز تشریف لائیں لطف کریں
چشمِ داعی پہ ہر قدم کو دھریں
داعیِ مستمند عجز آما
فضل احمد ہے خاکِ پاے صفا

مثنوی مسودۂ رقعۂ شادی اجودھیا پرشاد خلف
گردھاری لال ساہوکار—۱۲۸۳ ہجری

شکرِ نعماے الٰہی کیجے
مژدۂ عیش جہاں کو دیجے
ابرِ عشرت وہ برستا آیا
خندۂ عیش وہ ہنستا آیا

دیدۂ عیش میں پھولی ہے بسنت
راہ گلزار میں بھولی ہے بسنت
زعفران زار نہ کیوں کر ہو جہاں
کہ خوشی آئی ہے کیا کیا خنداں

شاد شادی ہے خوشی ہے خورم
ہم نفس نغمہ ہے لب سے ہر دم
بزم آراے طرب ہے عشرت
نغمہ فرماے طرب ہے عشرت

نشۂ عیش ہے کتنا سرشار
شورِ نغمہ ہے کہ رہوے ہشیار
بزم سے دل کش و دلبر ساماں
شعلۂ حسن ہے مشعل سوزاں

پھول جھڑتے ہیں یہ خرمن خرمن
لگنِ شمع ہے گل سے گلشن

یعنی تقریب ستائش آباد
نو عروسیِ اجودھیا پرشاد

جلوہ افروزِ تمنا ہے اب
ہوس آموزِ تمنا ہے اب

ہے بہم بزم طوی کا ساماں
محفلِ رقص و نوا کا ساماں

سولھویں سے ہے یہ بزمِ غم سوز
تا بہ اٹھارہ رہے گی ہر روز

اب تمنائے تمنائی ہے
عجز سے ناصیہ فرسائی ہے

روز تشریف احبا لائیں
چشمِ داعی پہ کرم فرمائیں

سرمۂ دیدۂ نگراں رہویں
ہمدمِ یادِ عزیزاں رہویں

سب کے الطاف و کرم کا پامال
داعیِ خاص ہے گردھاری لال

مثنوی مسودۂ رقعہ بزم ہولی از جانب لالہ گلاب سنگھ گماشتۂ کمسریٹ سرکاری

وقتِ شادی و شور آ پہنچا
کاروانِ سرور آ پہنچا

ہر طرف نغمہ ہائے رنگ برنگ
ہر جگہ جمعِ دف و نے و چنگ

برگِ ہر گل لبِ نواگر ہے
جنبشِ بو بھی نغمۂ تر ہے

۵۹۰

کس قدر شورشِ عنادل ہے
جس سے ہر شاخ مرغِ بسمل ہے
موجۂ باد ہے یہ نغمہ فشاں
ذرہ ذرہ ہے رقص میں رقصاں

رنگ پاشی سے سرخ ہیں در و بام
گل و گلشن ہے دامنِ ایام
رنگ افشانیاں ہیں شام و پگاہ
ہے بدر گویا خونِ روزِ سیاہ

یعنی ہولی ہے جشنِ جم آرا
بزمِ رقص و نعم ہے جلوہ فزا
سولھویں ماہِ مارچ سے ہر روز
بیسویں تک ہے جشنِ دل افروز

ہے یہ اُمید غم‌گساروں سے
لطف‌گستر کرم‌شعاروں سے
روز مخلص کو یاد فرمائیں
اہلِ محفل کو شاد فرمائیں

گو کہ ہے محنتِ قدم رنجہ
سر پہ ہے منتِ قدم رنجہ
داعیِ بندگی رساں خادم
عجز آما گلاب سنگھ آثم

ایضاً

وقتِ عیش و نشاط آ پہنچا
موسمِ انبساط آ پہنچا

رنگِ عشرت سے تر ہے ہر دامن
زاہدِ خشک تک ہے تر دامن
نغمہ ور شاد شادمانی ہے
سر خوشی مفت زندگانی ہے
یعنی ہولی ہے جشنِ عالم ہے
ہر کوئی بزم بزم خورم ہے
بہرِ احباب بزم آرائی
نغمہ و رقص و بادہ پیمائی
ہژدہم مارچ سے ہے بستم تک
دھوم اس جشنِ خوش کی زیرِ فلک
ہے یہ اُمید دوست داروں سے
لطف فرما کرم شعاروں سے
جب تلک ہے یہ بزمِ عیش افروز
ہو قدم رنجگی برابر روز
آئیں محفل میں ہوں شریکِ دور
بزم گہ ہے مکانِ نند کشور
داعیانِ نہ دیدہ رنج و محن
بندۂ پیارے لال و رادھا کشن

مثنوی دعوت نامۂ شادی کامتا پرشاد

خندہ زن گل ہے نغمہ زا بلبل
وجد فرما ہے موجِ ساغرِ مل
رنگ آرا بہار ہے کیا کیا
ہر چمن لالہ کار ہے کیا کیا

مۓ عشرت سے ہر کوئی لبریز
بطِ مے تک بھی کرتی ہے اب ریز
شمعِ محفل فروغِ دیدۂ حور
گلِ مشعل بہارِ نخلِ طور
یعنی تقریبِ شادیِ دل شاد
حفظہ اللہ کامتا پرشاد
ان دنوں میں نشاط پیرا ہے
سازِ عیش و طرب مہیا ہے
ھوم ہے اب زمیں سے تا بہ فلک
گیارھویں جون سے ہے تیرھویں تک
بزمِ رقص و سرود عیش افروز
بہرِ احباب ہے برابر روز
روز تشریف لائیں لطف کریں
چشمِ داعی پہ ہر قدم کو دھریں
داعیانِ رھینِ شکر و سپاس
بندۂ نند کشور و لچھمن داس

مثنوی دعوت نامۂ شادی مقبول حسین

شکر انعام الٰہی ہے ضرور
ہے صلائے طرب و عیش و سرور
شاد شادی ہے خوشی ہے خوش وقت
نشۂ عیش کشی ہے خوش وقت
بزم آرائے طرب ہے ہر دل
نغمہ فرمائے طرب ہے ہر دل

لفظِ عشرت کے عیاں ہیں معنی
مژدۂ عیش فشاں ہے یعنی
جشنِ دامادیِ مقبول حسین
خانہ آبادیِ مقبول حسین

جلوہ فرمائے تماشا ہے اب
لطف آرائے تمنا ہے اب
ہے بہم بزم طوئی بہر نشاط
محفلِ رقص و نوا بہر نشاط

چاردہ ماہِ رجب سے ہر روز
ہفدھم تک ہے ترقی اندوز
اب یہ امید تمنائی ہے
فرشِ رہ ناصیہ فرسائی ہے

اہلِ الطاف کرم فرمائیں
روز تشریف برابر لائیں
زینتِ کلبۂ احقر فرمائیں
چشمِ داعی پہ قدم دھرتے آئیں

شاکرِ منتِ احباب دلی
داعیِ خاکِ قدم واجد علی

مثنوی دعوت شادی محمد سعادت علی

شگفتہ ہے اب یہ بہارِ جناں
رگِ جانِ جنت ہے خارِ جناں
چمن میں ہے یہ جوشِ گل شاخ شاخ
کہ ہر برگ دامانِ دستِ فراخ

هوئی چشم نرگس یہ کچھ عشوہ خیز
سیہ مست کی جوں نگہ ہائے تیز

یہ کرتا ہے ظاہر گلِ لالہ گوں
دلِ خلد ہے اور حسد سے ہے خوں

عنادل کی شورش ہے گل کی بہار
رہے گا یہ موسم سدا یادگار

ہر اک خط خوشی سے یہ لبریز ہے
لبِ فرش تک بھی نوا خیز ہے

ہر اک دل میں جوشِ نشاطِ طرب
ہر اک لب پہ انبارِ نغمہ ہے اب

نہ کیوں کر خوشی کی ہو اب دھوم دھام
کہ عیش و طرب کو ملا ہے مقام

محمد سعادت علی نورِ عین
بنا ہے جو نوشاہ با زیب و زین

ہوئی منعقد بزمِ رقص و سرود
اور اس طرح ہے نظمِ رقص و سرود

کہ مارچ کی گیارہ سے بارہ تلک
رہے گا یہ ہنگامہ بے شبہ و شک

یہ اب اہلِ الطاف سے ہے اُمید
کہ جن کا قدم ہے کرم کی کلید

قدم رنجگی روز کرتے رہیں
مرے سر پہ ہر گام دھرتے رہیں

دل و دیدہ ہے فرش زیر قدم
کریں میرے کلبے کو رشکِ ارم

نہ ہو اس میں ہرگز دریغ و دروغ
کہ ذرے کو خورشید سے ہے فروغ

مکلف ہے ممنونِ اہلِ وطن
محمد سلامت علی تمہر کن

مثنوی رقعہ شادی بسم‌اللہ کہ برائے فرزند دل‌بند
مولوی ہاشم علی گفتہ' شد)

آں کہ بر لب سپرد بسم‌اللہ
بہ ستائش شمرد بسم‌اللہ

ما بشکرش نیاز ہا داریم
کہ ز بسم اللہ ناز ہا داریم

سوے احباب التماسے ہست
از سرِ عجز صد سپاسے ہست

نور چشم ، محمدِ صدیق
حاصلِ ہر تصور و تصدیق

بہرِ بسم اللہ جنبشے دارد
بہ سعادت خرامشے آرد

لاجرم روے انجمن دارم
آرزوے چمن چمن دارم

کہ بہ شعبان نہم بہ یک شنبہ
ہشتمِ جنوری ہر آئینہ

مجمعِ لطف و مہربانی ہا است
بہرِ یک لخت میہمانی ہا است

ہاں نہ دارند ہاں مرا محروم
دارم آویزشے امید لزوم

به که بر بنده لطف فرمایند
به دریغے مرا نه رنجایند
داعیِ لطف گستری آثم
عجز آسا محمدِ هاشم

"تقریظ"

از نتایجِ طبع وقاد، سخن گوے یکتا و سخن فہم بےہمتا، مخدومی مولوی الطاف حسین صاحب حالی تخلص، مدرس مدرسه عربی سرکاری که ذات والایش در متعهدان احاطه پنجاب فرد است

این دیوان غرابت عنوان از افادات گرامی، مرحومی حکیم غلام مولٰی عرف مولا بخش متخلص به **قلق** است که از مشاهیر شعراے اردو زبان و شاگرد رشید خان رفیع المکان جناب غفران مآب حکیم مومن خاں مومن بوده اند۔ اصل ایشاں از میرٹھ و در دوازده سالگی ازاں جا به خیرالبلاد جہاں آباد آمده به کسب کمال و تحصیل علم پرداختند وتا زمانے که واقعهٔ هائله طغیان سپاه باغی این شهر لطافت بہر را مورد آفات و مرکز فتنه و بلیات کرده هم درین جا اقامت داشتند ۔ مدت طویل زبان پارسی از انفاس متبرکه مولانا امام بخش صہبائی فرا گرفتند ۔ گویند از جمله شاگردان آں جناب به جودت طبع و حدت ذهن اختصاص داشتند و صرف و نحو و منطق و دیگر فنون عربیه را از ملا انتظام علی سہارنپوری اخذ کردند، و طب از حکیم غلام نقش بند خان مرحوم کسب نمودند ۔ دران ایام که گلشن

دهلی را آخر فصل بهار بود جمعے ازگران مایگان عالم معنی و چابک خرامان عرصهٔ سخن چون غالب و ذوق و مومن و سائرین که در سخن‌وری و نکته پروری فخر دهلی بل نازش هندوستان بودند ، درین معموره جا داشتند و از فیض وجود ایشان عالمے را هوائے شعر و سخن در سر افتاده بود۔ حکیم مغفور که با سوزونی طبع و جودت ذهن فکرے عمیق و نظرے دقیق داشتند ، باوجود مشاغل علمیه نتوانستند خود را ازین بادهٔ مرد افگن نگاه دارند ۔ لاجرم داعیهٔ غزل سرائی در خاطر ایشان پدید آمد ۔ مومن مرحوم را به آستادی برگزیدند و رفته رفته در خاطر آستاد موقع قبول یافتند ۔ مومن مرحوم چنان که از مطالعهٔ دیوان ایشان مستفاد می شود ، در غزل و اصناف دیگر از سخن دو طریق مسلوک داشته اند ؛ یکے عام و دیگر خاص ۔ طریقے که عام است همین طریقهٔ میر و میرزا وسائر ریخته گویان نامی و آستادان گرامی است و طریقے که نتیجهٔ طبع مبدع ایشان و مخصوص با ایشان است اگرچه از شاهراه عامه شعرا دور تر افتاده است اما سبب شهرت و بلند آوازگی شده ، ایشان را در چار سوے هندوستان به آستادی و نازک خیالی و دقت آفرینی علم ساخته ۔ ازان جا که حکیم مولا بخش **قلق** را مناسبت طبع و میل خاطر به طریقهٔ خاصهٔ خویش دیده بودند ، نظرے خاص به حال ایشان گماشته ، به علاوهٔ اصلاح سخن و القاے غوامض و دقائق این فن انواع لطف و کرم و اصناف شفقت و عنایت بر ایشان مبذول می داشتند ۔ تا آن که در اندک فرصت سخن ایشان بر نسق خاصه آستاد خویش کمال

پختگی پیدا کرده ، هر جا که بزم مشاعره انعقاد می‌یافت
با اُستادان دیگر هم طرح شده داد غزل سرائی می دادند و
حاضرین تعجب برتعجب و حیرت بالاے حیرت می افزودند ۔
هرگاه آتش بغی و فساد در چار سوے دهلی بالاگرفت سامنے بہتر
ازاں که به وطن گاه خود معاودت نمایند درمیان نه دیدند ۔
ناگزیر از دهلی به میرٹھ رفته هم دراں جا رخت اقامت
انداختند و تا سال هزار و دویست و نود و هفت هجری
که سال رحلت ایشان ازیں خاکداں به عالم جاودان است ،
در آن جا بودند ۔ در بعضے مدارس دولتی خدمت درس فارسی
با ایشان تعلق داشت که وجه معاش و سامان قوت لایموت
ایشان بود ۔ بسیار قانع و غیور و به فضل و هنر از مال و
دولت مستغنی و در شعر و سخن به اُستادی علم بودند و نیز
در طبابت دستے داشتند ولختے از اوقات عزیز را در علاج و
مداواے بیماراں بذل می نمودند ۔ از وصایاے ایشان که
هنگام وفات با کہین برادر خود درمیان نهادند ، یکے آن بود
که دیوان اشعار ایشان را به قالب طبع ریخته اشاعت آن کرده
باشند ۔ یگانۂ داد گر ، مہر گستر و فرزانه هنرور بابو
محمد عبدالله که برادر صغیر حکیم مغفور می باشند ، با آن که در
مدارس انگلیسی تعلیم یافته عمرے در ایں وادی بسر برده اند
و چناں که داب اکثرے از انگلش دانان است ذوق شعر و
سخن کم تر دارند و نیز خدمات متعلقۂ خود فارغ نیستند ،
باز وصیت برادر مرحوم را از جمله فرائض مکتوبه دانسته
کوششے بلیغ و توجہے فوق العادت در طبع و اشاعت دیوان
اشعار ایشان بکار بردند و چوں اخلاف رشید و اعقاب سعید

وصیت آں مغفور را بجا آوردہ نام برادر بہ گیتی شمردند و خود را از برادر نکو نام تر ساختند ـــــالراقمہ ۔

گر برادراں زیں ساں مہر و دوستی ورزند
چوں رسد بہ فرزنداں نوبت نکوئی ھا

راقم : خاکسار الطاف حسین حالی

شمع افروزی و پرتو افشانی بیاض صبح سخن دانی ، شعلۂ طور آتش بیانی شیخ ابو سلیمان مظفر احمد (سہمی) المتخلص بہ محوی سلمہ اللہ تعالیٰ است کہ در نظم و نثر مسلک تازہ و مہارتے بے اندازہ دارند ۔

سپاسے کہ آغازِ ہر کار زوست
سر انجامِ عنوانِ گفتار زوست

سپاسے کہ باشد بہارِ سخن
سخن گل شود زو چمن در چمن

سپاسے کہ امشا سپندِ خرد
بہ ساغر ازو وحیِ مضموں برد

سپاسے بہ دردِ دل آمیختہ
ز جاں ہم چو یا رب بر انگیختہ

سپاسے دوئی پوش و وحدت نما
سپاسے زباں بند و خاطر کشا

ھمانا سزد داورِ پاک را
کہ آراست چوں نور آ چاک[1] را

۱۔ آچاک (ف) : خاک کو کہتے ھیں ۔
(شمس اللغات ج ۱ ص ۲۰)

به جان از تن و جسم پیرایه بخش
ز معنی به الفاظ سرمایه بخش
نشاتین[1] کولاک[2] ابحارِ او
مه و مهر یک ذره ز انوارِ او
ز مصرِ سخن کاروان کاروان
نباتِ روانی دهد با زبان
چو بر یوسفِ دل غم ارزان کند
زلیخاے جان را به زندان کند
به موسیٰ چو نارنج دیدن دهد
کف هوش او با بریدن دهد
به مژگانِ چشمِ سمورِ سحاب
ترنجے نماید نهان ز افتاب
گه از قطرهٔ خون کند لاله داغ
به بوے نماید گہے باغ باغ
به حکمش عزیزے که حجت نمود
اسیرش به کنعانِ لعنت نمود
چمن را چو چادر به شاخ افگند
ز گل آتشے در هزاران زند
به گل مرغِ نکهت چو بے پر نهاد
ز بادِ صبا بالِ پرواز داد

۱۔ نشاتین : (بالفتح) ظهور دنیا و آخرت ، واحد نشاة ۔
(شمس اللغات ج ۲ ص ۲۹۷)

۲۔ کولاک (بالضم کاف تازی و واو مجهول) موج بزرگ و طوفان ۔
(شمس اللغات ج ۲ ص ۱۸۳)

گرانست در هشتهٔ عامِ او
خموشی سزد شکرِ انعامِ او
به زلفِ شب و روز از آفتاب
بهر صبح شانه گزارد به آب
به بزمِ جنون در خیالِ پری
دهد ناله را رنگ بالِ پری
منجم بسے مہرِ اندیشه تافت
دم و دودِ راهِ سراغش نیافت
پژوهندگی در رهش گمرهی
ز اخبارِ او بے خبر آگہی
به مسجد یکے 'یا صمد' خوانِ او
یکے در خرابات جویانِ او
مناجاتیاں در پرستاریش
خراباتیاں در گرفتاریش

نخل بندی که در بساتین نشاتین از رشحات سحاب کن آب فروبست ۔ و کچه[1] گل کردن خیابان هستی ، بیضه در کلام عدم فرا شکست ۔ آدم را گل کرمنا به دستار زد و دیوار در دشت خار زار آزار افگند ۔ سلماے نکهت را در حجلهٔ گل نشاند و عذراے نشه را در محمل مل ۔ گل را با بلبل دامن چاک فرمود و مل را با هوش و ادراک سفاک ۔ عروس فلک را آئینهٔ مهر و ماه به پیشانی فروبست و مرسلهٔ کاهکشاں

۱- کچه گلِ کردن : راز کا ظاهر هونا ۔
(شمس اللغات ج ۲ ص ۱۵۰)

در گلو ـ آفتاب را فر تاب جہان پروری داد و نطع زمین را اسباب خوان‌گستری ـ ساغر ماه را از ایاغ آفتاب سرخاب دهد وآفتابه[۱] آفتاب‌را ازجوے قدرت آب ـ ذره را از خورشید تاب دهد و قطره را از دریا آب ـ مهرش هستی افروز و قهرش گیہان سوز ـ زورق هلال را در دل بحر اخضر فلک روانی داد و سنبک[۱] سبک حساب را برسر دریا گرانی ـ باد شرطه را برهان سلامت فرمود و باد مخالف را طوفان هلاکت ـ آدم را به دلیل دل و دل‌کردن بر در عرفان زند و شیطان را به براهین و حکم بر در جلال افگند ـ خاتون قضا را طفل شش روزه در گریبان افگند و طفل چهل روزه در دامان ـ آبائی علوی را به امہات سفلی پیوند بیوگانی داد و از زاد و بوم جوانان سبز پوش خطاب به پر افشانی ـ طفاوه[۲] را طوق گردن حربا ساخت و از هاله حلقه در پاے تدرو انداخت ـ سبعه معلقات هفت سیاره به طاق سپہر بلند آویخته اوست و رنگ بست اوتاق نه فلک رنگ ریخته اوست ـ دودمان آسمان را دم ودود عظمت فرمود و خانوادۂ گیہان را فربود[۳] قدرت ـ هزاران در توحیدش یکه خوانان و به عالم غنچه غنچه گل فشانان

۱ـ سنبک : اول چیز ، بنجر زمین اور چھوٹی کشتی ـ
(فرهنگ عمید ص ۷۳۱)

۲ـ طفاوه : چاند کے گرد هاله ، آفتاب کے دوائر ، دیگ پر جو جھاگ آ جائے اور قیس همدان کے قبیلے کا گروه ـ
(شمس اللغات ج ۲ ص ۵۲)

۳ـ فربود : راست و درست ـ (فرهنگ عمید ص ۸۶۳)

آه عشاق در سر او مرغوله خوان و زهره در نواے جادو بیان طرۂ مرغوله مویان در شوق او سرائیده عمل گیسو و خانه خواه ابن السبیل شوقش را خانه به کام جادو۔ جهان از نغمۂ او پر آوازه و از زمزمه اش روح را قوت تازه۔ جان را از نفس ساز بر تار ، بست و تار نفس را از چنگ فنا درهم گسست۔ ساز نشاتین را از مضراب کن نواخته و مهر و ماه را بر قانون دائره ساخته۔ عراقیان جستجویش به آهنگ او زنگله بند گم گشتگی و حجازیان گفتگویش محمل نشین دم بستگی۔ لولی فلک به عشرت کده قدرتش بچنبر بازی و حنجره غلطان ملک به مقام قدوسیش در تر نوازی۔ چهار تارۂ عناصر را سازگاری ازوست و چهار گاه تن را پرده داری باو۔ نشید سرایان سرود معرفتش دلکش نغمۂ 'ماعرفنا' ، و تی تی[۱] نوایان زمزمۂ ادراکش ترانه ریز 'لا احصے ثنا' :

هوایش نفس در گلو سوخته
خیالش به دل آتش افروخته

نوازندۂ بے نوایانِ غم
نگارندۂ نقشِ لوح و قلم

۱۔ تی تی (به فتح هر دو تاے فوقانی) لفظے است که مطربان هنگام رقص گویند۔ چناں چه رقاصان هند 'تاتهئی' گویند و به کسر هر دویاے معروف طلب کردن مرغ بچگاں را براے دانه از لطائف و غیر آں در زبانے از حروف انکار است ۔ چناں چه در فارسی تی تی -(غیاث اللغات مع چراغ هدایت ص ۱۱۳ مطبوعه لکهنؤ)۔

ز هر پرده نقشے بر انگیخته
بهر نقش هنجارِ نو ریخته

ازوشکّر شوق در کامِ جان
وزو نغمهٔ تر به سازِ بیان

ورد درود نذر بلبل بوستان 'مازاغ' که زمزمه سنج نغمات بلاغ است ـ قانون شریعت کوک کردهٔ اوست ، و اطروبه[1] طریقت را ریزه خوانی ازوست ـ نمطهاے تنگ[2] عرفان نواختهٔ او و ساز حقیقت سوختهٔ او ـ فرمانش پیشینیان را صفیر از پس سر کشید و فرقانش خط بطلان به خط مرسلان در کشید ـ همتش امتیان را از ساز و برگ شفاعت بر نواخت و شفاعتش غلغلهٔ شادمانی به عاصیان در نواخت ـ افروزهٔ[3] لیلة القدر از تاب زار جمالش افروزان و آف[4] معراج[5] از شعشهٔ

۱ـ اطروبه (بالضم و راے مهمله وباے موحده) آن چه مردم را به طرب آرد و به معنی ساز و مزامیر و نغمه مستعمل می شود ـ (غیاث اللغات مع چراغ هدایت ص ۳۴ مطبوعه لکهنؤ)

۲ـ نمط هاے تنگ : پردهاے دقیق از سرود ، از شرح سکندر نامه ـ (ایضاً ص ۴۷۷)

۳ـ افروزه ـ (به فتح همزه) آتش گیره ، فتیلهٔ چراغ ، آفروزه ، آفروزینه ـ (فرهنگ عمید صفحه ۱۶۱)

۴ـ آف : به معنی آفتاب ـ (برهان قاطع ص ۲۰) ـ

۵ـ معرج ـ بالکسر نردبان و بالفتح محل بر آمدن و به ضم میم و فتح عین و فتح راے مشدد و جیم جامه است نفیس و منقش ـ (غیاث اللغات ص ۴۳۰)

انوار کمالش درخشان ـ
اما بعد آوازۀ یللّی[1] سرائے مژدۀ آویزۀ گوش گرائے گوهران والا مقام باد که ساز سخن در عشرت کدۀ کمال نغمه خیز هنرست و قانون هنر در نشاط آباد فنون ترانه ریز اثر ـ خوش نفسان چمنستان خیال را ساز و برگ سرخوشیها مهیاست و ریزه[2] خوانان ریزه چینی سخن را دم و دود سر مستیهائے استفاده پیداست ـ په[3] په که کمال بروئے کارست و فیض را روز بازار ـ بادۀ کام جوئی ها در جوش است و شاهد آرزو در آغوش ـ از دیر باز زمانه این گونه آرزو را در آغوش تمنا می پرورد ـ منت ایزد را که به پا مردی مردے اشا پسندی بابو محمد عبدالله سراپا هوش

۱ـ یللّی : (به فتح یا و لام مشدد) کلمه ایست که در مقام لاقیدی و خوشی و بے بند و باری می گویند ـ بانگ و فریادے که در حالت خوشی و مستی بر آورند ـ 'یللی' بے تشدید و 'یلی' هم گفته شده ـ یللی زدن : خوش بودن ، بے قید بودن ـ
(فرهنگ عمید ص ۱۲۸۱ ، ۱۲۸۲)

۲ـ ریزه خوانی : (به یائے مجهول و زائے معجمه) آواز پیچیده کشیدن از نغمات که آن را تحریر گویند ـ به هندی گهٹکری (گٹکری) به کاف مکسور مخلوطالتلفظ به ها و در آخر رائے مهمله ـ از چراغ هدایت ـ

۳ـ به : (به فتح با) کلمۀ تعجب که در مقام شگفتی از خوبی و پسندیدگی چیزے گفته می شود ، (غیاثاللغات ص ۳۰۴) گاهے برائے مبالغه 'به به' می گویند ـ وه ، وه وه ، و په په نیز می گویند ـ (فرهنگ عمید ص ۲۹۰)

و فرهنگ که در جهاں چک[1] و چانۂ[2] خلق و خوبی او ینگ[3] جفنگ[4] رنگ و بوے دگراں از چکمۂ[5] مرحاج بیش نیست ۔ اینک دیوان امیر کشور سخن ، خدیو خطۂ فرهنگ و فن ، هنگامه آراے خیال ، محمل پیراے کمال جناب حکیم غلام مولٰی معروف به حکیم مولا بخش قلق رئیس میرٹھ از مکمن بطون قوت خواهش به مظهر فعل طبع درآمد ۔ الله الله زهے سرمایۂ کمال آما که در حضر کمال مهمانان خلیل کرم را هم چو ماحضر حاصل است و در سفر شوق کسب فضائل خانه خواه پادگاناں[6] منزل ۔ سبحان‌الله زهے کارنامۂ دانش و کارستان خیال که هر صفحه اش چوں کف پر زر مالا مال

۱۔ چک : بالفتح و کاف عربی به معنی قباله و خط چیزے و زمین و باغ و بیع نامه و منشور و برات و وظیفه ۔ (غیاث‌اللغات ، ص ۱۳۵)

۲۔ چانه : به نون گردا گرد به آں معنی و فک اسفل نیز نوشته اند و آں استخوان زنخ باشد ۔ (غیاث‌اللغات ص ۱۳۳)

۳۔ ینگ : شکل ، طرز ، قاعده ، روش ، رسم و آئین ۔ (فرهنگ عمید ص ۱۲۸۲)

۴۔ جفنگ : بیهوده ، ناچیز ، یاوه ، سخن یاوه و بے معنی ۔ (فرهنگ عمید ص ۴۵۳)

۵۔ چکمۂ مرحاج : چکمه در ترکی موزه و مرحاج مخفف میرحاج که قافله سالار حاجیاں باشد ۔ و میرحاج لقب شخصے بوده است که پاها گنده و طولانی داشت ۔ (غیاث اللغات ص ۱۳۵)

۶۔ پادگان : (به سکون دال) گروهے از سربازاں که در یک محل متوقف و مامور نگاهبانی آں محل باشند ۔ (فرهنگ عمید ص ۳۰۴)

هنرست و هر لفظش مانند صدف گوهر از ‌دُرر معانی بهره ور ـ بلغه[1] اش نظر صاحب نظران و نقطه اش سویداے دل دیده وران ـ حقانقش طراز این ارژنگ معنی طرفه طرفه‌گریست از اهل فن با او هر که طرف شد از نام آوری طرف سلامت نه بست خیال لاوبالی خرامش به اندیشهٔ سحبان هم عنان ـ وفربارهٔ[2] سخن فر بود ـ فرجامش هم کنگرهٔ آتاغ[3] بندیشه (کذا) حسان سرعت فکرش در خر کمان نازک خیالی از تحسن استعارات بر فکر فلاطون تیر افکن طعن درنگی و وسعت بیانش بر پیغولهٔ همت پیغاره زن تنگی ـ بالجمله چون کمند خیال ابو سلیمان محوی از کنگرهٔ کاخ وصف این کارنامه و کارنامه نگار کوتاه است لاد[4] بریں شائسته آں که به پا بسته[5] و خواسته گرایش رود ـ یارب تا مصرع ابروے خوباں زیب دیوان شان حسن است سواد این بیاض از چشم زخم مردم

۱- بلغه : (بالضم) سیاهی و سپیدی باهم ـ
(شمس اللغات جلد ۱ ص ۱۷۰)

۲- فروار : (به فتح فا) بالا خانه ، خانهٔ تابستانی ، فرواره و پروار و پرواره، و پروار و پربار و پرباره و پرہال و پرباله و فرہال و فروال نیز گفته شده ـ (فرهنگ عمید ص ۸۶۹ ، ۸۷۰)

۳- آطاق : (به ضم همزه) ماخوذ از ترکی - خانه ، حجره ، در ترکی اوتاق یا اوتاغ می گویند ـ (ایضاً ص ۱۵۰)

۴- لاد : دیبا ، حریر ، پارچهٔ لطیف ، به معنی دیوار و چینهٔ دیوار هم گفته شده ـ (شمس اللغات ج ۲ ص ۱۰۰۴)

۵- نسخهٔ مطبوعه (صفحه ۳۶۳ میں 'بپابسته' ہے ـ 'به پابسته' تصحیح قیاسی ہے ـ (مرتب)

آهو چین کور سواد مصئون باد ! چشم از دیده وران بینش اندوز آنکه هر که ازین بهارستان چشمه کار خیال چشم مذاق آب دهند بو که گل تمیز بدستار ادب بزنند که گفته اند :

مثنوی لراقمه

وه چه خوش گفته اند کار آگه
پایه سنجان همه خرد خرگه

پایه سنجی دلیل دانائیست
ورنه تا وحی بانگِ رسوائیست

گر تمیز از جهان فرو ماند
ماه و خور ز آسمان فرو ماند

تخمِ تمییز گر گران گردد
عود را نرخِ حیز ران گردد

گر نباشد تمیزِ پاک و پلید
می شود هم چو با یزید، یزید

گر تمیزِ از تو رائگان گردد
چغد را خانه گلستان گردد

خوش نماید بجاے خود هر کس
سدره جبریل و آب خانه مگس

بوم را مرز و بوم ویرانیست
باغ و بلبل نوید آیانیست

کبک در کوهسار خوش باشد
مرغ در مرغزار خوش باشد

نا مزیب بود به خوش نگهان
نا مسلم بود به دیده وران

صحنِ گلشن مقامِ طاؤس است
کبک زیں نو بہار مایوس است
گویا ! گر تمیز کم گردد
کے بود فرق توی آدم و دد

تقریظ

کلیات اردو قلق از مولوی سید احمد صاحب دہلوی المتخلص بہ سید ، مدرس فارسی گورنمنٹ اسکول دہلی ۔ مولف 'ارمغان دہلی ، یعنی لغات اُردو و کنزالفوائد و وقائع درالیہ وغیرہ وغیرہ ۔ ساکن حویلی نواب مظفر خاں گذر ترکمان دروازہ

مولانا حکیم شیخ مولا بخش صاحب **قلق** جو میرٹھ میں اپنے شہر کا فخر اور موجودہ شعرائے ہند میں ایک اعلیٰ درجے کے نازک خیال تھے ۔ در اصل اساتذۂ دہلی کے فیض کا ایک عمدہ نمونہ تھے ، درسی کتابیں آپ نے فاضل اجل جناب مولانا امام بخش صاحب صہبائی سے اُن کے فرزند رشید مولوی عبدالکریم سوز کے ساتھ ہم سبق ہو کر دیکھیں ۔ طب میں ارسطوے زماں حکیم نقش بند خان صاحب سے تلمذ اور تجربہ حاصل کیا ۔ فن شعر میں جناب حکیم مومن خان صاحب دہلوی سے کمال بہم پہنچایا ۔ آپ کے شعر وہ تڑپتے ہوئے اور برجستہ ہوتے تھے کہ کیسا ہی ٹھنڈی طبیعت کا آدمی کیوں نہ ہو ۔ تڑپ ہی جاتا تھا ۔ عجب نہیں جو بعض اوقات مولانائے ممدوح کو خود بھی اپنے اشعار پر رشک آ جاتا ہو ۔ اُستاد اور شاگرد میں جو ایک خاص نسبت ہونی چاہیے ، وہ آپ میں اور حضرت

مومن خان میں بہ‌خوبی موجود ہے ۔ کوئی بڑا ھی صاحب مذاق ھو تو شاید یہ کہہ سکے کہ اشعار تو مومن خان کے ھی ھیں ، مگر البتہ ابتدا اور انتہا کا کہیں کہیں فرق ہے ، ورنہ ھر ایک کا کام نہیں ہے کہ مومن اور قلق کے سخن میں تمیز کر سکے۔ ان کے تڑپتے ہوئے اشعار آپ کی طبیعت کی شوخی ، زبان کی سلاست ، خیال کی نزاکت کے گواہ ھیں اور صنائع شعری پر خود گواہ ہے ؎

حاجت مشاطہ نیست روے دلآرام

غرض معاملہ بندی ، بلاغت ، فصاحت ، متانت ، ساری خوبیاں آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں ۔ مرثیہ بھی لکھا تو اس زور کا ، میاں انیس اور دبیر کو پرے بٹھا دیا ۔ اچھے اچھے سنگ دلوں کو اپنی کیفیت بندی سے آٹھ آٹھ آنسو رلایا ۔ رباعیاں عمرخیام سے لگا کھاتی ھیں اور قصائد خاقانی و انوری کا لطف دکھاتی ھیں ۔ ھاں فرق ہے تو اتنا ہے کہ وہ زبان اور ہے اور یہ زبان اور ۔ اُردو زبان کو چارچاند اُن ھی کے کلام سے لگے ھیں ۔ چوں کہ آپ کی عمر نے ابھی تک دوسرا ھی مرحلہ طے کیا تھا ، اس سبب سے ترتیب دیوان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی تھی ۔ مگر دوست احباب کے تقاضے سے تنگ آ کر مرنے سے چند روز پیشتر جیسا بنا جوں توں کرکے ترتیب دے لیا تھا ۔ ابھی تک چھپنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ قضاے ناگہانی نے بے وقت آن دبایا ۔ ناچار دل کی دل میں لے کر تمام احبا کو قلق دے کر بہشت بریں کو سدھارے ۔ اگرچہ مولاناے موصوف کی شہرت اس نواح میں بدرجۂ اتم ہے مگر اب وہ زمانہ بھی آ گیا تھا کہ آپ

ایک نامور استاد کلام مانے جاتے۔ چوں کہ آدمی کی قدر و منزلت اُس کے کلام سے ھوتی ھے اس لحاظ سے اُن کے بھائی منشی محمد عبداللہ صاحب اکونٹنٹ نہر جمن نے موتی مٹی کے نشان سمجھ کر اُن کا اُردو کلیات بطور یادگار چھپوایا۔ حضرت **قلق** کے بہت سے اشعار خاص ان کی زبانی لکھوائے ھوئے ھماری 'ارمغان دھلی' میں بھی درج تھے مگر افسوس کہ وہ اُسے مکمل دیکھنے سے پہلے اس جہان ناپائدار سے اُٹھ گئے اور اپنے قدر دانوں کو داغ حسرت دے گئے۔ حضرت کا انتقال ساتویں شعبان ۱۲۹۵ کو ھوا۔ چناں چہ ھمارے دوست اور میاں **قلق** کے شاگرد رشید منشی گلاب سنگھ صاحب مشتاق سب اورسیر نہر جمن نے جو اس زمانے میں تاریخ وفات لکھی تھی، وھی اس جگہ وافی و کافی ھے :

قطعۂ تاریخ

مرگ یکتائے عصر کی سن کر
ھر سخن‌ور کا دل دو نیم ھوا
بولا **مشتاق** بے سرِ اُمید
حیف ھے اب سخن یتیم ھوا

سید احمد دھلوی مولف ارمغان دھلی وغیرہ وغیرہ
۵ - اگست ۸۳ عیسوی

تقریظ از حافظ امداد حسین صاحب ظہور میرٹھی

زمزمہ سنجیِ حمد اور نغمہ سرائیِ نعت کے بعد نکتہ سنجان اعجوبہ طراز کو مژدہ اور سخن سرایان نادرہ پرداز کو نوید کہ گلستانِ گلِ ھائے نازکِ خیالی، بہارستانِ

بہار بے مثالی ، ارژنگ مضامین اعجوبہ طراز ، نیرنگ سحر کاری ناز و نیاز ، گلدستۂ گل ہائے جادو خیالی ، دستنبوئے شمائم بے مثالی ، گل کدۂ رنگ و بوئے سحرادائی ، گلزار چمن آرائیِ سخن سرائی ، طلسم تخئیل کارنامۂ تکمیل ، مجموعۂ کلام بے مثال ، دفترِ سخن ہائے نادرِ بے ہمال ، یعنی ظہوری ظہور ، نوائی نوا شانی شان فغانی فغان کلیم کلام **حکیم غلام مولوی قلق عرف مولا بخش میرٹھی** مرحوم کا دیوان فصاحت عنوان ، بلاغت بنیان ، سخن دانوں کا دل ، نکتہ سنجان نزدیک و دور ہوا ۔ سبحان اللہ کیا دیوان اور کیا طرز بیان ہے ۔ ہر مصرع نثرہ نثار ، ہر شعر شعریٰ شعار ، جادو ادا ہے ۔ ہر حرف سے روشن نازک خیالی اور ہر لفظ سے مبرہن نزاکت استعارات اور لطف تشبیہات ، نشست قافیہ ، بست ردیف کا ثنا گر ہوں ، یا قبض و بسط مضامین اور شوخی کلام کی تعریف سناؤں ۔ ہر شعر میں ایک نئی ادا ، ہر غزل پر ایک نیا جوبن ، ہر رباعی کی نئی طرز ، ہر قطعے پر نئی پھبن ۔ ایک ایک شعر ایک ایک دیوان کا مول ہے بلکہ بیش قیمت اور انمول ہے ۔ قصائد میں عرفی اور ظہیر فاریابی کا اندازہ جلوہ فروش ، غزل مین جلال اسیر اور فغانی کا طرز نزاکت جوش ۔ رباعیات سے عمر خیام کا کلام یاد آتا ہے ، بلکہ دل اس سے بڑھ کر کچھ اور ہی کیفیت پاتا ہے :

نادر یہ کلامِ سحر اثر ہے
طرفہ ہر ایک شعرِ تر ہے

هر لفظ کی سامری ادائی
اعجاز وشی سے جلوہ گر ہے
اللہ اللہ قلق کا دیوان
نادر ، نایاب ، طرفہ تر ہے

شوخی و ادا و جوش و خوبی
نشتر زنِ کاوشِ جگر ہے
مضمون ہے نگاہ بادہ در جام
دل لطف سے شیر اور شکر ہے

افسوس مگر ہزار افسوس
دیوان یہ یتیم اک پسر ہے
یعنی کہ قلق نہیں ہے اے وائے
نذر تپش و قلق جگر ہے

قطعات وفات از تصنیف محبی ٹھاکر گلاب سنگھ صاحب المتخلص بہ 'مشتاق' ساکن میرٹھ ، سب اورسیر نہر جمن غربی

مر گیا ہے ہے قلق کیا خوش بیان
گل چراغِ شاعری ہے کر گیا
بے سر اشعار اے مشتاق لکھ
شاعر یکتائے میرٹھ ، مر گیا
سمت ۱۹۳۸ — ۱۹۳۷

ایضاً

قلقِ شاعرِ گرامی را
چون اجل راہ ناگزیر سپرد

بے سر ہوش گفتم اے مشتاق
آہ طوطیِ باغِ میرٹھ مرد
۱۹۳۲—۱۹۳۷ سمت

ایضاً

مرگ یکتائے عصر کی سن کر
ہر سخن ور کا دل دو نیم ہوا
بولا مشتاق بے سر امید
حیف ہے اب سخن یتیم ہوا
۱۲۹۸—۱۲۹۷ھ

ایضاً

شدہ میرٹھ ستم ز علم تہی
ہوش زیں غم مرا ز جا رفتہ
گوی مشتاق سالِ رحلتِ او
ہائے[1] استادِ من کجا رفتہ

۱۔ اس مصرع کے نیچے ۱۲۸۷ فصلی مطبوعہ متن کلیات (ص ۳۶۹) میں لکھے ہیں ۔ مصرع سے ۱۲۸۱ برآمد ہوتے ہیں ۔ البتہ 'اوستاد' مان کر ۱۲۸۷ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح تاریخ درست ہو جاتی ہے ۔ لیکن مطبوعہ مصرع میں بغیر واؤ 'استاد' ہے اور 'واؤ' کے ساتھ مصرع بہ لحاظ وزن درست بھی نہیں ۔ (مرتب)

قطعۂ تاریخ وفات از حافظ محمد امداد حسین صاحب متخلص به ظهور ساکن میرٹھ

قلق شاعرِ خوش گپ و خوش خیال
ز دنیا سوے دارِ جنت برفت
به بیمارئِ سل که بد جاں گسل
به تسلیمِ شاد و به همت برفت
سروش از پۓ سال گفت از ظهور
قلق شاعر ما به جنت برفت

ریختۂ کلک گوهر سلک مولوی محمد عبد الحی صاحب المتخلص به صفا وکیل عدالت بلاری

بسم الله الرحمن الرحیم - یه امر مسلمه هے که نظم کو روز پیدائش آدم سے اس دم تک وه هی مناسبت انسان کے ساتھ هے جو روح کو جسم کے ساتھ اور یه بھی اُمید کی جاتی هے که تا بقاے نسل یه مناسبت قائم رهے گی - البته زمانے کے انقلابات اپنا اثر نظم پر ضرور پهنچاتے هیں اور موافق مذاق زمانه شاهد نظم طرح طرح کے ملبوسات سے آراسته هوتی رهتی هے - کتب تواریخ شاهد هیں که کوئی زمانه نظم سے خالی نه تها - کبھی خیالات عالم سچی اور سادی عبارت میں ظاهر کیے جاتے تھے ، کبھی تعلیات اور تشبیهات کے پهاڑ کھڑے کر دے جاتے تھے - هماری اُردو

زبان نے ایسے شاهد رعنا کی گود میں پرورش پائی۔ اسی کے ظل عاطفت میں عالم طفلی سے عالم جوانی تک پهنچی ۔ شباب کا وقت قابل دید تها ۔ بڑے بڑے سخن فہم و ذی‌جوهر لوگوں نے اس زبان کی آراستگی کا بیڑہ اٹھایا اور اپنی لاجواب کوششوں اور قیمتی وقت کے صرف سے ایک خارستان کو هرا بهرا گلستان کر دکھایا ۔ نصیر و ذوق و مومن و غالب و آزردہ و احسان نے جو کچھ احسان اس زبان پر کیا ہے وہ ظاهر ہے ۔ جو حضرات منصف مزاج و سخن دان هیں وہ حضرات ممدوح کی اوستادی کو تسلیم کرتے هیں ۔ اس محبوب دل نواز یعنی نظم اردو کی بیت ابرو سمجھنے والوں کے دلوں پر وہ کام کرتی ہے جو تیغ اصفہانی بھی نہ کر سکے ۔ میں بھی ایک فریفتہ اسی کے حسن و جمال کا هوں ۔ جب یہ دل ربا لباس فصاحت و سلاست سے آراستہ هو کر اپنا جلوہ دکھاتی ہے تو طبیعت قابو سے باهر هو جاتی ہے اور زبان سے بے ساختہ مرحبا کی صدا نکلتی ہے ۔ زمانۂ آخر میں هر چند بہت شاعر هوے مگر صاحب کمال کا کلام همیشہ اپنا جلوہ علیحدہ هی دکھاتا رها ۔ اس کا گواہ **دیوان قلق** ہے ۔ حضرت حکیم غلام مولیٰ صاحب عرف مولا بخش مرحوم متخلص بہ **قلق** میرٹھ کے خطے میں ایک با کمال سخن فہم ، سخن سنج شاعر تھے ۔ آپ کو تلمذ حضرت مومن دهلوی سے حاصل تها ۔ کلام آپ کا صاف و سلیس ، محاورات دل پسند و تشبیہات مناسبہ سے مملو نظر آتا ہے ۔ افسوس فلک کج رفتار نے زیادہ تر آپ کو اس سرائے فانی میں قیام نہ کرنے دیا اور ۱۲۹۷ هجری میں

فردوس بریں پہنچا دیا ۔ بعد ان کی وفات کے ان کے پیارے اور عزیز بھائی بابو محمد عبداللہ صاحب نے بہ کوشش بسیار ان کے کلام کی انطباع کا سامان کیا اور مطبع انصاری دھلی میں بہ اہتمام تمام اس کو طبع کرا دیا ۔

دیوان کیا ہے ، ایک مجموعۂ نور ہے ، سر تا پا فصاحت و بلاغت سے معمور ہے ۔ نیمچۂ بیت حساد کے جگر پر خنجر کا کام کرتا ہے ، ہر سطر پر گیسوے حور کا گمان ہوتا ہے ۔ ہر فقرہ دل بستہ اور ہر شعر برجستہ ہے ۔ ہر جملہ کشش دل کے واسطے نقش تسخیر بنا ہے ۔ ہر مطلع لاجواب ، ہر مقطع رشک مطلع آفتاب ہے ۔ کہیں حسن کی تعریف ، معشوق کا بیان ہے ، کسی جا شام ہجر اور تنہائی کی داستان ہے ۔ فراقیہ و مایوسانہ اشعار آٹھ آٹھ آنسو رلاتے ہیں ، وصالیہ مضمون ہاتھوں طبیعت بڑھاتے ہیں ۔ ہر لفظ زبان دانی کا مزہ دیتا ہے ، ہر مضمون خضر وادی نظم بنا ہے ۔ ترکیب و بندش صاف صاف ، ہر بیت پر صاد چشم ، درستی الفاظ و چستی معانی دلوں کو لبھا رہی ہے ۔ خوبیِ سوادِ خط سوادِ چشم آہو کو آنکھیں دکھا رہی ہے ۔ ہر غزل میں شوخی بھری ہے ۔ بلند پروازی خیالات معانی کو لے اڑی ہے ۔ چھاپا عمدہ ، خط صاف ، جو حرف قلم سے نکلا ہے گویا سانچے میں ڈھلا ہے ۔ از اول تا آخر یہ نسخہ دل ربا قابل ثنا ہے ، ہر لفظ سے مصنف مرحوم کی قابلیت و زبان دانی ٹپکتی ہے ۔ خداوند کریم اس بے بہا منظوم کو درجۂ قبولیت عطا کرے !

ہرچند میں زیادہ لکھنا چاہتا تھا مگر کثرت کارِ متعلقہ

سے مجبور ہو کر اپنی نثر کو ختم کرتا ہوں اور چند قطعات تاریخ پیش کر کے مستدعی معافیِ سہو و خطا کا ہوتا ہوں۔ فقط :

قطعۂ تاریخ آغاز طبع

شدہ سرسبز ز سیرابیِ آبِ طبع
سخنِ اہلِ سخن مجمع خلق و اوصاف
طوطیِ ذہن صفا بہرِ سنین طبع
'لالہ' باغ قلق' گفت بروے انصاف
۱۲۹۹ھ

تاریخ آغاز طبع

برائے سال طبع فکر ما چو مائل شد
بگفت ہاتف غیبی 'بیاض روے نگار'
۱۳۰۰ھ

تاریخ اختتام طبع

مشتاق تھا جس کا ایک عالم
دیوان وہ خوش نما چھپا ہے
تاریخ طبع صفا یہ لکھو
'دیوان قلق کا خوش نوا ہے'
۱۳۰۰ھ

۱- ۱۲۹۹ھ سنین طبع متن مطبوعہ میں دیے ہیں جو غلط ہیں، ۱۳۰۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔ (مرتب)

ایضاً

دیوانِ قلقِ بہ فضلِ ایزد
چھپ کر ہوا نور بخشِ عالم
تاریخِ طبع کا مادہ ہے
ہے 'شاہد نظم' لب پہ ہر دم

۱۳۰۰ھ

قطعات تاریخ اجتماع و طبع کلیات حکیم غلام مولیٰ قلق

دیکھتے یہ کلام گر مشتاق
عرفی و انوری و خاقانی
متفق ہو کے سب یہی کہتے
'کلیات قلق ہے لاثانی'

۱۲۹۸ھ

ایضاً

شوق ہے شاعری کا گر مشتاق
دیکھیے اے جناب نظمِ قلق
کہا ہاتف نے از سر بہجت
ہے چھپی لاجواب نظمِ قلق

۱۲۹۸—۱۳۰۰ھ

ایضاً

دیکھے لاکھوں کلام اے مشتاق
نہیں دیکھی کسی میں یہ شوخی

کہتے ہین لوگ از سرِ انصاف
گپ عجب ہے غلام مولئی[1] کی

۱۲۹۹—۱۳۰۰

ایضاً

شاعرِ بے مثیل ، یکتاے زمان یعنی **قلق**
بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و خوش مقال

تھے زبانِ ریختہ مین ہم صفیر **شیفتہ**
ہے کلام ان کابھی مومن کا سا اک نازک خیال

خوش ہے ہر منصف کلام پاک کی سن کر خبر
چھپ گیا ہے آج کل وہ جس کا ملنا تھا محال

حاسد و بد خواہ نکتہ چینیاں کرتے رہیں
پیش کب جاتی ہے لیکن یان کسی کی قیل وقال

میرزا و میر کا بھی ہم نے دیکھا ہے کلام
توبہ توبہ صاف ہے کب اُن کی ایسی بول چال

کہتا ہے سارا جہاں **مشتاق** لکھ تاریخ یوں
واقعی ہے ''کیا کلامِ بے نظیر و بے مثال''

۱۸۸۳ء

قطعات تاریخ از پنڈت امراؤ سنگھ صاحب متخلص بہ حباب ماسٹر کالج روڑکی

مشتاق بہ کوششِ جمیلہ
دیوانِ **قلق** نمود شایع

از بسکہ پر از نکاتِ نظم است
شد نام 'غوامض و بدایع'

۱۹۳۰ سمت

۱۔ مشتاق نے 'مولئی' کے عدد '۸۶' لیے ہیں یعنی الف مقصورہ ایک عدد نہین مانا بلکہ 'ی' تصور کر کے دس عدد مانے ہیں ۔ (مرتب)

ایضاً

کیا ہی سالِ سعید ہے جو چھپا
غزلیاتِ **قلق** کا مجموعہ
مثلِ دیوان مومن و غالب
ہے نکاتِ ادق کا مجموعہ
اور ضخامت مین بھی مثالِ میر
ہے کئی سو ورق کا مجموعہ
ہے یہ رنگینیِ مضامیں سے
رنگ ہاے شفق کا مجموعہ
نام اس کا **حباب** نے رکھا
نغزیاتِ **قلق** کا مجموعہ

۱۸۸۳ع

ایضاً

کیا رباعی کیا قصیدہ کیا غزل
حق تو یہ ہے جو کہا اچھا کہا
دیکھ کر اس کو **حباب**ِ زار نے
'ہے یہ مرغوبِ دل شعراء کہا'

۱۸۸۳ع

قطعہ تاریخ طبع زاد بابو خاں صاحب محب ساکن میرٹھ شاگرد رشید قلق

رنگینیِ طبیعت اور وہ کلام رنگیں
تازہ ہنوز جس سے اک داغ ہے **قلق** کا
تاریخ طبع دیوان جس دم محب نے پوچھی
ہاتف نےیوں ندا دی 'کیا باغ ہے **قلق** کا'

۱۳۰۰ھ

قطعہ تاریخ از ٹھاکر رادھا کشن صاحب متخلص 'بہ مشتاق'
شاگرد رشید ٹھاکر گلاب سنگھ مشتاق

نہیں دیکھی کوئی اس رنگ کی نظم
بلا شک بات یہ 'مشتاق' حق ہے
کہے ہے ہر کوئی از روے انصاف
+ ۱
'بجا ہے بے بدل نظم قلق' ہے

۱۲۸۹=۱۲۹۰ فصلی

قطعۂ تاریخ از شیخ شرف الدین صاحب متخلص بہ ظہور
ساکن اندری ضلع کرنال

کیوں نہ ہوویں اس کلام پاک کے
اے **ظہور** خستہ چرچے جا بہ جا
+ ۲
از سر بہجت کہے ہے ہر کوئی
'کلیات شاعر نادر چھپا'

۱۲۹۸—۱۳۰۰ھ

قطعۂ تاریخ از لالہ شنکر لال متخلص بہ شنکر
ساکن روپڑ ضلع انبالہ شاگرد مشتاق

بلاغت اور فصاحت مثل اس کے
کلام میر و مرزا میں کہاں ہے
ندائے غیب آئی بہر تاریخ
'کلام شاعر بے مثل ہاں' ہے

۱۳۰۰ھ

قطعهٔ تاریخ از حافظ محمد حسین صاحب متخلص به صفا ساکن میرٹھ

می کند ناز روزگار اکنون
که دهد مژدهٔ بهار اکنون

سرو قامت کشیده است امروز
جام قمری چشیده است امروز

لبِ غنچه که نغمه ریز انند
بلبلاں در چمن غزل خوانند

هر طرف صورتِ دگر آهنگ
فصلِ گل ایں چنیں ندارد رنگ

مژدهٔ جاں فزا به سمع آمد
کلیاتِ **قلق** به طبع آمد

وه کلامے که مردمِ دیده
چشم دارد به روے نا دیده

وه کلامے که می رباید هوش
خه کلامے که می فزاید جوش

سخنے حسن و عشق در بنیاد
سخنے طرزِ مهرباں استاد

سخنے تازه دارِ رسمِ سخن
سخنے زنده دارِ رسمِ کهن

کانِ گوهر گرش نثار کنند
سخنِ یک ز صد شمار کنند

تا کجا حرفِ لاف تا به کجا
من کجا و ستودنش به کجا

اے صفا دستِ خود بیفرازم
به دعاے چرا نه پردازم

رحمتِ حق بود ترینِ **قلق**
مغفرت باد هم نشینِ **قلق**

پے تاریخِ طبعِ دل بستم
جستجو کردم و ز خود رفتم

سر وجد آمدیم و شد القا
+ ۶
'سخنِ نغز و نازک و زیبا'
۱۸۷۷ء=۱۸۸۳ء

خاتمة الطبع

المنة لله که یه کلیات فصاحت و بلاغت آیات از تصنیفات شاعر بے بدل ناظم بے مثل حکیم غلام مولٰی عرف حکیم مولا بخش متخلص به قلق رئیس میرٹھ شاگرد رشید جناب حکیم مومن خان صاحب مرحوم و مغفور، حسب فرمائش بابو محمد عبدالله صاحب اکونٹنٹ نہر جمن سلمه‌الله و به کتابت کم ترین آفاق میرزا عبدالرزاق در مطبع انصاری دهلی به قالب طبع در آمد ۔ فقط

ضمیمه

۱ - تقریظِ 'بهارستان ناز'

۲ - تقریظِ 'عودِ هندی'

تقریظ 'بہارستان ناز' (طبع دوم، ۱۲۸۵ع) از نتائجِ طبعِ عالی حکیم مولا بخش صاحب 'قلق' متوطن میرٹھ

رباعی

اس بزم میں ہر شمع کو ہے سوز سے ساز
ہر سنگ ہے طوفانیِ دریائے گداز
القصہ ہے طالب کے حوالے مطلوب
رہتا ہے سدا ناز گرفتارِ نیاز

سخن عجب جادو ہے کہ سب کے سر پر چڑھ کر بولتا ہے اور ہر دل کی گرہ لب کشائی سے کھولتا ہے۔ یہی افسوں ہے، یہی افسانہ ہے، یہی عاقل ہے، یہی دیوانہ ہے۔ کہیں دعائے ماثور، کہیں دوائے مجبور۔ کبھی ترانۂ انجمن، کبھی افسانۂ ن۔ جادو اسی کا نام، معجزہ اسی پر تمام۔ کبھی دشنام بن کر دل میں گھر کرتا ہے، کبھی پیام ہو کر مدنظر رہتا ہے۔ الغرض زمانہ گنبدِ بے صدا ہے، یہی طلسم طلسم نما ہے۔ معشوقوں کو جس قدر اپنی خود داری پر ناز ہے، اُسی قدر اس کی پذیرائی میں زار نالیِ نیاز، اور دولت مندوں کو جتنی بے پروائیِ نخوت ہے، اُتنی ہی اس کی سرمایہ اندوزی میں پامالیِ صحبت ہے۔ مگر اس وقتِ ناشناس میں کہ صدائے سنگ و ترانۂ چنگ یکساں ہے اور غریوِ غراب و غزلِ بلبل دست و گریباں ہے، لیکن باہمہ ہجومِ بے تمیزی و ازدحامِ ہیچ میرزی، نہ زمانہ مردانِ کار سے

معرا ، نہ ھنرمند ھم آشیانۂ عنقا ۔ چنانچہ صاحبانِ عالی شان
ھنر پرور ، فضل گستر ، نیّرینِ سعدین دولت اقبال ، عینین
منورین جاہ و جلال ، علم دوست ، ھنر خریدار ، جہل سوز ،
بے ھنر آزار ، جناب مسٹر جارج آرنسٹ وارڈ صاحب بہادر
جائینٹ مجسٹریٹ میرٹھ و جناب ڈبلیو ایچ اسمٹ صاحب
بہادر کلکٹر و مہتمم بندوبست علی گڑھ ادام اللہ اقبالہما عجب
بے ھمتا مربی کلام اور مشفق غم خوار انام ھیں ، سیما گزیدہ
پسندیِ مذاق سلیم اور دولت افشانیِ فیض عمیم سے حضرت
جالینوس رتبت ، ارسطو فطرت ، کلیم کلام ، عیسیٰ مقام ،
منتخبِ دہر ، خلاصۂ شہر ، مربی فطرت ، مولائے فراست ،
مالکِ قلم روِ سخن، ممتازِ ھر انجمن ، شاعر (شعریٰ) مرتبت ،
ناثر نثریٰ رفعت ، سرجوش ما و طین جناب حکیم محمد فصیح
الدین صاحب رنج کو بہزار قدردانی و گوھر افشانی اس امر
پر آمادہ کیا کہ تذکرۂ نسواں موسوم بہ 'بہارستان ناز' جو
کشمکش زمانہ سے بلا تصحیح و تنقیح منطبع ھو گیا تھا ،
اب نظر ثانی بہ امعان کامل دوبارہ مومی الیہا کی ترغیب سے
کی جائے اور یہ نقش نا تمام اپنی کاملیت اور جامعیت کو
بہ شکل خاص پہنچ جائے ، لہذا جناب مفتخر نے بہ سعی و
جہد تمام و کوشش مالا کلام تعظیماً و حکماً اس سلکِ
مرواریدِ پراگندہ کو منسلک بہ اسلوبِ جامعیت 'طرفۃ العین
میں فرمایا اور بار منت و احسان اپنے خلق و گراں سے گردن
شائقین پر رکھا ۔ واقع میں یہ سفینۂ دلکش اور یہ مفرح
سر خوش بجائے خود مونسِ تنہائی ھے اور انجمن آرائی ۔ جس
شخص نے اس کو نہ دیکھا اور جو اس کا مصاحب نہ ھؤا ،

لایق التفات نہ رہا ۔ کسی اُستاد فارسی گو نے یہ شعر کیا اچھا کہا ہے کہ اس سفینۂ دل نشین کے وصف میں برمحل و برجا ہے : شعر

آن را کہ در سراے نگار است فارغ است
از سیرِ بوستان و تماشاے لالہ زار

تقریظ (منقول از عود ہندی) از فکرِ سرآمدِ روزگار ، خلاصۂ ادوار ، سرمایۂ بلاغت و پیرایۂ فصاحت ، مدقق دقائق ادق، حکیم غلام مولٰی صاحب المتخلص بہ 'قلق' ساکن میرٹھ دام فیوضہ

رباعی

تا کے بہ خیال خویش باشی در بند
فرعون ز خودی نہ شد بہ موسیٰ مانند
این نکتہ 'قلق' ز مردمِ چشم (آموخت؟)
خود را مپسند و دیگران را مپسند

مشتاقانِ بے تاب جستجو کو مژدۂ تاب فرسا اور منتظرانِ چشم در راہ کو صلاے شکیب ربا ، یارانِ معاشر کو پیغامِ صبوحی اور مہجوران نسیم جان کو نویدِ روحی ۔ دل کو ہوش ، جان کو نوش ، چشم کو جلا ، گوش کو نوا ، حواس کو درستی ، ہوش کو مستی ، عقل کو افزائش ، فہم کو گنجائش عطا ، اور مستوں کو ترانہ ، ندیموں کو فسانہ ، ناتوانوں کو توانائی ، نا شکیب کو شکیبائی ، شوق کو انتہا ، ذوق کو ابتدا ، بے خبر کو خبر ، تلاش کو آخر

مہیا ، یعنی ملفوظات اقدس اور معروضات مقدس ، رقعات مرقع ، مرقعات کو موقع ، سرجوش فیلسوفی و رندی الموسوم به 'عود ہندی' نہایت اہتمام بائستہ انجام اور انتظام شائستہ سے یہ کتاب مطبع مجتبائی میں چھپی اور حضرت جامع کی جانب سے عبارت خاتمہ کے لیے بعد اختتام اس نا تمامی سرانجام سے فرمائش ہوئی -

رباعی

کیا نامۂ نامی ہے[1] مہیا ہے ظہور
ہے چشمک ہر نقطہ کہ چشم بد دور
اللہ رے کیفیت لفظ و معنی
وہ آنکھ میں ہے نور تو یہ دل میں سرور

سبحان اللہ ، سبحان اللہ ، صل علیٰ ، صل علیٰ ، جی چاہتا ہے تا طاقت گفتار اس طلسم دلکش کی کیا کچھ نہ کیجیے - مگر فراوانی اقبال اور طغیانی ایصال وصول گرم نگاہ ، تحصیل حاصل ، بہتر کہ آپچ کی نہ لیجیے - مصرع

حاجت مشاطہ نیست روے دل آرام را

گو میں بھی یک زبان ، صد بیان ، طریقۂ ستائش ، سلیقۂ نو آئیں نوا ، خاطر پسندیدہ ، دل درد مند ، جگر خراشان آماجان خروش نوا ، ذوق خسک ریز ، شوق قیامت خیز ، ادائے ہوش ربا ، انداز تاب فرسا ، نمک گداز شیرینی حلاوت و پرداز نمکینی رکھتا ہوں اور ایک عمر دلی کے روڑوں

۱- سے ؟

میں سنگ سار رہا ہوں بلکہ وہاں کی مٹی ہؤا ہوں ۔ آن کا نقش پا ہوں ۔ شعر :

گر بہ سخن در آورم عشق سخن سرائے را
از بر ودوش سر دہی گریۂ ہائے ہائے را

مگر تم ہی تو کہو کہ ایسا شخص کہ جس کے سایے پر شمع طور پروانہ اور آن[1] کی وارستگی پر فیلسوف دیوانہ، فطرت سے فطرت ناز بردار، لیاقت سے لیاقت شرمسار، شوخی سادگی شعار، چابکی سے چابکی خود رفتگی شعار، طبیعت سے ملکیت بہرہ مند، ملکیت سے بشریت ارجمند، طریقے سے طریقۂ خضر آشنا، سلیقے سے سلیقۂ برگزیدگی ربا، انداز سے انداز ادب آموز، ادا سے ادا بہرہ اندوز، شیوا بیانی سے شیوا بیانی منت کش، سحر زبانی سے سحر زبانی اعجاز وش، مرکز ناز و نیاز، بہ دار سوز و ساز، طالب مطلوب، مطلوب طالب، اعنی اسداللہ خاں غالب دام دوامہ، اقام اقامہ، کس زبان سے سراہا جاوے اور کیا منہ ہے جو اس کی بات لب تک آوے۔ فی الواقع اس کی ستائش ناستودگی خود ستائی اور اس کی نمائش بیہودگی خود نمائی ۔ ذرے کو باریکی در خورشید دشوار اور قطرے کو تہ نشینیِ دریا[2] ناہموار، سبزۂ بیگانہ اور بہار افروز گلستاں سنگ ریزۂ ویرانہ اور ارزش اندوزگان بہر کیف وضع ادب خم آموز[3] گردن ابرام اور پاس نگاہ حد دیدہ دوز مقام الزام ۔

۱۔ اس ؟
۲۔ اصل متن میں 'دیار' غلط ہے ۔ (مرتب)
۳۔ اصلِ متن میں 'اموز' غلط ہے ۔ (مرتب)

مثنوی

لکھے کیا کوئی فکر اوج غالب
بیاں سے دور حرف ذکر غالب
سخن دانی اگر ہوئے کوئی دیں
تو ایماں سب کا ہو غالب کا آئیں
عجب انداز نکتہ پروری ہے
کہ ہر نقطہ کتاب دائری ہے
اگر روشن بیانی وہ دکھائے
تو مہر و مہ کو نظروں سے گرائے
سواد قدس، شکل نامہ اُس کی
قم عیسیٰ، صریر خامہ اُس کی
طبیعت کا جو پائے اُس کی انداز
نزاکت کو ہو کیا کیا ناز پر ناز
جو زہرِ خندہ اُس کے لب پہ جا پائے
تو نیشِ درد نوش جان بن جائے
اگر یہ خود سری کا مدعی ہو
تو دریا تک سے عار قطرگی ہو
نہیں اس کا سخن میں کوئی ہم دوش
کہ اک حرف اُس کا اور معنی صد آغوش
سخن کا مجملاً ہو اُس کے کیا ذکر
ہر اک نقطہ ہے جس کا محشر فکر

لیکن شایان تعریف اور سزاوار توصیف، مغتنم زبان[1]، دہر

۱- زماں ؟

نکتہ راں ، داد دل دانش ، نور نگاہ بینش ، شان شکوہ مندی ، شکوہ شوکت پسندی ، کمند آسماں کمیں ، سپند چشم خوردہ بیں ، طمغاے خانوادۂ شرافت ، طغراے امضاے نجابت ، سر دفتر سخن آرایاں ، منشی محمد ممتاز علی خاں صاحب خاص روساے میرٹھ ، دام اللہ اجلالہ و زید افضالہ ہے کہ حضرت کی نبانت[1] قدر و جلالت ، امتیاز ہر خطوط بے ربط سے شکل اقلیدس پرداز رہتی ہے - خس و خاشاک صحن باغ بھی ترتیب خاص سے دوش صبا پر سوار اور ذرہاے گوشۂ زاغ ان کی انجلا آموزی محض سے محشر خورشید زار ، بے استفادۂ درستی احوال تحرک رشک سنگ ، فریاد شکست شیشہ اور بے استصلاح[2] فساد امتیاز قوت نامیہ ، مہتمم شاخچہ[3] بندی دستہ تیشہ ، یکے قوت ممیزہ حجت گریۂ بے اختیاری شمع میں مکافات نیش زنبور سے اثر افروز اور دلیل بے داری نرگس میں رسوائی غفلت انگور سے پرہیز آموز ، خاک تیرہ سامان سے جوہر صفا طلب کار اور ہواے شکستہ عناں کو تحریک نقاب آموز کار - مثنوی

زہے کار سازیِ حسنِ تمیز
عزیزِ جہاں ہے یہ خوے عزیز
یہ روشن کرے چاہے جس کا کلام
کہ حسنِ نظام اس کا ماہِ تمام

۱- نبالت ؟
۲- اصل متن میں 'اسصلاح' ہے - تصحیح قیاسی کی گئی - (مرتب)
۳- اصل میں 'شاخھ' ہے تصحیح قیاسی کی گئی ہے - (مرتب)

کرے جس کا آراستہ یہ سخن
قدم اُس کے لے اُڑ کے رنگ چمن
ہؤا کامیاب اس سے جس کا کلام
'نظامی' ہے بہر نظام کلام
یہ جس حرف کو دیوے رنگ ادا
ارم اُس پہ ہو بلبل مدعا
جو خط جبیں کو یہ ترتیب دے
تو روشن سوادی قدم چوم لے

مآل هرزه درائی و آشفته نوائی قلق نا سنجیده بیان ، کج مج زبان کا یہ کہ اس ستودہ کیش ، قدر اندیش نے کس عمدہ عنوان سے فضلۂ طبیعت مرزا غالب یعنی خطوط ہائے پریشان اردو زبان کو روح رواں اور مغز جاں بنا دیا اور کس عبارت بے سر و پا سے کیا باغستان معنی کھلا دیا ۔ حق یہ ہے کہ ایسی سعی مشکور و محنت دراز و دور کون کسی کے لیے کرتا ہے ۔ ہر ایک اپنے جیب و گریباں کو گل ہائے مقصود سے بھرتا ہے ۔ یہ آپ ہی کا کام ہے ، اس کا نام رابطۂ خاص اور اخلاق عام ہے ۔ جب طالبان زبان اس تحریر کو ملاحظہ فرمائیں گے تو دلی کا روز مرہ اور محاورۂ گفتگو گھر بیٹھے سیکھ جائیں گے ۔

بارک اللہ ! کیا بے ساختہ عبارت ہے کہ نثر میں نظم کا مزہ آتا ہے اور ہر جملہ فقرۂ معشوق کو شرماتا ہے ۔ مگر افسوس اہل مشرق کی جگت بندی نے بگاڑا کہ دلی سے زیادہ اُس کی زبان کو اُجاڑا ۔ اب کس کس کو سمجھائیے ۔ کاف

دل و دماغ کہاں ۔ سوائے ازیں ان کو فہم ، ہم کو فراغ کہاں ۔ شعر

ہائے دہلی کہ ہے دشوار بیانِ دہلی
لٹ گئی ساتھ ہی دلی کے زبانِ دہلی

اللہ بس ماہقی ہوس ۔

(عود ہندی مطبوعہ مطبع نارائنی دہلی ،
بازار سیتا رام - ۲۰ - صفر ۱۲۹۵ھ
صفحات ۱۸۶ تا ۱۸۸)

مجلس ترقی ادب لاہور